www.pklibrary.com

شعاع

فروری 2024

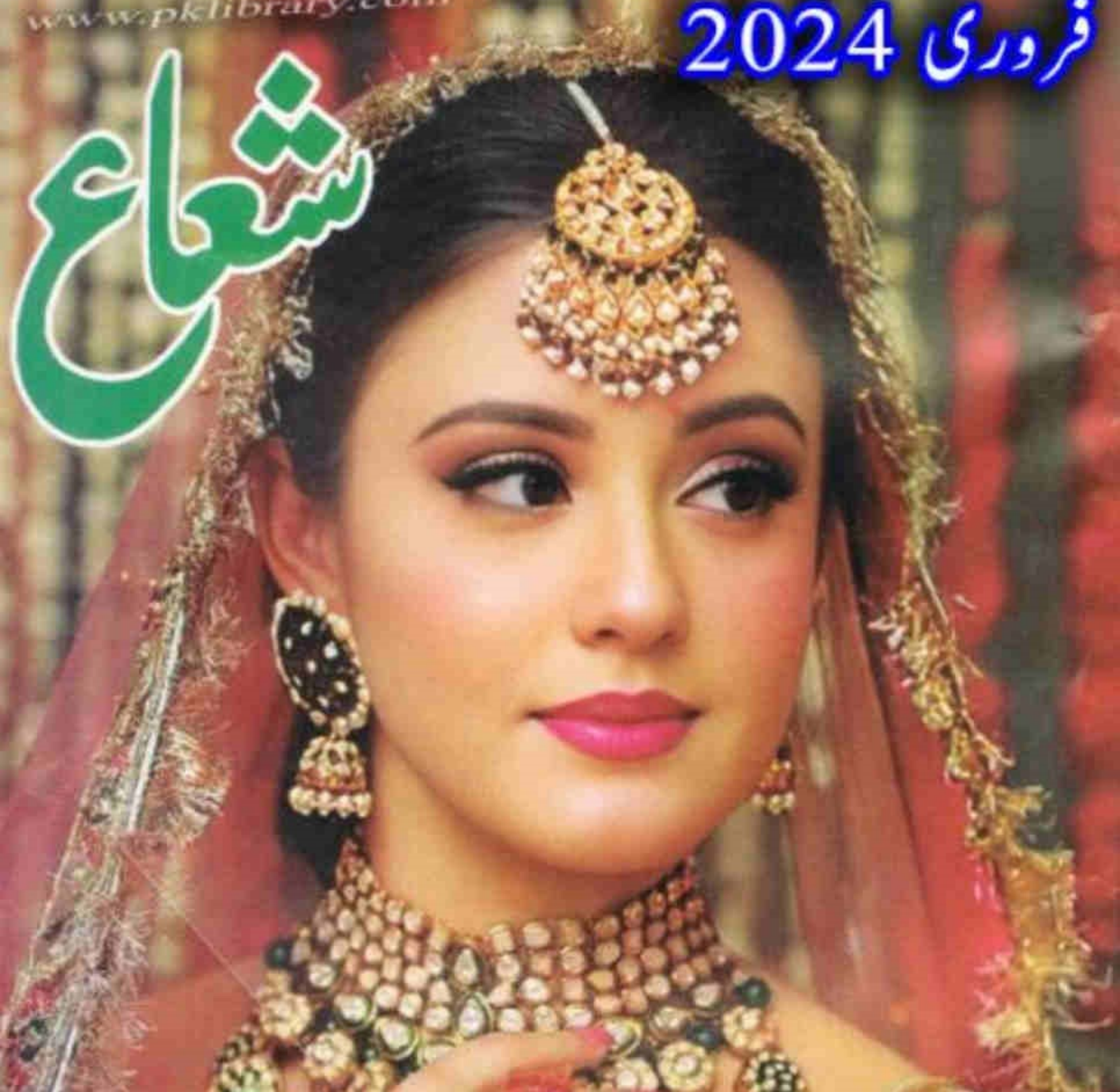

شعاع

بانی — محمود ریاض
مدیر اعلیٰ — اختر ریاض
مدیرہ — رضیہ جمیل
مدیرِ خصوصی — امت الصبور
قانونی مشیر — شاہین رشید
قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل ایڈوائزرز

پہلی شعاع — مدیرہ 6
حمد — فیاض الدین سہروردی 7
نعت — حکیم خان حکیم 7
نبی ﷺ کی باتیں — ادارہ 8

انٹرویو

شگفتہ بھٹی سے ملاقات — شاہین رشید 17
دستک — شاہین رشید 34
جب تجھ سے ناتا — ش۔ ب 13
جب تجھ سے ناتا — س۔ س 15

ناول

والعصر — امت العزیز شہزاد 36

مکمل ناول

شہر شام ہجر — فرح بخاری 170
ماء الملوک — نگہت سیما 78
حبس کے موسم — شیماناز سلطان 114

ناولٹ

صاحبی الجن — [illegible] حسین 150
رنگ باز — عنبرین [illegible] 60

افسانے

سرما کی دھوپ — راشدہ رفعت 53
ادھورے خواب — فائقہ رابعہ 57
عذرا — فرزانہ جبیں 194
محبت کا ستی آنچل — عارفہ فضل شاہ 107

pklibrary.com

بات کا بتنگڑ — ملیحہ سعود — 146

الفاظ اور جملے — لبنیٰ آصف — 112

نفیس غزلیں

غزل — مستورہ رانا — 197

نظم — زہرہ نگاہ — 197

غزل — طاہر سرفراز — 198

غزل — صباحت جوکھ — 198

مستقل سلسلے

خط آپ کے — ادارہ — 22

بالوں سے خوشبو آئے — شگفتہ جاہ — 199

کھلتا کسی پہ — حبیبہ خان — 205

تاریخ کے جھروکے — امت الصبور — 206

مسکراہٹیں — ادارہ — 202

موسم کے پکوان — واصفہ سہیل — 208

خوبصورت بنیے — ادارہ — 210

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------- 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ --- 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

فروری 2024

جلد 37 شمارہ 06

قیمت 150 روپے

واٹس ایپ

03172266944

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

pklibrary.com

رضیہ جمیل

شعاع فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں

وقت ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ ماہ و سال پر لگا کر اڑ رہے ہیں۔ زندگی بہت مختصر ہے اور اس مختصر سی زندگی میں جینے کے لیے وقت تو بہت ہی کم ملتا ہے۔

اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اتنے کم وقت کو بھی ہم بلاوجہ کی نفرتوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ فضول کی بحث و تکرار میں الجھ کر عمر بھر کے لیے نفرت اور کدورت دل میں پال لیتے ہیں۔ معمولی سے اختلاف رائے پر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔

زندگی سے بڑھ کر قیمتی چیز کوئی نہیں۔ اس فانی دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کے لیے ہم اپنے رشتے ناتے، دوستیاں بھول جائیں۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیں۔ محبت ہو یا نفرت اعتدال اور توازن بہت ضروری ہے۔ کسی کی محبت یا نفرت میں اس حد تک نہ بڑھ جائیں کہ اپنا برا بھلا بھی نہ سوچ سکیں۔ صرف اپنے دل کی نہ سنیں۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے دماغ کی بھی سنیں۔ عقل اور دلیل بھی دیکھیں۔ زندگی کے بہت سے سنجیدہ معاملات میں ہمیں اپنے دل کو پس پشت ڈال کر دماغ سے فیصلے کرنے پڑتے ہیں خصوصاً اس وقت جب معاملہ اجتماعی زندگی کا ہو اور ہمارا فیصلہ بہت ساری زندگیوں پر اثر انداز ہو رہا ہو۔

عید نمبر

رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے اگلا شمارہ یعنی مارچ کا پرچا آپ کو رمضان المبارک میں ملے گا اور اپریل کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔

مصنفین سے التماس ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں رمضان المبارک اور عید کے حوالے سے بھجوائیں۔

اس شمارے میں

☆ نگہت سیما کا مکمل ناول..... ماہ الملوک
☆ نعیمہ ناز کا مکمل ناول..... ہجر کے موسم
☆ فرح بخاری کا مکمل ناول..... شام شہر ہجر
☆ عنبرین ابدال اور عیشہ حسین کے ناولٹ
☆ امت العزیز شہزاد کا ناول..... والعصر
☆ راشدہ رفعت، قانتہ رابعہ، عارفہ فضل شاہ، لبنیٰ آصف، ملیا سمون اور فرزانہ چیمہ کے افسانے
☆ آپ کی پسندیدہ مصنفہ شگفتہ بھٹی سے ملاقات
☆ دستک..... معروف شخصیات سے گفتگو
☆ پیارے نبی کی پیاری باتیں..... احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
☆ خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں

pklibrary.com

حمد باری تعالیٰ

نام لیتا ہوں دم بہ دم تیرا
ہر گھڑی مجھ پہ ہے کرم تیرا

سب پہ تیرے اس قدر ہیں احساں
حق ادا کر سکیں نہ ہم تیرا

چاند، تارے، ہوا، فلک، سورج
مانتے ہیں سبھی حکم تیرا

جو بھی مخلوق ہے زمیں پر وہ
ذکر کرتی ہے ہر دم تیرا

چھوڑ دیں گر تری عبادت سب
پھر بھی ہو نہ مقام کم تیرا

معتبر ہوں جو میں زمانے میں
شاملِ حال ہے کرم تیرا

حکیم خان حکیم

نعت رسول مقبول ﷺ

یارب تیرے محبوب کا جلوہ نظر آئے
اس نورِ مجسم کا سراپا نظر آئے

اے کاش کبھی ایسا بھی ہو خواب میں میرے
ہوں جس کی غلامی میں، وہ آقا نظر آئے

روشن رہیں آنکھیں یہ میری بعد فنا بھی
گر وقتِ نزع وہ شہ والا نظر آئے

تاحشر مری قبر میں ہو جائے اُجالا
مرقد میں جو اُن کا رخِ زیبا نظر آئے

کس آنکھ نے دیکھی ہے مثال اُن کے کرم کی
سرکارؐ تو کونین میں یکتا نظر آئے

کس درجہ بنایا انہیں اللہ نے محبوب
ہر ایک کے دل کی وہ تمنا نظر آئے

ریاض الدین سہروردی

pklibrary.com

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

صبر کا اجر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا وہ مومن بندہ جس کی محبوب ترین چیز میں واپس لے لوں، لیکن وہ اس پر ثواب کی نیت (سے صبر و رضا کا مظاہرہ) کرے، اس کے لیے میرے پاس جنت کے سوا کوئی بدلہ نہیں ہے۔'' (بخاری)

فائدہ: بچے، بیوی اور والدین وغیرہ یہ سب انسان کے لیے محبوب ترین چیزیں ہیں۔ ان کی وفات پر اللہ کا حکم سمجھ کر صبر کرنا کامل ایمان کی علامت ہے اور بے صبری، جزع فزع اور اول فول بکنا ضعف ایمان کی دلیل۔ پہلی بات کا صلہ جنت ہے اور دوسری بات اللہ کی ناراضی کا باعث۔

عذاب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا۔

''یہ عذاب تھا، جس پر اللہ تعالیٰ چاہتا، اسے نازل فرماتا۔ اب اللہ نے اسے مومنوں کے لیے رحمت (کا ذریعہ) بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو بندہ طاعون (کی بیماری) میں مبتلا ہو جائے اور وہ اپنے (طاعون زدہ) شہر ہی میں صبر کرتا ہوا ثواب آخرت کی نیت سے ٹھہرا رہے۔ اسے یقین ہو کہ اسے وہی کچھ پہنچے گا، جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے تو ایسے شخص کے لیے شہید کی مثل اجر ہے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ طاعون یا اسی قسم کی دیگر وبائی بیماری میں اللہ کی تقدیر و مشیت پر ایمان رکھتے ہوئے اسی شہر میں رہنا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں جزع فزع اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا، ایک مومن کو شہادت کے رتبے سے ہم کنار کر سکتا ہے، اسی طرح اور بھی بعض لوگوں کو یہ اجر ملے گا، مثلاً غرق ہو کر مرنے والوں کو حالت زچگی میں فوت ہونے والی عورت کو وغیرہ وغیرہ۔

2۔ یہ حکم اس لیے ہے تا کہ یہ وبائی مرض دوسرے شہروں میں نہ پھیلے۔ علاوہ ازیں دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے لیے حکم ہے کہ وہ طاعون زدہ شہر میں جانے سے اجتناب کریں۔

3۔ اس سے معلوم ہوا کہ حفاظت اور علاج کے اسباب اختیار کرنا، تقدیر الٰہی پر ایمان رکھنے کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح مرض پر صبر اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر رضامندی کی دلیل ہے، جو کامل ایمان ہے۔

4۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید بیماری از خود متعدی ہوتی ہے، اس لیے طاعون میں مبتلا شخص کو دوسری جگہ جانے سے روکا گیا ہے۔ جبکہ دوسری حدیث میں ہے کہ بیماری متعدی نہیں ہوتی۔ اس کی تطبیق یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کا یہ عقیدہ نہ بن جائے کہ مجھے فلاں کی وجہ سے بیماری لاحق ہوئی ہے۔

آنکھیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب میں اپنے بندے کو اس کی دو پیاری چیزوں کے ذریعے سے یعنی آنکھوں

pklibrary.com

سے محروم کر کے آزماؤں، پس وہ اس پر صبر کرے تو میں اس کے بدلے میں اسے جنت دوں گا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بطور احسان ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ عدم بصارت (آنکھوں کا نہ ہونا) دنیا میں بہت بڑی محرومی ہے اور اللہ تعالیٰ جزا بھی بقدر مشقت عطا فرماتا ہے، اس لیے اس محرومی پر صبر بہت بڑا عمل ہے جس کی جزا جنت ہے، بشرطیکہ نابینا ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔

جنتی عورت

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا۔ "کیا میں تجھے جنتی عورت نہ دکھلاؤں؟" میں نے کہا۔ "کیوں نہیں (ضرور دکھلایئے!) انہوں نے فرمایا۔ ایک کالی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا۔ "مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے، جس سے میں ننگی ہو جاتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے اللہ سے دعا فرمائیں (کہ اس بیماری سے مجھے نجات مل جائے)۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تو چاہے تو اس تکلیف پر صبر کر، اس کے بدلے میں تیرے لیے جنت ہے اور اگر تو چاہے تو میں اللہ سے دعا کر دیتا ہوں کہ اللہ تجھے اس بیماری سے عافیت دے دے۔"

اس نے کہا، میں صبر ہی اختیار کرتی ہوں، تاہم (دورے کے وقت) میں ننگی ہو جاتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے یہ دعا فرمائیں کہ میں ننگی نہ ہوا کروں۔" چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ رخصت کے مقابلے میں عزیمت کو اختیار کرنا، بشرطیکہ انسان اسے استقلال کے ساتھ برداشت کرے، بہت اجر و ثواب کا کام ہے۔ اسی طرح علاج معالجے کے ساتھ، بارگاہ الٰہی میں دعا سے بھی اجتناب نہ کیا جائے۔ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔

2۔ بیماری اور آزمائش سے عافیت طلب کرنی چاہیے اور صحت کو غنیمت سمجھنا چاہیے، تاہم بیماری کی حالت میں صبر کیا جائے۔ واویلا اور ناشکری سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس سے بیماری تو کم نہیں ہوتی البتہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

بیماری اگر طول پکڑ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونے اور شکوہ کرنے کے بجائے تقدیر پر راضی رہنا چاہیے۔

3۔ کسی سے دعا کروانا صبر کے خلاف نہیں ہے، تاہم دور حاضر میں مشکل کے وقت مزاروں اور قبروں سے مانگنا جائز نہیں۔ خاتون کے عقیدے کا بھی علم ہوتا ہے کہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں کہا اسے تندرست کر دیں بلکہ یہ کہا اللہ سے دعا کریں۔ مجھے تندرست کر دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ صحت اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے اس قسم کے اختیارات اسی کے پاس ہیں، اس کے علاوہ کوئی مختار کل، مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہے۔

دعوت حق

ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہ السلام میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، جنہیں ان کی قوم نے مار مار کر لہولہان کر دیا اور وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یا اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے، اس لیے کہ وہ بے علم ہے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ بعض کے نزدیک یہ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام اور بعض کے نزدیک خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم ہیں۔ اس اخلاق و کرم کا بیان ہے جس میں داعیان دین کے لیے بڑا سبق ہے کہ تبلیغ و دعوت کی راہ میں تکلیفیں برداشت کی جائیں، لوگوں کی بد اخلاقی اور بدسلوکی کے مقابلے میں عفو و درگزر سے کام لیا جائے اور اللہ سے ان کے لیے معافی اور ہدایت کی دعا مانگی جائے، نیز جاہلوں سے جاہلوں والا معاملہ نہ کیا جائے۔ یہ اخلاقی خوبی اور کردار کی بلندی، ایک داعی دین کے لیے نہایت ضروری ہے۔

دنیا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

"دنیا ملعون ہے۔ اس میں جو کچھ ہے، سب ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس سے تعلق رکھنے والی اشیا کے اور سوائے عالم اور طالب علم کے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی ہے، یعنی دنیا چونکہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے، اس لیے یہ لعنت کا باعث ہے۔

2۔ ہر وہ چیز یا عمل جس کا اللہ کی یاد سے کسی بھی انداز سے کوئی تعلق ہو، اس پر یا اس کی وجہ سے رحمت نازل ہوتی ہے، چنانچہ تلاوت، نماز، اللہ کے لیے جانور کی قربانی اور حج و عمرہ کے اعمال سب رحمت کا باعث ہیں۔ ایسے اعمال انجام دینے والا اللہ کی لعنت سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح کعبہ، صفا و مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور ہر مسجد و مدرسہ اللہ کی رحمت کے مقامات ہیں۔ یہاں دین کی خدمات انجام دینا اور دین کے خادموں کی ضروریات مہیا کرنا، دینی کتابیں چھاپنا اور دوسروں تک پہنچانا، ان کی تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا، علماء و طلباء کی ضروریات پوری کرنے کے اسباب ہیں۔

3۔ دین کے علم سے کسی بھی انداز سے منسلک ہونا اللہ کی رحمت کا باعث ہے، اس لیے اگر دنیوی علوم و فنون بھی خدمت دین کی نیت سے حاصل کیے جائیں تو وہ بھی دین کے خادم علوم ہونے کی وجہ سے لعنت کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو یہ علوم رحمت کا باعث نہیں ہوں گے۔

4۔ حلال روزی کمانا اللہ کا حکم ہے، اس لیے اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے حلال روزی کمانا اور حلال کاموں میں خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔

دنیا قید خانہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ جس طرح قیدی جیل میں بہت سے قوانین کا پابند ہوتا ہے بلا اجازت وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مومن دنیا میں من مانی نہیں کرتا بلکہ ہر قدم پر اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے، اس کے بدلے میں اسے جنت ملے گی۔

2۔ کافر دنیا میں آزادی کی، یعنی بے قید زندگی گزارتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے جہنم کا عذاب ملنے والا ہے۔ جہنم کے عذابوں کے مقابلے میں دنیا کی سخت سے سخت زندگی بھی جنت کے برابر ہے۔

جس شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی

حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں جنت والے نہ بتاؤں؟ ہر ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (جنتی ہے)۔ کیا میں تمہیں جہنم والے نہ بتاؤں؟ ہر درشت خو، زر پرست، متکبر (جہنمی ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ "کمزور سمجھا جانے والا" سے مراد شریف النفس آدمی ہے، جو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی زیادتی کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے کمزور سمجھتے

ہیں، اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کے شر وغیرہ ہی کا کوئی خوف ہوتا ہے۔

2۔ انفرادی معاملات میں نرمی اور درگزر کا چلن عام ہو جائے تو معاشرہ امن کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ فساد ہمیشہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اپنی مالی، جسمانی یا خاندانی اور افرادی طاقت پر گھمنڈ کر کے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پر زیادتی نہ کرے، خواہ اسے کمزور سمجھا جائے تو یہ اعلا اخلاق کا نمونہ ہے، جس کا ثواب جنت ہے۔

3۔ درشت خو سے مراد بات چیت کے انداز میں اور برتاؤ میں سختی اختیار کرنے والا ہے۔ اس قسم کے بداخلاق آدمی سے ہر کسی کا جھگڑا ہوتا ہے جس سے فساد جنم لیتا اور بڑھتا ہے۔

4۔ یعنی ایسا حریص آدمی جو مال جمع کرتا رہتا ہے لیکن بخیل بھی ہے، خرچ نہیں کرتا۔ مومن میں حرص اور بخل کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ منافقوں اور کافروں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

5۔ تکبر سے مراد دوسرے کو حقیر سمجھنا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود تسلیم نہ کرنا ہے۔ یہ برتری کا غلط احساس بہت سی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے۔

قابل رشک مومن

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو، اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گمنام ہو، اس کی پروانہ کی جاتی ہو، اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کا لالچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے، اس کا ترکہ تھوڑا ہو اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔"

سادگی

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سادگی ایمان میں سے ہے۔"

راوی نے کہا: سادگی سے مراد معمولی لباس و غذا پر اکتفا کرتا ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ تکلفات سے پرہیز ایمان کا جز ہے، لہٰذا سادہ عادات کا حامل عام نعمت پر بھی اللہ کا شکر کرتا ہے جب کہ زیب و زینت کا عادی بعض اوقات ایک بڑی نعمت کو بھی اپنے معیار سے کمتر سمجھتا ہے اور شکر کے بجائے شکوہ کرنے لگتا ہے۔

2۔ سادگی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً پیوند لگا کپڑا پہن لینا، زمین پر بیٹھ جانا، مفلس اور غریب کی بات سننی اور حتی الوسع مدد کرنے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا، غریب کی معمولی دعوت قبول کر لینا اور اس کا پیش کیا ہوا سادہ کھانا کھا کر احسان مندی کا اظہار کرنا۔ ملازموں سے تحقیر آمیز رویہ رکھنے سے اجتناب کرنا، اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا وغیرہ۔

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ فرما رہے تھے۔

"کیا میں تمہیں تمہارے بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟"

صحابہ نے عرض کیا: "کیوں نہیں اللہ کے رسول!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تمہارے بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔"

تنگ دستی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

انہوں نے عرض کیا: ''اس کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ ہم تو (اپنی معلومات کے مطابق) یہ کہتے ہیں: یہ شخص معزز (دولت مند) افراد میں سے ہے۔ اس کے بارے میں یہی توقع ہے کہ اگر (کسی گھرانے میں) نکاح کا پیغام دے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے (اور اسے اہمیت دی جائے)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

(پھر) ایک اور آدمی گزرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ''اللہ کے رسول! قسم ہے اللہ کی! ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں توقع ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے رشتہ نہ دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے۔ اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ (غریب مسلمان) اس (پہلے) شخص جیسے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ غریب مسلمان اگر گمنام ہو، دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ ہو لیکن اللہ کے ہاں ایسا ایک آدمی بھی دنیا بھر کے ان انسانوں سے بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

2۔ اللہ کے ہاں اصل اہمیت اور قدر و منزلت ایمان و تقویٰ کی ہے، نہ کہ مال و دولت، شان و شوکت، ذات برادری اور نام و نسب کی۔

3۔ نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا انتخاب کرنا چاہیے، خواہ وہ غریب ہی ہوں غریب نیک آدمی، امیر نیک آدمی کا ہم پلہ ہے لیکن بدعقیدہ یا بری عادتوں والا دولت مند شخص، نیک آدمی کا ہم پلہ نہیں۔

ناداروں کے مقام و مرتبے کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نادار مومن دولت مندوں سے آدھا دن، یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کے ہاں ہزار سال کی مدت ایک دن کے برابر ہے۔ (سورۃ حج، آیت: ۴۷) اس لیے دولت مندوں سے آدھا دن پہلے جنت میں جانے کا مطلب دنیا کے حساب سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہونا ہے۔

2۔ پہلے جنت میں جانا ان کے بلند درجات کو ظاہر کرتا ہے اور انہیں محشر کی مشکلات بھی کم برداشت کرنی پڑیں گی۔

شبہ کی حالت میں

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بعض افراد نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں (تو ہم کیا کریں؟)''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تم اللہ کا نام لے لو اور کھالو۔''

''یہ لوگ نئے نئے کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔'' (دارمی)

فائدہ: شبہ کی وجہ یہ تھی کہ یہ نومسلم افراد شاید یہ مسئلہ نہ جانتے ہوں کہ اللہ کے نام سے ذبح کرنا چاہیے۔ تو بتایا گیا کہ شبہ نہ کرو بلکہ بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔''

☆☆

pklibrary.com

جب تجھ سے ناتا جوڑ لیا

ش۔ب

س۔شادی کب ہوئی؟

ج۔یکم مارچ 2002ء کو ہوئی۔

س۔شادی سے پہلے کے مشاغل اور دل چسپیاں؟

ج۔پڑھنا، پڑھنا اور بس پڑھنا۔صرف رسالے پڑھنا میٹرک کرنے کے بعد سب سے زیادہ یہی مشغلہ تھا۔اور جو کچھ پڑھا وہ شام کو دوستوں کو سنانا۔گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے کاموں کا بوجھ نہیں تھا۔زندگی بہت خوب صورت لگتی تھی۔اپنی پسند کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر دوستوں اور بہنوں کو سنانا۔

س۔رشتے میں مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔رشتہ میرے بہن بھائیوں کی پسند سے ہوا۔میں ان سے اور وہ مجھ سے بالکل ناواقف تھے۔

س۔جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا ذہن میں؟

ج۔میں چاہتی تھی میری شادی جس سے بھی ہو وہ بے حد نیک انسان ہو پڑھا لکھا ہو۔

س۔منگنی کتنا عرصہ رہی، اس دوران بات چیت فون وغیرہ؟

ج۔ہماری منگنی تین ماہ رہی چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ان لوگوں کو بہت جلدی تھی کہ شادی کے بیچ میں کوئی رخنہ نہ ڈال دے کیونکہ ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں بے حد فرق تھا۔

س۔شادی کے لیے قربانی؟

ج۔الحمدللہ مجھے کوئی قربانی نہیں دینی پڑی بس اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کو چھوڑنا میری سب سے بڑی قربانی تھی۔اور یہ دنیا کی ہر لڑکی کرتی ہے اور یہ ہی زمانے کی ریت ہے۔

س۔شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے لین دین پر جھگڑا ہوا؟

ج۔الحمدللہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ہم رسومات کی قید سے آزاد لوگ ہیں۔ہمیں جھوٹی اور مصنوعی باتیں سخت ناپسند ہیں۔ہم نے ان لوگوں کو اس طرح کی رسومات نبھانے سے منع کر دیا تھا۔

س۔شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟

ج۔میرے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا اور لوگ اس بات پر بے حد حیرت کرتے تھے کیونکہ وہ غصے کے بہت تیز تھے اور ان کے سرکل میں ان کا غصہ ہی ان کی پہچان تھا لیکن میرے ساتھ اچھا رویہ روا رکھنے کی وجہ سے لوگ بے حد حیرت کرتے تھے۔خاص طور پر میری ساس وہ تو شاک میں ہی رہتی تھیں۔

وہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور میں سندھ کی لیکن ان کے اچھے سلوک کی وجہ سے یہ فاصلہ مجھے کبھی زیادہ نہیں لگا۔وہ میرے کہتے ہی مجھے میرے ماں باپ کے پاس ملوانے لے جاتے تھے۔

س۔پہلے بچے کی پیدائش؟

ج۔پہلے بچے کی پیدائش پر طبیعت خراب تھی۔میں پنجاب سے لازکانہ چیک اپ کروانے جاتی تھی۔لیڈی ڈاکٹر کی غلطی ہی میرے لازکانہ جانے کی وجہ بنی۔لیکن پھر بھی طبیعت نہ سنبھلی تو لیاقت میڈیکل میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔میرے شہر جام پور کی لیڈی ڈاکٹر کی ایک غلطی کی وجہ سے میں ایک ماہ اسپتال میں ایڈمٹ رہی۔آج بارہ سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی ایک غلطی کے نتائج میں آج تک بھگت رہی ہوں۔اس ڈاکٹر نے آج تک اپنی غلطی سے سبق نہیں سیکھا اور آج بھی بڑے دھڑلے سے اپنی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہے۔میرا پہلا بچہ مجھے جن پیچیدگیوں کے بعد ملا وہ میں بھول نہیں سکتی۔

س۔شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج۔شادی کے فوراً بعد کام سنبھال لیا۔صرف گھر میں، میں اور میری ساس ہوتے تھے۔وہ آفس چلے جاتے تھے۔اس وجہ سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔صفائی کے لیے کام والی ماسی آتی تھی۔تو صرف کھانا پکانا ہوتا تھا۔

س۔سسرال والوں سے کس حد تک توقعات پوری ہوئیں؟

ج۔ سسرال سے توقعات رکھنا ہی بے وقوفی ہے۔ سسرالی رشتہ دار بھی کبھی کسی کے ہوئے ہیں...... میری سسرال میں تو صرف میری ساس تھیں وہ بھی سو پہ بھاری تھیں۔ جو رشتے نہیں تھے ان کی کمی بھی پوری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے شوہر نے اسے ناکام بنادیا۔ میرے محلے کی ایک لڑکی میری ساس کو بہت بھڑکاتی تھی کہ تو نے بڑے گھر کی بیٹی لاکر بے حد غلطی کی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمارے گھر میں روز لڑائی جھگڑے ہوں۔ لیکن الحمدللہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ ہماری زندگی بے حد خوش گوار گزری۔

س۔ شوہر سے تعلقات و توقعات؟

ج۔ ہماری چھوٹی چھوٹی اور بے بنیاد باتوں پہ اکثر لڑائی ہوتی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد صلح بھی ہوجاتی تھی۔ میری ان سے یہ توقعات تھیں کہ وہ نمازی نہیں اور انہوں نے الحمدللہ میری اس توقع کو پورا کیا۔ وہ بہت غصہ والے تھے لیکن میرے کہنے پر انہوں نے اپنے غصہ کو تقریباً ختم کردیا تھا۔

س۔ کوئی حسرت یا خواہش؟

ج: الحمدللہ زندگی میں ایسی کوئی حسرت یا خواہش نہیں جو پوری نہ ہوئی ہوں۔ ماں باپ نے بغیر کہے میری ہر خواہش کو جانا اور اسے پورا کیا۔ مجھے رسالے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ ہم لوگ جس علاقہ میں رہتے تھے، وہ سندھ کا ایک چھوٹا علاقہ تھا اور وہاں رسالے وغیرہ نہیں ملتے تھے۔ لیکن میرے بابا نے اور میرے بھائیوں نے میری اس چھوٹی سی خواہش کو بھی حسرت نہیں بننے دیا۔ وہ لوگ مجھے دوسرے شہر سے رسالا لاکر دیتے تھے تاکہ میں پڑھ سکوں۔ بیس سال پہلے بھی وہاں رسالا نہیں ملتا تھا اور آج بھی نہیں ملتا۔ لیکن میرے ماں باپ مجھے دوسرے شہر سے رسالے لاکر دیتے تھے۔ جو رسالے میرے گم ہوجاتے تھے۔ وہ میں کراچی سے کارٹن بھر بھر کر لاتی تھی۔ بس ایک ہی میرا شوق تھا۔ اور جب میرے شوہر نے مجھے شادی کے بعد پہلی بار شعاع رسالا لاکر دیا تو مجھے بے حد حیرت ہوئی اور جب انہوں نے میری حیرت دیکھی تو کہنے لگے تمہارا یہی تو ایک شوق ہے۔ وہ کیسے نہ پورا ہوتا۔ اب تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ اللہ میرے بچوں کو کسی مقام پر پہنچادے اور مجھے امید ہے کہ اللہ میری اس خواہش کو ضرور پورا کرے گا۔ جیسے کہ آج تک میری ہر خواہش پوری ہوئی ہے۔

س۔ شادی شدہ بہنوں کے لیے پیغام؟

ج۔ زندگی میں ہر چیز اپنی پسند کی نہیں ملتی اس لیے حالات سے کمپرومائز کرنا سیکھنا چاہیے۔ زندگی کبھی دھوپ تو کبھی چھاؤں ہے۔ اپنے آپ کو اپنے گھر میں ایڈجسٹ کرنا سیکھیں۔ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے بچوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ اور وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوجاتے ہیں۔ اپنا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کرنا چاہیے۔ اور ان کی خاطر کمپرومائز کرلینا چاہیے۔ سچائی اور اللہ سے رشتہ قائم رکھو۔ زندہ رہو اور دوسروں کی زندگی کو مشکلات میں نہ ڈالو۔ جو سچ ہے اسے سچ کہو اور منافقانہ رویہ نہ اپناؤ۔ یہ بات میں نے اس لیے لکھی ہے کہ انڈین ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اردگرد کے ماحول کو خراب نہ کرو۔

س۔ رائٹر بہنوں کے نام پیغام؟

ج۔ میں رائٹر بہنوں کو یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ وہ واپس آئیں اور ہمیں اپنی تحاریر سے روشناس کروائیں۔ میں اس رسالے کو ہمیشہ فریدہ اشفاق، رفعت سراج اور میری بہت پسندیدہ رائٹر اقبال بانو کے ناولز سے سجا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کبھی بھی تو میرا یہ شوق پورا کردیا کریں۔ اب مجھے صائمہ اکرم چوہدری کا سیاہ حاشیہ پڑھنے کا اشتیاق ہے جو میں نے آج تک نہیں پڑھا۔ وہ صائمہ اکرم جو آج کی بہترین مصنفہ ہیں۔ میری بھانجی نور فاطمہ جو پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ اس رائٹر کی بہت تعریف کرتی ہے۔ وہ اور اس کی سہیلیاں صائمہ اکرم اور نمرہ احمد کی بہت بڑی فین ہیں۔ لیکن میں آج بھی اپنی پسندیدہ مصنفین رفعت سراج، اقبال بانو اور فریدہ اشفاق کو نہیں بھولی۔

س: المیہ؟

ج: شادی شدہ زندگی کے چودہ سال بہت خوب صورت گزرے۔ اللہ نے دو بہت پیارے پیارے بچے دیے۔ اچانک شوہر کی ڈیتھ ہوگئی، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ سب ہوجائے گا۔ میری زندگی کی یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

☆☆

pklibrary.com

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س۔س

س1۔شادی کب ہوئی؟

ج۔میری شادی 23 جنوری 2000ء میں ہوئی۔

س2۔شادی سے پہلے کے مشاغل اور دل چسپیاں؟

ج۔رسالے پڑھنا، ٹی وی دیکھنا، بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کود، گھر کے کام بھی بہت شوق سے کرتی تھی۔

س3۔رشتے میں مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔جی! میری باجی (جو کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں) انہوں نے بتایا۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتے کے وقت میں ''نویں دسویں'' میں بھی اتنی سمجھ نہیں تھی کہ کچھ کہہ سکوں۔ رشتہ اچھا تھا۔ خالہ کے گھر ہوا اس لیے جلدی ہوا پھر شادی بی اے کے بعد ہوئی۔

س4۔جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا ذہن میں؟

ج۔جی! وہی بات کہ جس عمر میں رشتہ ہوا۔ کوئی تصور نہیں تھا۔ جوں جوں ٹائم گزرا اچھا سوچا ویسے ہی ملے الحمدللہ! بہت نرم دل، معاملہ فہم اور خوب صورت دل والے۔

س5۔منگنی کتنا عرصہ رہی؟ اس دوران بات چیت فون وغیرہ؟

ج۔سات سال رہی۔ باقاعدہ کوئی رسم نہیں ہوئی پر سسرال سے عیدی وغیرہ آتی تھی۔ اور ہمارے گھر سے بھی جاتی تھی۔

س6۔شادی کے لیے کوئی قربانی؟

ج۔سب سے بڑی قربانی، اپنا شہر لاہور چھوڑا اپنی دوست شائستہ اور بہت کچھ۔

س7۔شادی بخیر وخوبی انجام پائی یا رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا ہوا؟

ج۔نہیں کوئی نہیں، میں یہاں بتاتی چلوں کہ میرے سسرال اور میکے میں سب پڑھے لکھے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بہت اچھی بارات لے کر آئی تھیں میری خالہ، لوگ ابھی بھی یاد کرتے ہیں۔ رسموں میں دودھ پلائی کی میری بہنوں اور کزنز نے، ادھر سے بھی پیسے دیے۔

س8۔شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔دیکھا ہوا تو تھا پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی ہماری بھی بس سلام کیا تھا۔

س9۔شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔شہر بدلا امی، ابو بہت یاد آتے تھے۔ کبھی کبھی بہت روتی تھی، تب تو موبائل بھی نہیں تھا۔ بس پی ٹی سی ایل پہ ابو فون کرتے تھے۔

س10۔شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔دس دن بعد! مجھے کسی نے نہیں کہا کہ کام کرو۔ میں نے خود ہی کرنا شروع کر دیا۔ جیٹھانی کرتی تھیں۔ چھوٹی نند کرتی تھی، میں نے بھی کرنا شروع کر دیا۔ سب نے منع بھی کیا تھا پر میں نے کیا۔

س11۔میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟

ج۔نہیں! میں جس طرح پکاتی تھی اسی طرح

پکایا اگر کچھ اوپر، نیچے ہوگیا تو سب کچھ نہ کچھ کہتے۔ چاہے کوئی چھوٹا ہوتا یا بڑا۔

س 12۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی؟

ج۔ کھانے کی ہوتی تھی میری ساس (خالہ جو کہ اب دنیا میں نہیں ہیں)۔ جو اچھا ہوتا اس کی تعریف کرتی تھیں۔

س 13۔ سسرال سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج۔ سسرال سے کوئی توقع نہیں رکھی، نہ ہی کبھی کوئی رکھے، کوشش یہ کی کہ میں ان کی توقعات پہ پورا اتر سکوں۔ جو بھی ذمہ داری مجھے ملی کوشش کی کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

س 14۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج۔ واؤ! جی میرا پہلا بیٹا سعد جو کہ فرسٹ ایئر میں ہے۔ اس کی بہت خوشی منائی گئی۔ سب نے نام رکھے پھر پرچیاں ڈالی گئیں۔ دادا ابو کا دیا گیا نام رکھا گیا۔ تندشناء نے ساس نے بہت خیال رکھا، جیٹھانی نے بھی جو بھی مشورہ دیا اچھا دیا اور میں نے بھی جلدی سیکھ لیا۔ س 15۔ سسرال میں مقام؟

ج۔ شکر ہے سب بہت عزت کرتے ہیں سب سے دوستی ہے۔ اور کافی ٹائم کے بعد ہی یہ مقام آتا ہے۔ ایک دم سے نہیں آتا۔

س 16۔ میکے اور سسرال میں فرق؟

ج۔ بہت فرق تھا جی! ہم من موجی قسم کے لوگ! (ہم لوگ رشتہ دار بھی تھے آپس میں) یہ لوگ اصولوں پہ چلنے والے بس انہی اصولوں کو اپنایا۔ کبھی برا نہیں سمجھا نہ کہا۔ اس لیے آج اپنا الگ گھر ہے۔ اپنا راج ہے۔

س 17۔ جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج۔ بالکل الگ! کیونکہ کوئی جتنا بھی اچھا ہو۔ اختلافات ہو ہی جاتے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ جب سب شادی شدہ ہو جائیں تو بس الگ، پھر بندے کی اپنی لائف ہوتی ہے۔ جب الگ ہونا چاہا میں نے تو میاں نے پورا ساتھ دیا۔

س 18۔ شوہر سے تعلقات؟

ج۔ بہت اچھے ہیں کیونکہ میں ٹیچنگ کرتی ہوں۔ میاں جی میرے معاملات میں بالکل نہیں بولتے۔ کبھی کبھی یہی چیز نیگیٹو بھی ہو جاتی ہے کہ بندہ کچھ تو بولے! اور لڑائی جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔ سعد، حنی، منیر ہمارے تین بچے ہیں۔

☆☆

pklibrary.com

مقبول مصنفہ

شگفتہ بھٹی سے ملاقات

شاہین رشید

"آپ کے پاس تین ماہ کی زندگی ہے۔"
مگر آج پانچ سال ہوگئے کینسر سے لڑتے ہوئے۔

زندگی بہت خوب صورت بہت حسین ہے مگر اس وقت تک جب تک آپ صحت مند، تندرست توانا ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھی اور خوش حال زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ پھر اچانک صحت کے مسائل سامنے آجاتے ہیں اور جو آپ نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔ اس کا انکشاف ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں سے تو انسان نبرد آزما ہو جاتا ہے مگر کینسر جیسے مرض کا نام سن کر تو چنگا بھلا انسان اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ رہا ہوتا ہے خواہ کینسر کی پہلی اسٹیج کیوں نہ ہو۔

"شگفتہ بھٹی" ایک معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور بہترین ڈرامہ نگار ہیں۔ جب ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہو چکی ہیں اور ان کے پاس زندگی کے صرف چند ماہ ہی ہیں تو پھر خود سوچیں کہ ان کی اپنی کیا حالت ہوئی ہوگی..... یقیناً پیروں تلے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوگی..... بچوں اور شوہر نے کیا محسوس کیا ہوگا اور پرستاروں پہ کیا بیتی ہوگی۔

گزشتہ دنوں جب میں نے شگفتہ بھٹی کو صائمہ اکرم چوہدری کے ساتھ خوش و خرم دیکھا تو مجھے نہ صرف بہت زیادہ خوشی ہوئی بلکہ میں نے چاہا کہ پوچھوں کہ اس مرض کے ساتھ کیسے مقابلہ کیا؟..... اور مرض کے دوران جو آپ پر بیتی اس کی "آپ بیتی" آپ سے پوچھنا چاہتی ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں شگفتہ صاحبہ..... اور بہت ہیں..... مبارک ہو کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے صحت یاب کیا؟

"الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں..... اور واقعی اللہ کا کرم ہو گیا کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"آپ کی کہانی آپ کی زبانی سننا چاہتے ہیں آپ کے قارئین اور ڈرامے کے حوالے سے آپ کے پرستار۔"

"جی کیوں نہیں۔"

"الحمدللہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ Ovarian cancer جب 2008 میں تشخیص ہوا تو ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ میں کینسر کی چوتھی اگریسو اسٹیج پر ہوں..... یعنی یہ بیماری میرے پیٹ میں کافی پھیل چکی تھی کچھ حد تک جگر اور پھیپھڑے بھی متاثر ہیں اور میڈیکل رپورٹس کے مطابق میرے پاس زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ زندگی کے ہیں..... مگر علاج تو ہونا چاہیے۔

مجھے اس خبر نے بالکل ایسے ہلا کر رکھ دیا جیسے کسی بھی ہنستے مسکراتے انسان کے سامنے موت کے فرشتے کی اچانک آمد ہو جائے اور وہ اسے روح قبض کرنے کی اطلاع دے..... خوف موت کا نہیں تھا کہ وہ تو زندگی سے زیادہ برحق ہے مگر میرے بچے میرے بغیر کیا کریں گے، ان پر کیا بیتے گی؟..... اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا..... اس وقت میرا دل اپنے بچوں کے لیے تڑپ رہا تھا جیسے ہر ماں کا تڑپتا ہے۔

میں ابھی بڑی محنت اور محبت سے اپنے بچوں کو اعتماد سے جینا، دنیا سے لڑ کر آگے بڑھنا سکھا رہی تھی..... ابھی میرا بڑا بیٹا فہد گریجویٹ نہیں ہوا تھا..... بیٹی کی یونیورسٹی شروع ہی ہوئی تھی چھوٹے بیٹے زید کی ایف ایس سی چل رہی تھی..... ان تینوں کی میں بہت پیار سے ہر خواہش، ہر ضرورت کو پورا کر رہی تھی، ان کی آنکھوں میں، میں نے مستقبل کے بہترین سہانے خواب اتارے تھے، جن کی تعبیر کے لیے میں نے خود کو اپنا آپ مار کے محنت اور کوشش کی چکی میں پیس رکھا تھا۔

سب سے بڑی مشکل میرے لیے اپنی بیماری کو ان سے چھپانا تھا..... بلکہ خاندان بھر سے چھپانا تھا تاکہ یہ ناامید اور دکھی ہو کر اپنے حوصلے نہ کھو دیں۔ اور اپنے قدم منزلوں سے پہلے ہی نہ روک لیں۔

بہر حال میں اپنی رپورٹس لے کر کراچی آ گئی۔ اور مزید چیک اپ اور ٹیسٹ آغا خان اسپتال سے کروائے، اور سیکنڈ اوپینین بھی وہی تھا کہ آپ کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ سرجری میری اس وقت ممکن نہیں تھی کیونکہ کینسر کا پانی میرے پیٹ میں بھرا ہوا تھا۔ پہلے اسے کیموتھراپی سے خشک کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور میری پہلی کیمو کی ڈوز کراچی آغا خان اسپتال سے شروع ہوئی..... ان دنوں میں پیاری ''صائمہ اکرم چوہدری'' کے گھر پر تھی اور میں نے اسے بھی اپنی سیریس بیماری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

صائمہ کے سسرال میں اچانک کسی کے انتقال کی وجہ سے وہ گھر چلی گئی اور کیمو کی پہلی اذیت کا زہر یلا ذائقہ میں نے اس کے گھر میں چکھا..... مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیمو کی ڈوز لگنے کے بعد اتنی شدید تکلیف ہوتی ہے میں تو بڑی بہادر بننے کے چکر میں تھی کہ خاموشی سے اور سب سے پوشیدہ رکھ کر اپنا علاج کرالوں گی..... مگر میری قوت برداشت اس لیے بھی جواب دے گئی کہ مجھے اس ڈوز نے ری ایکٹ کر دیا تھا۔ اور مجھے خون کی الٹیاں شروع ہو گئی تھیں..... میرا پیٹ سرخ جلتے ہوئے انگاروں جیسی گلٹیوں سے بھر گیا مجھے لگا کہ ڈاکٹر نے تین ماہ زیادہ کہہ دیا تھا میرا وقت رخصت تو سر پر کھڑا تھا۔

تب میں اپنی بڑی بھابھی کی امی کے پاس آ گئی (اللہ تعالیٰ ان کے جنت میں درجات بلند کرے آمین) وہ مجھے سورہ رحمٰن پڑھ پڑھ کے دم کرتیں اور پانی پلاتی رہیں۔ پھر میں ذرا سنبھلتے ہی کراچی سے ملتان آ گئی، مجھ سے پہلے میرے کینسر کی خبر خاندان بھر میں پھیل چکی تھی اور جب میں ایئر پورٹ سے باہر آئی تو میرے بچے فٹ پاتھ پر بیٹھے رو رہے تھے۔

میں یہ ساری تفصیل اس لیے نہیں بتا رہی کہ میں بہت اذیت سے گزری، کینسر کا ہر مریض اسی اذیت سے گزرتا ہے..... میں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جب بچوں کو بتایا جائے کہ ان کی ماں مرنے والی ہے تو ان پر جو قیامت گزرتی ہے تو وہ بھی دراصل اسی ماں پر گزرتی ہے۔

بہر حال مجھے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ طبیعت زیادہ ہی خراب ہو رہی تھی..... کینسر میرے پیٹ، اسکن میں سرایت کر رہا تھا اور اس پر بنی گلٹیوں سے مواد پانی کی طرح بہنے لگا تھا..... جس کی اپنی ناقابل بیان جلن اور تکلیف تھی۔ سخت بخار حلق سے خوراک کی نالی اور معدے تک

انفیکشن..... میرے شوہر کا دل میرے بچوں سے بھی زیادہ چھوٹا ہے وہ تو مجھے دیکھ کر ہمت ہی ہار گئے بچے مجھ سے چھپ کر چپکے چپکے روتے رہتے تھے۔

''میکے اور سسرالی..... سب کا کیا ردعمل تھا؟ مالی اعانت کی کسی نے..... کیونکہ علاج تو بہت مہنگا ہے؟''

''پورا خاندان الحمدللہ میرے ساتھ تھا۔ میری بھابیاں، بھائی، میری نندیں، دیورانی سب نے ہی میرا خیال رکھا۔ مگر علاج بہت مہنگا تھا کیموکی ایک ڈوز ساڑھے تین لاکھ کی تھی۔ میں سفید پوش قلم مزدور عورت اور مجھ سے بھی زیادہ سفید پوش میرے میاں جی..... بچوں کے تعلیمی اخراجات اور گھر کا کرایہ۔''

ماہانہ اخراجات کے ساتھ میرا اس قدر مہنگا علاج..... میرے بھانجوں علی اور احمد حسن علی اور احمد حسن نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر میرا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ تکلیف میں اضافہ ہی ہو رہا تھا..... تب ڈاکٹر نے کہا کہ آپ دن بدن سیریس ہو رہی ہیں، اگر کوئی اہم کام یا فرض ادا کرنا چاہتی ہیں تو کرلیں..... ایک روایتی ماں کی طرح میرا خیال اپنی بیٹی کی طرف گیا اور سوچ آئی کہ میرے بعد سب سے زیادہ یہ رلے گی۔ اس کی فوراً شادی کردیتی ہوں۔ پھر سوچا یہ کام آسان نہیں ہے جس نے اس کی شادی کا انتظام کرنا ہے وہ باقی سب کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کا ایک کن ہر ناممکن کو ممکن کردیتا ہے تو کیوں نہ اس کے در پر حاضری دوں اور وہاں جا کر مانگوں..... ایک امید ایک حوصلہ بھی تھا پھر اللہ کی طرف سے بلاوا بھی تھا..... سو لمحوں میں ارادہ ہوا اور جیسے منٹوں میں اس نے انتظام کردیا میں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ مدینہ پہنچ گئی۔

مدینے کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی لگا کہ اس کی مہربان ہواؤں نے میرے کمزور پھیپھڑوں کو زندگی سے بھرپور آکسیجن فراہم کردی ہے۔ میں نے اللہ کے گھر جانے سے پہلے اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار پر حاضری دے کر اپنی عاجزی اور بے بسی کی کہانی سنانی ضروری سمجھی اور جس طرح ہم دعا مانگنے سے پہلے درود پاک پڑھنے کی فضیلت پر یقین رکھتے ہیں بالکل اسی طرح مجھے یقین تھا کہ یہاں سے سلام کرکے آگے بڑھی تو خالی جھولی نہیں جاؤں گی..... وہاں بیٹھ کر میں نے محبوب دو جہاں پر جتنا ہوسکا درود پاک پڑھا..... میرے آنسو تو خیر خود بہ خود رواں تھے اور دعائیں شدید..... بس سفارش پہ لکھوانا چاہتی تھی کہ معافی مل جائے خوب آب زم زم پیا اور پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈھیروں باتیں کیں اور سب کی سب لکھیں۔

میرا دل سکون میں تھا اور حوصلہ پختہ اور یقین کامل ہو رہا تھا کہ اگر میری زندگی باقی ہے تو میں شفایاب ہو کر جاؤں گی اور موت آئی تو معافی نامہ بھی لکھوا کر ہی جاؤں گی۔

مدینہ سے مکہ آئی تو مجھے اپنی صحت بھی اچھی لگی اور کافی انرجی بھی محسوس ہوئی۔ بس پھر میرے اللہ کا گھر تھا اور میری التجائیں۔ کبھی آنسو تو کبھی مسکان..... در کعبہ تھا۔ کعبے کی کالی کملی تھی۔ رکن یمانی کا مقدس پتھر اور وہ کونا۔ حجر اسود کی زیارت اور ملتزم سے چمٹ کر رویا تھا..... میں اس سے پہلے بھی تین بار عمرے پر جا چکی تھی..... مگر اس بار کے احساسات میں شاید کبھی بھی نہ بتا سکوں گی۔

میں اپنے وطن لوٹی تو ہشاش بشاش اور تازہ دم تھی۔ میرے سارے درد آرام پا چکے تھے۔ میرا دل میرا دامن اس کی رحمتوں اور محبتوں سے بھرا ہوا تھا..... اپنے سارے ٹیسٹ کروا کے اپنی ڈاکٹر کے پاس گئی تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پہلا سوال یہ تھا کہ تم نے کیا ایسا کیا ہے کہ تمہاری ہر رپورٹ سے بیماری غائب ہے۔ ہر اسکین کلیئر ہے۔ سارے لیول نارمل ہیں۔ اور میرے پاس سوائے یہ کہنے کہ کوئی جواب نہیں تھا کہ بس اس کی نظر کرم ہے اور کچھ نہیں..... وہ اپنے منگتو کو کبھی خالی نہیں لوٹاتا یہ

صرف میرے اللہ کی صفت اور شان ہے۔"

"عمرے سے واپسی پر کیا اس مرض سے بالکل نجات پالی؟"

"عمرے سے واپسی پر سال بھر میں بالکل ٹھیک رہی۔ میرے اندر کینسر کا نام و نشان بھی نہ رہا..... مگر پھر اچانک یہ مردود ایک بلا کی طرح جاگا اور پھر دو سال اسے سنبھالتے گزر گئے..... کئی بار موت کے منہ میں جا کر واپس آئی..... مجھے بے شمار مشکلیں مصیبتیں آئیں۔ تنگی آئی۔ مقروض ہوئی مگر پھر جو بھی ہوتا تھا عارضی ہوتا تھا درد اٹھتا پھر آرام آجاتا..... لیول آخری حد کراس کر لیتے مگر جلدی نارمل بھی ہو جاتے۔

اور آپ کا یہ سوال کہ مالی طور پر متاثر ہوئیں اور کس نے کتنا ساتھ دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل ..... مالی طور پر متاثر ہوئی مگر اللہ کا کرم رہا۔ میرے پاس ایک دن کے پین کلر خریدنے کے پیسے نہ ہوتے اور اللہ پوری ڈوز کا انتظام کر دیتا۔ قرض دینے والا یہاں تک کہہ دیتا کہ ہم نے آپ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے روز مرتی ہیں۔ پھر جی جاتی ہیں کسی بل مر گئیں تو ہمارا قرضہ کون دے گا اور پھر میرا اللہ کوئی ایسا بندوبست کر دیتا کہ قرض اتر جاتا۔

میں نے تکلیف کی شدت میں اپنے قریبی رشتوں کی بے حسی اور بالکل انجان لوگوں کو اپنا دوست پایا۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ کیا ہے کیوں ہے۔ کیونکہ میں بالکل صحت مند ہو کر مرنے والی ہو جاتی ہوں۔ مگر مجھے پتا ہے یہ سب عارضی مدت کے لیے ہوتا ہے۔ میں اس سفر مقدس سے خالی ہرگز نہیں لوٹی۔

آپ یقین کریں مجھے دیکھ کر کوئی میری بیماری کی شدت کا اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ میں ہرگز کمزور اور ناتواں دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ میرے اندر جو انرجی وہاں سے آئی تھی وہ میری طاقت ہے۔ میری ابھی بھی آخری کیموتھراپی جولائی 2023 میں ہوئی ہے اور میں اکثر تنہا اسپتال جا کر ڈوز لگوا آتی ہوں۔ اب مجھے اس طرح کا درد نہیں ہوتا جیسا پہلے ہوتا تھا یا پہلی بار ہوا تھا۔ میں ٹھیک کھاتی پیتی ہوں، ایکٹو چلتی ہوں اور سارے اندر باہر کے کام کرنے کے ساتھ ساتھ لمبے سفر بھی با آسانی کر لیتی ہوں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

میں سمجھتی ہوں یہی صحت ہے اور جب تک میرے رب نے میری زندگی لکھی ہے وہ مجھے کبھی کمزور لاچار اور تنہا نہیں چھوڑے گا، وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ بس میری لیے یہی کافی ہے۔ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔

"ڈراما انڈسٹری کے لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا یا چھوڑ دیا؟"

"ڈراما انڈسٹری میں بہت دوستوں نے بہت خیال رکھا۔ لیکن پروفیشنل سائیڈ میں کچھ مرحلے تکلیف دہ بھی رہے۔ لوگوں کو لگا کہ شاید میں اب کبھی صحت یاب نہ ہو سکوں گی اور لکھ نہ سکوں گی اس لیے تین سال تک میرا کوئی پروجیکٹ اپروو نہیں ہوا۔ مگر بے یار و مددگار اللہ نے پھر بھی نہیں چھوڑا۔

میرے بیٹوں نے محنت کی، وہ دونوں جلدی ذمہ دار اور فرض شناس ہو گئے۔ بڑے بیٹے نے گریجویشن کے ساتھ ہی جاب شروع کر دی تھی۔ چھوٹا ماشاء اللہ اپنی تعلیم اسکالرشپ پر ہی حاصل کر رہا تھا اس لیے اس کا مجھ پر کوئی مالی بوجھ نہیں تھا۔ پھر وہ بھی لکھنے لگا اور یوں کچھ نہ کچھ گزارہ بہتر ہو گیا۔"

"اب بیماری کی کیا صورت حال ہے؟"

"الحمد للہ ..... اب میری میڈیکل رپورٹس بالکل نارمل ہیں۔ اللہ کرے ایسی ہی رہیں۔ ویسے یہ کینسر کوئی عجیب سی بلا ہے کیموتھراپی اور ریڈی ایشن سے جل کر کچھ عرصہ راکھ تو ہو جاتی ہیں مگر شاید اس میں کہیں نہ کہیں چنگاری دبی رہ جاتی ہے جو کچھ عرصے کے بعد پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ اللہ اس موذی مرض

بلکہ ہر مرض سے سب کو محفوظ رکھے۔ (آمین)

"کوئی بھی بیماری ہو اس میں مبتلا ہونے والے سے میں یہ ضرور کہوں گی کہ علاج سنت ہے ضرور کروائیں مگر اس ایمان اور دعا کے ساتھ دوا کھائیں کہ اس سے شفا اللہ ہی کے کرم سے ملے گی۔ یقین مانیے قرآن پاک میں ہر بیماری کا علاج اور ہر مرض کی دعا موجود ہے۔ ہمارے حضور پاکؐ نے اس کی ترکیب اور پوری ترتیب بتا دی ہے۔ اس پر پورے یقین سے عمل کریں۔ ادھر ادھر کے فقیروں کے دربار میں جا کے دھکے نہ کھائیں بلکہ اپنے رب سے لو لگائیں۔

کچھ مستند دعائیں اور مجرب روحانی نسخے جنہیں اختیار کر کے میں نے صرف شفا ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بھی پایا ہے۔ ان شاء اللہ آپ سب سے جلدی شیئر کروں گی۔ (سفرنامہ ارض مقدس اور اپنی گزشت تفصیل سے لکھوں گی) اللہ ہم سب کے ایمان سلامت رکھے اور ہم سے راضی رہے (آمین)

"اور آخری بات۔"

"اب الحمدللہ تم الحمدللہ میں پہلے سے زیادہ بہتر اور بھرپور توانائی کے ساتھ پھر سے میدان قلم میں ہوں۔ جلد ہی میرے نئے سیریل سے اور ناولز سے آپ لوگ لطف اندوز ہوں گے ان شاء اللہ۔"

"بہت شکریہ شگفتہ بھٹی صاحبہ آپ کی یہ "آپ بیتی" یقیناً دوسروں کے لیے حوصلہ اور سکون کا باعث بنے گی اور جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں ان کے لیے مشعل راہ بنے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب -/1200 روپے

ڈسکاؤنٹ -/300 روپے

آج ہی -/950 روپے

منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

زاہدہ شوکت ساہیوال سے لکھتی ہیں

آپ کا رسالہ میں ہر ماہ پڑھتی ہوں، ماشاء اللہ بہت ہی اچھا ہو گیا ہے اس ماہ دسمبر میں میرا "تجھ سے ناتا جوڑا" میں انٹرویو پڑھا۔ چلو دو سال بعد چھپا پھر بھی بہت خوشی ہوئی کہ میری تحریر آپ کو پسند آ گئی۔

حمد اور نعت کے بعد پیارے نبی ؐ کی پیاری باتیں تو ایمان تازہ کر دیتی ہیں۔ حمیرا شفیع کا مٹھی بھر محبت بہت اچھا تھا افسانے میں دکھاوا، چپ کی تو کیا بات ہے۔ لکھنے والے نے کمال کر دیا، ان بہنوں کو اچھا لکھنے پر داد دیتی ہے۔ اس ماہ میرے تیسرے نمبر والے بیٹے عثمان کی شادی ہے 28 جنوری کو، اس لیے مصروفیت زیادہ ہے۔

ج: پیاری زاہدہ! بیٹے کی شادی کی مبارک باد ہماری دعا ہے کہ عثمان اور ان کی شریک سفر خوش رہیں اور دیگر متعلقین کے لیے بھی یہ ملاپ مسرت اور شادمانی کا باعث ہو۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

انیسہ عائش کوٹ رادھا کشن قصور سے لکھتی ہیں

اس بار ہمارا ارادہ تھا خط میں ناغہ کرنے کا کہ قدر کھو دیتا ہے۔ روز کا آنا (ہاہاہا) مگر نہیں کر سکے۔ سب سے پہلے رنگا رنگ سروے کو پڑھا۔ "شہر شام ہجر" میں ہمارا عیسیٰ کے متعلق اندازہ بالکل درست ثابت ہوا کہ عیسیٰ تانیہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانے والا۔ ماء المسلوک میں دیکھتے ہیں کہ آگے ہوتا ہے کیا، والعصر میں کرداروں کی بے حسی اف توبہ "جو اک سکھ نے آزاد کیا" بہترین۔ مزہ آ گیا پڑھ کر "مطفل اولڈ ہاؤس" کو پڑھتے ہوئے عجیب سے احساسات سے دوچار ہوئے۔ اختتام اچھا بھی تھا مگر سوگوار بھی۔ افسانوں میں 'سال نو اور آنٹی پرابلم' میں بچوں نے صحیح سبق سکھایا، "آنٹی کو "ترس" کو پڑھ کر بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئے۔ افسوس وفا کیسی نکلی۔

"دینو موچی کی سامرہ" اچھا تھا۔ مگر افسردہ کر دینے والا۔ "سالگرہ" ایثار و وفا کا درس دیتا۔ ایک میٹھا سا افسانہ تھا۔ باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج: انیسہ! جہاں تعلق میں تکلف، تصنع اور بناوٹ ہو۔ وہاں روز کا آنا جانا قدر کھو سکتا ہے۔ ہماری محفل تو بے تکلف دوستوں کی محفل ہے جہاں کوئی ایک بھی غیر حاضر ہو تو ہم بھی اور دیگر قارئین بھی اس کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ آپ بلا جھجک ہر ماہ تشریف لائیں۔ دیدہ و دل فرش راہ۔

عذرا آصف نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سال نو کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ شادیوں کے سیزن کے حساب سے...... اکتوبر میں بھی یہی ماڈل دلہن بنی دور فضاؤں میں کچھ تلاشتی ہوئی نظر آئیں۔ سب سے بڑے رب اور سب سے بڑے انسان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا "پیارے نبی ؐ کی پیاری باتیں" ایسے الفاظ جو تا قیامت جاوداں رہیں گے۔ "ناتا" اس بار خون کے آنسو رلا گیا۔ اف پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نادیہ احمد سے ملاقات کے بعد "نئے سال کی دہلیز پر" تمام بہنوں سے ملاقات اچھی رہی۔ میں نے السی کی پنیاں بنائی ہیں پچھلے ہفتے، ترکیب ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر 2022ء کے مارچ

pklibrary.com

کے شمارے میں (خواتین میں) گوتی جمال نے ترکیب شیئر کی ہوئی تھی تو ٹرائی کیا۔ بہترین بنیں، میاں کو بہت پسند آئیں۔

"مستقل ناولز" میں اس دفعہ نمبر ون پر شہر شام ہجر، دوسرے نمبر پر ماء الملوک اور تیسرے نمبر پر والعصر رہا۔ افسانوں میں حمیرا شفیع کا افسانہ...... سال نو اور آنٹی پرابلم تو جناب ہر خاندان میں (ایک یا زیادہ) ایسا نادرونایاب پیس ضرور ہوتا ہے (طنزاً) اور ہمارا خاندان تو ویسے بھی خودکفیل ہے۔ (مزاقاً) "کہر میں ڈوبی شام" "قریبی رشتوں کی سفاکیت لیے ہوئے افسردہ کر گیا۔ "ترس" وفا کا طریقہ کار غلط تھا اور زاہدہ کا بھی۔ حد سے زیادہ حساسیت بھی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ سائرہ بھی تمام ازواج دل اپنے کشادہ اور نرم کرلیں تو دنیا جنت بن جائے۔ "جواک سکھ نے آزاد کیا" جس گھر میں عورت کو اپنی چلانے کی عادت ہو وہاں تو ایسے ہی معاملات ہوتے ہیں تقریباً "طفل اولڈ ہاؤس" سب مایا ہے بقول انشاء جی اور رتی برابر بھی شک نہیں ہے، اس ماہ "نظمیں اور غزلیں" بس گزارہ تھا۔ اس ماہ کی "مسکراہٹیں۔ بھول" میرے دونوں بیٹوں عبداللہ سیف اور ابوذر سیف کو بہت پسند آیا۔ بہت ہنسے اتنا کہ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اور انابیہ سیف انہیں دیکھ دیکھ کر ان ہی کی طرح ہنستی رہی (اللہ پاک انہیں ہمیشہ یونہی ہنستا مسکراتا رکھے)۔

"باتوں سے خوشبو آئے" یقین مانیے ایک ایک لفظ دل میں کھب گیا "کھلتا کسی پہ کیوں" اس بار تقریباً سارے ہی اشعار اچھے تھے۔ "خط آپ کے" بہت ساری بہنیں غائب تھیں۔ یار یہ زینب نور مسلسل غائب ہیں۔ انیسہ سیف اور ابوذر سیف (میرے بچوں کی برتھ ڈے تھی جنوری میں) وہ نام گڈمڈ ہو گئے ہوئے تھے خط میں۔ سیف میرے سسر صاحب کا نام ہے یعنی ہمارا سرنیم۔ میرے چاروں بچوں کے ساتھ ان کا نام لگا ہوا ہے۔ آپ نے انیسہ اور سیف کو ہی برتھ ڈے کی مبارک باد دے ڈالی۔

ہماری لکھاری بہنیں انیسہ سلیم اور انسہ عائش یہ انیسہ ہیں یا انیسہ...... کیوں کہ میری بیٹی انیسہ ہے اور اسے اپنا نام پسند نہیں۔ (ہاہاہا) اب کیا کریں۔

بیوٹی بکس بھی شان دار تھا سب کے بالوں کے مسئلوں کا حل لیے۔

ج: پیاری عذرا! آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ پچھلے ماہ آپ کی بیٹی انیسہ سیف کی سالگرہ تھی۔ ہم نے سہواً انیسہ کے ساتھ ساتھ سیف صاحب کو بھی سالگرہ کی مبارک باد دے ڈالی۔ معذرت۔

عمارہ حسین لکھتی ہیں

اپنا خط دیکھ کر جو خوشی ہوئی، لیکن یہ کیا آپ میری بات شاید سمجھ نہ سکیں۔ میں خود ان چیزوں اور سوشل میڈیا اکاؤنٹس کے بہت خلاف ہوں جو بنا اجازت کے ڈائجسٹ کی کہانیاں یا مواد پیک کر دیتے ہیں۔ میرے کیس میں ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں بس ڈائجسٹ کا سرورق انسٹا سٹوری پر لگاتی ہوں۔ پھر جو ریڈرز سوال کرتے ہیں۔ انہیں آن لائن پڑھنے کے بجائے خرید کر پڑھنے کا کہتی ہوں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں ان چیزوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے لکھاریوں اور مختلف اداروں کا نقصان ہورہا ہے۔

اب آتے ہیں ڈائجسٹ کی طرف پہلی شعاع سے لے کر کاظم پاشا سے ملاقات تک سب کچھ بہت دلچسپ تھا۔ افسانے اس دفعہ سارے میرے دل کو لگے۔ "بابل کا آنگن" مختصر مگر نہایت ہی پراثر تحریر۔ لیتی آصف کا "دکھاوا" سبق آموز پیغام کے ساتھ دل کو بھا گیا۔ حمیرا شفیع ماشاءاللہ مسلسل لکھ رہی ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تحاریر مجھے بھی لکھنے کے لیے بہت موٹیویٹ کرتی ہیں۔

ریحانہ وقاص نے "چپ" کے نتائج واضح کر کے بہت سی چیزوں کو مختلف زاویے سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سنیعہ عمیر آپ کے لیے میرے پاس تعریف کے الفاظ نہیں ہیں۔

ج: پیاری عمارہ! لیٹ موصول ہونے کی بناء پر پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ اس ماہ آپ کا تبصرہ شامل اشاعت ہے۔ بہت شکریہ۔

سعدیہ مصطفیٰ...... گاؤں مڑھ بھنگواں سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے
اگر میں یہ کہوں کہ میری زندگی میں شعاع نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے تو میرا خیال ہے یہ بات بالکل درست ہے۔ شعاع نے بہت کچھ سکھایا۔ بے شک اس میں اس ادارے سے وابستہ ہر انسان کی بہت ساری محنت شامل ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں ہر ماہ صرف چند روپوں کے عوض مکمل، صاف ستھرا اور جامع رسالا گھر بیٹھے ہی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔
اور میں پرسنلی خود اس "شعاع" کے ساتھ وابستہ ہر انسان کی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی کاوشوں کے بغیر ہمیں یہ رسالا مہیا ہونا ممکن نہ ہوتا۔
کچھ باتیں تھیں کافی عرصے سے کرنے کو دل تھا وہ یہ کہ شعاع میں معمولی پڑھے لکھے یا بہت کوالیفائیڈ سب کو اپنی بات کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جو کبھی گھر سے بھی باہر قدم نہیں نکالتیں اور پھر صرف اس "شعاع" کے ذریعے ان کا نام نہ جانے کون کون سے شہروں میں پڑھنے والے قارئین تک پہنچتا ہے۔
"خط آپ کے" جو آپ لکھتی ہیں پیاری سعدیہ تو قارئین کو اس قدر عزت و احترام دینا یقیناً آپ کے اعلا ظرف ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔
اور اگر "شعاع" کی بات کروں تو دسمبر کے شمارے کی ٹائیٹل گرل اداس آنکھوں اور لبوں پر مسکراہٹ لیے براجمان تھی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ افسانوں میں "چپ" اچھا لگا۔
"والعصر" از دا بیسٹ "شہر شام ہجر" موسٹ فیورٹ، غزل افتخار احمد کی بہت متاثر کن "مسکراہٹیں" پڑھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرائے۔ "خوب صورت بنیے" (کوشش تو کر رہے ہیں)۔ "باتوں سے خوشبو آئے" (بہت آتی ہے بھئی خوشبو بھی۔)
ج: بہت شکریہ سعدیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے آمین۔ بہت خوشی ہوئی آپ کا خط پڑھ کر۔ اچھی بات کی قدر کرنے اور اس سے سبق سیکھنے کے لیے بھی اعلا ظرفی کی اور نیک دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آپ کی نیک دلی ہے کہ آپ شعاع سے سیکھتی ہیں اور اچھی بات کا اثر قبول کرتی ہیں۔
فہمیدہ جاوید نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
میرا تنقیدی سا خط پڑھ کر تم نے سمجھا اور لگایا مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یقین کرو مجھے شرمندگی سی بھی ہوئی کہ میں کچھ زیادہ ہی کہہ گئی مگر تمہارا ظرف کہ پڑھا، خواہش کا احترام کیا۔ بہت خوشی ہوئی تم نے اطمینان بخش جواب دیا کہ دراصل میرا بہت پرانا ساتھ ہے اور پھر شعاع و خواتین سے اتنی یادیں وابستہ ہیں۔ نگہت میری پسندیدہ ترین ہیں اور مجھے سب پرانی یادیں شعاع و خواتین کی یاد ہیں۔ شعاع کا سرورق تمام ڈائجسٹوں میں سب سے زیادہ پسند آیا، نبی کی باتیں تو ہر بار ہی اچھی اور اصلاحی ہوتی ہیں اور اللہ تم لوگوں کو جزا دے جو اس سلسلے کی صورت میں اصلاح کو عام کر رہے ہو۔
سروے کے سوالات و جوابات دونوں ہی بہت دلچسپ تھے خاص کر ان میں قارئین نے ریسپی بھی بیان کر دیں اور اپنی تمام گزرے سال کی اہم یادیں، کھانوں پر بھی مزیداری باتیں ہوئیں بہت خوب، وہیں ۔نادیہ احمد سے ملاقات بھی اچھی رہی ہاں اکتوبر 2017 کے شعاع (جس میں ماڈل نے محرم کی وجہ سے سر پر دوپٹا پہنا ہوا تھا) میں نے نگہت کا شعاع میں ایک ناول پڑھا تھا۔ "یہ جو ریگ دشت فراق ہے۔" اتنا پسند آیا تھا کہ ابھی تک یاد ہے۔ نگہت کی کہانیوں میں جذبات اور خونی رشتوں کی محبت اپنا پن بہت اچھا لگتا ہے۔ نگہت خود درس و تدریس سے وابستہ ہیں تو بہت عمدگی سے تعلیمی سلسلے پر بات کرتی ہیں۔ نگہت سے کہیں کہ خواتین یا شعاع کے لیے قسط وار ناول لکھیں اور ہماری شاہین کو انٹرویو بھی دیں۔ افسانے چاروں ہی اچھے تھے۔ حمیرا شفیع کی "آنٹی پرابلم" ہر جگہ موجود، خیر شازیہ نے اچھا لکھا۔ مہوش نذیر کی "سالگرہ" تو شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت ہی اصلاحی رہا۔ سونیا ربانی کی "دیتو موچی کی سامرہ" تحریر میں کافی روانی تھی اور انداز بھی بہت منفرد تھا جس کی بنا پر افسانہ پسند آیا خاص کر سامرہ کی سوچی ہوئی آخری لائن تو بہت ہی پسند آئی جو بہت

گہری تھی کہ اسی محبت کے لیے سب چھوڑنا پڑ رہا ہے جس کے لیے کبھی محبت کا دروازہ بند کیا تھا۔ زینب نور کہاں ہیں بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں اب جلدی زینب نور کہانی لکھ ڈالو اگلی بھی۔ ام ہانی کی طویل تحریر "جو ایک سکھ نے آزاد کیا" میں اریب اور حرم کی کہانی بہت پسند آئی اس کی خالہ کو آخر میں عقل تو آئی۔

"والعصر" بہت ہی پراسراری ہے اب اگلے ماہ پورا 26 قسطوں کا تفصیل سے خلاصہ دیں کہ ہر ماہ بھول سی جاتی ہوں۔ فرح بخاری کا ناول "شام شہر ہجر" اپنے نام کی طرح اچھا چل رہا ہے، وسیلہ کے ساتھ ہمیں مومن اور منصب کے کردار پسند ہیں اور شہناز اور ارحم تو کسی ناگہانی حادثے میں ہی کاش مرجائیں کہ زہر لگتے ہیں۔ تحریم کی غیر موجودگی یعنی مرنا اب بھی دکھی سا کر دیتا ہے جب کہ کافی وقت ہوگیا۔ زرا ابحرا کا ناولٹ "دہر میں ڈوبی شام" کا عنوان بھی مجھے بہت پسند آیا ویسے کہانی میں چاشنی بھی تھی۔

سحرش مصطفیٰ کا ناول "اولڈ لعل ہاؤس" میں شروع میں زین اور زونی کی خوش گوار بیت اچھی رہی۔ اس سے اچھا وہ زندہ رہ جاتا۔ کہانی بہت منفرد سی تھی اور یہ شاید نئی مصنفہ ہے مگر پہلی بار بہت اچھا لکھا۔ عروج عباس کی نظم زیادہ اچھی تھی کہ مجھے غزل سے زیادہ نظمیں پسند ہیں۔

ج۔ پیاری فہمیدہ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ ہم نے شاہین کو نگہت سیما کا نمبر دے دیا ہے۔ اب اس ماہ یا آئندہ ماہ ان کا انٹرویو پڑھ سکیں گی۔

تنقید کرتے ہوئے آپ یہ بالکل نہ سوچیں کہ ہمیں برا لگے گا پیاری بہن یہ سلسلہ ہم نے آپ کی رائے جاننے کے لیے ہی شروع کیا ہے۔ آپ بے لاگ تبصرہ کریں تاکہ ہم آپ کی رائے کی روشنی میں پرچے کو مزید بہتر کرسکیں۔

ایچ ایس ایچ نے تحصیل سمبڑیال سے لکھا ہے

ایک تو طبیعت پہلے ہی ناساز تھی، دوسرا خط نہ پاکر اور رنجیدہ ہوگئے، بات ہوجائے دسمبر اور جنوری کی تو یہ دونوں مہینے مجھے شاعری خوب صورت یادوں دلکش شاموں کے حوالے سے پسند ہیں لیکن سردی ہم پہ بہت اثر انداز ہوتی ہے گرمیوں کے موسم میں اگر تھوڑا سا موسم سرد ہوجائے تو ہم متاثر ہوجاتے ہیں یہ تو پھر ٹھٹھرتی ہوئی یخ بستہ دھند میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں اگر اپنی بات کروں تو مجھے خزاں اور بہار زیادہ پسند ہیں خیر موسموں کی طرح یہاں لہجے بھی ہر طرح کا موسم اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں، خط کی محفل میں کائنات لیاقت کے دو خط شائع ہوئے تھے ایک صفحہ نمبر 203 پہ اور ایک 206 پہ، یہ دونوں خط ایک ہی ذات کے ہیں ہے نا؟ مقام حیرت ہے ہمارے لیے ویل۔ انیسہ عائش آپ کا نام ہمیں بہت پسند آیا منفرد سا نام ہے بہت خوب صورت۔ اگر بات کروں اپنے نام کی تو ہمیں اپنے اس نام سے اس قدر انسیت ہوگئی ہے کہ کوئی اور نام ساتھ جوڑ نہیں سکتے ویسے شادی کے بعد سوچا جاسکتا ہے۔ آپ کا مشورہ اتنا برا بھی نہیں، افسانے اس ماہ بھی تھوڑے سے ٹھیک تھے، زارا ابحرا کی تحریر میں ہمیں بہت کچھ مسنگ لگا تحریر مزید بہتر ہوسکتی تھی بہرحال اچھی کاوش تھی سحرش مصطفیٰ کا (لعل اولڈ ہاؤس) بہت افسردہ کر گیا ویلڈن، ام ہانی کی تحریر بھی اچھی تھی، فرح جی کا ناول لگتا ہے اختتام کے قریب ہے، بہت اچھا جارہا ہے، نئے سال کی دہلیز۔ تمام بہنوں کے جواب مزہ دے گئے۔ سونیا جی ماشاء اللہ صحت کی بحالی کی مبارکباد آمین، رضوانہ وقاص اللہ آپ کو بھی کامل شفا عطا فرمائے آمین۔ باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج۔ آپ کا خط پچھلے ماہ شامل نہ ہوسکا۔ اس کے لیے معذرت۔ کائنات لیاقت کا خط پچھلے ماہ دوبارہ اس لیے شائع ہوا کہ پہلا خط انہوں نے دسمبر کے شمارے کے لیے لکھا تھا۔ وہ شائع ہونے سے رہ گیا تھا۔ جنوری کے شمارے کے لیے موصول ہونے والا خط ہم نے تبصرے کے لیے شامل کیا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

عائشہ انتظار نے سرگودھا سے لکھا ہے

سردی کافی بڑھ گئی ہے۔ دس دن سے زیادہ

pklibrary.com

ہو گئے ہیں۔ ابھی تک سورج اپنا سنہری مکھڑا دھند اور اسموگ سے چھپائے بیٹھا ہے۔ ہر وقت آگ سلگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لائٹ کی بھی آنکھ مچولی چلتی رہتی ہے۔

رسالے پر تو میں تبصرہ نہیں کر سکتی کہ ہمارے علاقہ میں اب تک پہنچا ہی نہیں۔ ہاں مگر۔

سلسلے وار ناول شہر، شام، ہجر زبردست جا رہا ہے۔ حویلی والے قسط وار ناول کی پہلی قسط بھی کافی اچھی لگی تھی۔ آفرین اور زمل والی، پچھلے ماہ بھی رسالہ نہ پڑھ پائی تھی شادی کی مصروفیت کی وجہ سے۔ بس مومن والے ناول کی قسط آن لائن پڑھی تھی۔ مستقل سلسلے بھی پڑھے تھے۔

اب آپ میری تحریروں کے بارے میں بتا دیں۔ قابل اشاعت ہیں بھی یا نہیں؟ جو غلطیاں ہیں وہ بتا دیں تاکہ میں آئندہ احتیاط کروں۔

ج۔ پیاری عائشہ! بلاشبہ آپ میں صلاحیت ہے۔ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ آپ کی کہانی ''میں اپنی ذات میں گمشدہ'' پڑھ لی ہے لیکن اس کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ بہت طویل ہے اور ہم اسے ایک قسط میں شائع نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں جو سلسلہ وار ناول چل رہے ہیں۔ یہ ختم ہو جائیں تو اس کی باری آ سکتی ہے۔

آپ نے جو فون نمبرز لکھے تھے ہم نے اس پر کال کی لیکن بات نہ ہو سکی۔ آپ اب خط لکھیں تو اپنا فون نمبر بھی لکھیں۔ ہم آپ سے کہانی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔

رخ فاطمہ نے کراچی سے لکھا ہے

دسمبر کا شمارہ اچھا تھا ماڈل گرل ویسے تو پیاری تھی بس ٹائٹل دیکھ کر بہار کا گمان ہو رہا تھا کہیں سے بھی دسمبر والی فیلنگ نہیں آئی اور رضوانہ وقاص آپ نے خیریت پوچھی، مجھے بہت اچھا لگا میری ایک بیٹی ہے ایک سال کی۔ لیکن ان ظالموں نے وہ بھی مجھ سے چھین لی۔ دعا کریں میں اپنی بیٹی اپنے پاس لے آؤں اور اللہ آپ کے بیٹے کو صحت سے نوازے۔ (آمین) اس کی صحت کا ضرور بتانا ہے آپ نے۔

اور اب آتے ہیں جنوری کے شمارے کی طرف تو سال نو کے حوالے سے ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی مجھے افسوس ہے میں سروے میں شامل نہیں ہو سکی۔ لیکن سب بہنوں کے تبصرے پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ مونگ پھلی اور ساگ تو کوئی سردی میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ اور میں حیران ہوں سب اتنے مزے سے کیسے پکا رہے ہیں۔ ہمیں تو ہفتہ ہو گیا گیس کی شکل دیکھے ہوئے۔ لکڑیوں پہ ہی گزارہ ہو رہا ہے۔ گھر چھوٹا ہے تو پورا گھر دھوئیں سے بھر جاتا ہے۔

اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے شام ہجر پڑھا جو اپنے آخری مراحل میں ہے۔ شکر ہے کہ وسیلہ کی یادداشت واپس آئی۔ ماہ الملوک میں اختر بانو کا حال پڑھ کر مجھے اپنا سال پرانا ماضی یاد آ گیا (خیر بھولتا ہی کب ہے) جیسے میری بچی کو میری نندوں نے مجھ سے دور رکھا میرے ہاتھوں میں ہی نہیں دیتی تھیں۔ میں زبردستی لیتی تھی تو مجھے کام میں لگا کے مجھ سے لے لیتی تھیں اور میں بے وقوف تھی ان کی چالاکیاں نہیں سمجھ پائی تھی۔ مجھے لگ رہا ہے، مجھے بھی مجھ سے ناتا جوڑا کے سلسلے کے جوابات دینے چاہئیں) تاکہ دل ہلکا ہو جائے میرا۔ اور ام ہانی کا جواک سکھ نے آزاد کیا اچھی تحریر لگی۔ اولڈ لٹل ہاؤس نام دیکھ کے مجھے لگا کوئی ہلکی پھلکی مزاحیہ اسٹوری ہو گی لیکن اندر سے اتنی ہی سیریس نکلی ہیروئن نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ جو گھر میں پانچویں فرد کا اضافہ کر دیا۔ پھر اس ماہ کا ناولٹ ''کہر میں ڈوبی شام'' بھی اچھی تھی لیکن ایسی کہانی پہلے بھی شمارہ میں شامل ہو چکی ہے۔ لیکن اس کہانی کا اینڈ پہلے والی کہانی سے مختلف تھا۔

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف چاروں افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے اس دفعہ سمجھ میں نہیں آیا کس کو نمبر ون کہوں اس لیے سب نمبر ون تھے سب میں سبق پوشیدہ تھا۔

پیاری رخ! آپ ناتا جوڑا ہے کے سلسلے میں ضرور لکھیں۔ یہ سلسلہ آپ جیسی بہنوں کے لیے ہی

شروع کیا گیا ہے۔ آپ کے سسرال والوں نے آپ کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا، کسی ماں سے اس کی بیٹی چھین لینا اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور ان کے دل کو درد آشنا کرے کہ وہ ایک ماں کا درد سمجھ سکیں۔

آپ کی کہانی ہم نے پڑھ لی ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ لکھ سکتی ہیں۔ لکھنا جاری رکھیں۔

تسنیم کوثر..... ایف بی ایریا کراچی

ماشاء اللہ اس بار بھی پیارے پیارے سے افسانے اور ناولٹ شاندار رہے۔ مزا تو حمیرا شفیع کے دلچسپ افسانے سال نو اور آنٹی پرابلم نے خوب مزا دیا۔

اور بھئی سونیا ربانی کی دینو موچی کی سامرہ بے شک وہ بہترین لکھتی ہیں مگر اس کہانی نے کوئی خاص متاثر نہیں کیا۔ اسی طرح شازیہ الطاف کا ''ترس'' بھی بس مناسب ہی رہا۔ ناولٹ میں زارا انجر اکا کہر میں ڈوبی شام اچھا لگا۔ تو اسی طرح جواک سکھ نے آزاد کیا ام ہانی کا یہ ناول بھی اچھا رہا۔ اور جناب محبت سیما کا خوب صورت ناول ماء الملوک کی تو کیا بات ہے۔ بہترین کہانی مگر تھوڑی مشکل ہے لیکن پھر بھی بے حد اچھی لگ رہی ہے۔

سب سے ٹمبرون تو فرح بخاری جا رہی ہیں ان کا دلکش ناول شام شہر ہجر تو مسحور کر رہا ہے اور ہاں ایک پیارے سے افسانے کی تعریف کیسے بنا نہیں رہ سکتے مہوش نذیر کی پیاری سی سانگرہ بہترین لگی۔ اور نئے سال کا خوب صورت سروے شعاع کی شان بڑھا گیا سب نے بہت خوب لکھا۔ سونیا ربانی کا مختصر سا احوال اچھا لگا تو صدف ناصر بھی کسی سے کم نہیں رہیں۔ رضوانہ وقاص نے اچھا لکھا دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں صحت وزندگی عطا فرمائے اور عینا عمران نے تو بہت مزے کا لکھا۔

پیاری تسنیم! آپ ہماری ایسی مستقل قاری ہیں جو ہر ماہ تبصرہ کر کے اپنی رائے سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔ اب تو ہم آپ کے تبصرے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ کسی ماہ آپ خط نہ لکھ پائیں یا تاخیر سے موصول ہو تو ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔ بہت شکریہ۔ آپ کا خط ہمارے حوصلے بڑھا دیتا ہے۔

صدف ناصر..... گوجرانوالہ

جنوری 2024ء کا شعاع دل خوش کر گیا۔ کیونکہ ٹائٹل بے حد پیارا ہے۔ ''حمد'' اور ''نعت'' زبردست ماشاء اللہ۔ ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں'' پڑھ کر۔

''نانا جوڑا'' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس قدر جہالت اور مظالم! قابل تقلید ان بہن کا صبر، نماز قرآن کی پابندی رہی۔ جس کی وجہ سے ان کو بہترین صلہ ملا۔ ''نادیہ احمد'' سے ملاقات پسند آئی۔ ان کا ڈرامہ ''تیری راہ میں'' اچھا لگا تھا۔ ''نئے سال کی دلہیز'' پر بے حد اچھا اور دلچسپ رہا۔ ''گوجرانوالہ'' سے ''فرحت ہاشمی'' کی شرکت نے خوشی دی۔ ''رضوانہ وقاص'' کی صحت کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہیں۔ ''والعصر'' کی طرف آئے تو ''ورنی'' بالکل ٹھیک آفت کا شکار ہے۔ یہی بہتر تھا محترمہ کے لیے۔

''ماء الملوک'' سے ملے تو ''زمل'' بالکل اپنی طرح لگی۔ پریشان اور ہمدرد ''اختر بانو'' کی واپسی نے آبدیدہ کر دیا۔

''شہر شام ہجر'' ہنڈرڈ کی اسپیڈ سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اور تحریر کا مزا بھی ایسے ہی آتا ہے۔ (سیدھی اور تیز)

''جواک سکھ نے آزاد کیا۔ ام ہانی نے مثبت پیغام دیا۔

''طفل اولڈ ہاؤس'' نے ڈپریشن کی انتہا کر ڈالی۔ بلاشبہ ''سحرش مصطفیٰ'' کے قلم میں روانی اور پختگی رہی مگر معذرت تحریر نے کسی بھی موڑ پر کوئی خوشی کی خبر نہیں سنائی۔ ''ناولٹ'' کہر میں ڈوبی شام ''زارا ہنجرا'' کی ایک اور زبردست سی تحریر۔ افسانوی دنیا چھوٹی چھوٹی محسوس ہوئی۔ (چار افسانے) مگر دو ناولوں نے کسر پوری کی۔ ''سال نو اور آنٹی پرابلم'' نے نئے سال کا لطف دوبالا کر دیا۔ ''ترس'' شازیہ الطاف کا پہلے سے

pklibrary.com

الگ افسانہ، اچھا لگا۔ ''دینو موچی کی سامرہ'' نے دل خوش کیا۔ کیونکہ ''سامرہ'' بہت سمجھ دار رہی۔ ''سالگرہ'' لکھ کر ''مہوش نذیر'' نے اس ماہ تمام افسانوں پر سبقت حاصل کرلی۔ زبردست!

''مسکراہٹیں'' بہت شارٹ شارٹ دکھائی دیں۔ مگر سب ہی نے خوب ہنسایا۔ خاص طور پر ''بھول'' اور ''دور اندیش'' نے ''باتوں سے خوشبو'' کا ایک ایک لفظ اثر انگیز رہا۔ ''کھلتا کسی پہ کیوں'' نادیہ یاسر، صدف خان اور ندا یوسف کے انتخاب نے بہت خوش کیا۔ ''خط آپ کے'' کے کیا کہنے۔ پورا ڈائجسٹ اس سلسلے پر ہو تو بھی کوئی بور ہو۔ (ہاہاہا) ''ریحانہ چوہدری'' کی واپسی اچھی لگی۔ سبھی تبصرے اور خطوط بے حد جاندار رہے۔ ''تاریخ کے جھروکوں سے'' ''محترم ''عضد الدولہ'' نے محبت اور مصلحت کی کشمکش کی انتہا ہی کردی۔ مجموعی طور پر ماہ جنوری کا شعاع 99.8 فیصد رہا۔ آپ کی کاوشوں کو تہہ دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

ج۔ پیاری صدف! آپ کی محبتوں کے لیے ممنون اور ہیں۔ سچ ہے کہ آپ جیسی قارئین کسی بھی پرچے کے لیے باعث افتخار ہوسکتی ہیں۔ ہر ماہ پرچا پڑھنا اور پھر بڑی باقاعدگی سے اتنا مفصل تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو سحرش مصطفیٰ کی تحریر نے اداس کردیا۔ ہم بھی یہ تحریر پڑھ کر اداس ہوگئے تھے۔ کافی دن اس تذبذب میں رہے کہ اس تحریر کو شائع کریں یا نہ کریں لیکن پھر ہماری ساتھی ایڈیٹران نے کہا کہ کبھی کبھی زندگی کا یہ پہلو بھی دکھانا چاہیے۔ زندگی شیریں ہی نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ تلخ حقیقتیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر مصنف نے لکھا بھی بڑا اچھا تھا۔ اس لیے ہم نے جگہ دی۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ آپ کو اداس کرنے والی تحریریں شامل نہ کریں۔

عالیہ ملک نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہم اپنے پیارے رسالوں کے اس وقت سے فین ہیں جب یہ صحت مند ہوتے تھے، اب تو ہم ان کی صحت کے بارے میں بہت ہی متفکر رہتے ہیں۔ ماں باپ کی تربیت کے بعد ہم کو سنوارنے بنانے میں زیادہ حصہ ان رسالوں کا ہے۔ سیکھنے کا یہ عمل تب تک جاری رہے گا جب تک یہ سانس چلے گی ہمارے گھر میں ماں باپ نے کبھی منع نہیں کیا ان کو پڑھنے سے، بڑے بھائی ڈانٹتے تھے مگر ہم کون سا باز آنے والے تھے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر پڑھنا جب بھائی آتے نظر آتے رسالے غائب کردیتے ہم بھی ان کی خفیہ جگہ سے چوری چوری پڑھ لیتے۔ ہمارے امی ابو بھی پڑھتے تھے عمران سیریز یا کوئی ناول رسالے وغیرہ۔

ہمارے بھائی کی لائبریری تھی دوسرے شہر میں جب بھی کوئی وہاں جاتا رسالے ناول لے کے آتا۔

باقاعدہ رسالہ شعاع پڑھنا شروع تب کیا جب ہماری بھابھی آئیں۔ وہ منگواتی تھیں تو ہم بھی پڑھ لیتے ہم بھابھی کو بھی شکریہ کہنا چاہتے ہیں۔

اب ہم خود شعاع منگواتے ہیں باقاعدہ، ہمارے شوہر اچھے ہیں لادیتے ہیں آج بھی کوئی پرانے ملنے والے ملیں تو رسالا دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ۔

''ابھی بھی پڑھتی؟ تو میرا جواب یہی ہوتا ہے۔

''واحد شوق ہی یہ ہے جو قائم ہے ورنہ تو الف سے یے تک بدل گئے ہم۔''

سسرال کے اچھے برے سلوک بھی سہے مگر ان رسالوں نے حوصلہ قائم رکھا، یہ ہی جینے کا سبب بنا تھا۔ شکر ہے ہر تنقید کے باوجود سسرال نے کبھی میرے رسالے پڑھنے پر اعتراض نہیں کیا، اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ کبھی شوہر نے بھی منع نہیں کیا وہ بھی کبھی ورق گردانی کرلیتے ہیں۔ باتوں سے خوشبو یا پیاری باتیں پڑھ لیتے ہیں۔ ہم نے تو اپنے دل کا حال یا خاموشی ہی توڑی ہے اتنے سالوں کی، ورنہ رسالوں کی تعریف کیا کریں سورج کو چراغ ہی دکھانے کی بات ہے۔ ہم تو پہلے صفحے سے لے کر آخری تک پڑھتے ہیں۔

ہمارے پڑھنے کے شوق نے کیا کچھ نہ دکھایا ہم کو ایک دفعہ دیوار میں ایک اخبار کا ورق سوراخ میں دبا دیکھا تو نکالنے لگے، وہاں بھڑوں کا چھتہ تھا۔ وہ ساری میرے پیچھے پڑگئیں، ہم سارے صحن میں بھاگتے پھرے مت پوچھیں کیا حال کیا ہمارا۔ آج بھی یاد آئے

تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم خط تو شعاع کو لکھ رہے ہیں مگر خواتین کرن سب کی تعریف ہی اس خط میں کریں گے کیونکہ کسی بھی ادارے میں یہ ہمارا پہلا اور آخری خط ہے یہ تو میں اپنے شوہر سے پوچھ کر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اس خط کے ذریعے اگر میری بات آپ کو کلک کرے تو کسی مصنفہ سے اس بارے میں کوئی افسانہ کہانی ضرور لکھوائے گا۔ بات یہ ہے کہ جو مائیں اپنی بچیوں کو ٹائٹس سلیو لیس شارٹس وغیرہ پہناتی ہیں وہ اپنی بچیوں کو بہت خطرے میں ڈالتی ہیں ان کے ساتھ ظلم کرتی ہیں فیشن کے نام پر۔ دکان دار یا راہ گیروں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ خدارا یہ ظلم نہ کریں ان کو مکمل ڈھانپ کر رکھیں۔

دوسری بات ان سب لڑکیوں کے لیے جن کی شادی ابھی نہیں ہوئی جب بھی ان کی شادی ہو تو یہ ذہن بنا کر جائیں کہ میں سسرال جا رہی ہوں۔ وہ جیسا بھی برتاؤ کریں ان کے عمل ان کے ساتھ، آپ خود ایمانداری سے ہر رشتہ نبھائیں گی۔ اللہ ان کو صلہ ضرور دے گا۔ ان شاء اللہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ خدا نے میری چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی رائیگاں نہیں کی۔ جیسی نیت ویسا ہی صلہ۔

ج۔ پیاری عالیہ...... !آپ کا خط لیٹ موصول ہوا جس کے باعث ہم پچھلے شمارے میں شامل نہ کر سکے آپ کی دونوں کی باتیں بہت پیاری اور قیمتی ہیں۔ آج کل کے ماحول میں لڑکا ہو یا لڑکی بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بچیوں کو بچپن سے ہی دوپٹا اوڑھنے اور پورے کپڑے پہننے کی عادت ڈالی جائے تو ان کے مزاج اور طبیعت میں راسخ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح گھر کے ماحول میں خوش گواری کے لیے بہت سی باتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ ذرا سی برداشت اور سمجھ داری سے گھر میں لڑائی جھگڑوں سے بچا جا سکتا ہے۔

شعاع سے محبت اور پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں اور آپ کے شوہر کا بھی شکریہ کہ وہ آپ کو پرچے لا کر دیتے ہیں انہوں آپ کا خط پوسٹ کیا۔ ہم آپ کی رائے جان پائے۔

کوشش کریں کہ ہر ماہ نہیں تو دو چار ماہ بعد ہی سہی ہمیں خط ضرور لکھیں۔ اگر آپ کو ای میل کی سہولت ہو تو خط ای میل بھی کر سکتی ہیں۔

عروج عباس نے کراچی سے لکھا ہے

ڈائجسٹوں اور رسائل سے ساتھ پرانا ہے۔ اکثر خاندان والے اور خاص طور پر میرے بھائی تنقید کرتے کہ یہ ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر آخر ملتا ہی کیا ہے، ہر ماہ آدھی درجن ڈائجسٹ خریدنے سے اچھا ہے کوئی چیز لے کے کھا لیا کرو اتنی کمزور ہو، اور والدین آنکھیں خراب ہو جائیں گی نہیں پڑھا کرو اتنا وغیرہ وغیرہ۔

سال نو کا شعاع دلہن کے سراپے سے جگمگاتا ملا۔ فرح بخاری صاحبہ نے ''شام شہر ہجر'' لکھ کر محفل لوٹ لی ہے بھئی، منصب اور وسیلہ کا کردار مجھے بہت پسند ہے۔

''ماء الملوک'' کے ساتھ بھی مصنفہ نگہت سیما خوب انصاف کر رہی ہیں اور ایک یادرہ جانے والا ناول لے کے آئی ہیں۔ پلیز زحل اور آزین کو جدا مت کیجیے گا، آخر تک ان کا ساتھ مضبوط ہی رہے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا میں یقین ہی نہیں آیا کہ ایسی جہالت بھی ہمارے معاشرے میں کہ ساس تندیں، تشدد کی حد تک چلی گئیں اور شوہر بھی اس معاملے میں اتنے کمزور کہ اسٹینڈ ہی نہ لے سکے بیوی کے لیے، لیکن الف۔ س کی حوصلہ واستقامت قابل دید ہے۔

زارا ہنجرا کا ''گھر میں ڈوبی شام'' کا بھی اچھا سویرا ہوا۔

پیاری عروج! آپ سروے میں ہی نہیں شعاع کے سب سلسلوں میں شرکت کریں۔ ہمیں خوشی ہوئی۔ شعاع کا اگلا سروے اگست میں ہوگا۔ جبکہ خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہے۔ اپریل کے شمارے میں قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا آپ اس میں شرکت کر سکتی ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

☆☆

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

رتیں بدلتی رہتی ہیں۔ موسم آتے جاتے رہتے ہیں
زندگی بھی اسی طرح کئی موڑ لیتی ہے۔ کبھی گرم، کبھی سرد، کبھی خزاں اور کبھی بہار...... وقت گزر جاتا ہے لیکن ہماری زندگی پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ خوش گوار لمحات، کچھ تلخ یادیں، کچھ آنسو، کچھ مسکراہٹیں۔ یہ سب زندگی کے رنگ ہیں، ان ہی سے زندگی تشکیل پاتی ہے۔
حسب روایات نئے سال کے آغاز پر ہم نے پرچے میں اپنی قارئین کی شمولیت کے لیے سروے کیا ہے۔

سوالات یہ ہیں۔
1۔ گیا سال آپ کو کیا دے گیا۔ کوئی خوشی، کوئی دکھ، کوئی پچھتاوا یا آگہی کا کوئی لمحہ۔
2۔ پچھلے سال کتنی تقریبات اٹینڈ کیں، کسی تقریب کا کوئی یادگار واقعہ لکھیں
3۔ موسم سرما میں کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آپ کے گھر میں موسم سرما میں کون سی ڈش یا حلوہ جات خاص طور پر بنائے جاتے ہیں؟
آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

ریحانہ وقاص......لاہور

جوں جوں عمر بڑھتی ہے دکھ بھی شاید بڑھتے جاتے ہیں۔ بچپن میں پوزیشن آگے پیچھے ہونے کا دکھ، دوستوں سے لڑائیاں، پاکٹ منی گم ہو جانا، دہی بھلے والے کا ریڑھی نہ لگانا، ماں کا پسندیدہ کھانا نہ بنانے کا دکھ بڑے بڑے لگا کرتے تھے لیکن اب جب اصل دکھ ملے تو پتا چلا اصل غم کیا ہوتے ہیں۔

والد کے جانے کا صدمہ، ان کے آخری دن، آخری وقت سب آنکھوں کے سامنے تھم گیا ہے، شادی کی تاریخ فکس ہو گئی تھی ان کو میرے جانے کا غم ہونے لگا تو وہ اپنا دکھ مجھے دے گئے۔ میں وہیں رہ گئی اور وہ اگلے جہاں سدھار گئے۔

اب تو دل اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ اونچا بھی کوئی بولے تو کسی انہونی کے ڈر سے ڈر جاتا ہے۔

سال 2022 میں ایسے ہی اچانک کاپی پین اٹھایا اور پہلا خط شعاع کو لکھا۔ جو فوراً چھپ گیا، پھر مسلسل خط لکھتی رہی وہاں سے حوصلہ افزائی ہوئی کہ کہ آپ لکھ سکتی ہیں افسانہ لکھا جو چھپ گیا۔ پھر خواتین میں بھی دو تین افسانے چھپ گئے۔ خود آشنائی کا موقع ملا۔ میں نے بہت پڑھا ہے۔ شاید اس لیے تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں، پہلے اپنے آپ سے کہتی تھی کہ جب میں پانچ افسانے لکھ لوں گی اور جو شائع بھی ہو جائیں گے تو میں کتنا خوش ہوں گی لیکن اب میرے اس سے زیادہ شائع ہو چکے ہیں۔

کوئی قاری بہن اگر ہماری تعریف کر دیتی ہے تو ہم کئی دن ان کی لائنوں کو بار بار پڑھتے رہتے ہیں۔ جیسے اس ماہ صائمہ گل نے مردان سے ہمارا سیروں خون بڑھا دیا اور ہم نے ڈھیروں ڈھیر ان کو دعائیں دے ڈالیں۔ ان کے الفاظوں نے میرے لکھنے کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ بہت بہت شکریہ صائمہ بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نا گوار گزرتی ہیں

یعنی وقت ان پر دھول اڑاتا آگے گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر بننے کا خواب جو پورا نہیں ہوا۔ اپنی اولاد کو بنتا دیکھنا چاہتی ہوں۔

2۔ میرے شوہر کی ایک کلاس فیلو تھی "فرح" جس کا نام مجھے آج بھی یاد ہے۔ کافی امیر ہوا کرتی تھی۔ وقت گزرا، ماں کی ڈیتھ ہوگئی، باپ نے دوسری شادی کرلی، بھائی دبئی جا کر بیٹھ گیا بہن کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ عجیب سی اسے بیماری ہوگئی سارے جسم پر کالے کالے نشان بن گئے اور سارا جسم سوج گیا۔

ایک دن وہ اچانک ہمارے گھر آگئی میں ایک انجان عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"میں فرح ہوں، آپ کے شوہر کے ساتھ اس کی جماعت میں پڑھتی تھی، اسی محلے میں رہتی ہوں، بڑی مجبوری میں آئی ہوں۔ مجھے تھوڑی مدد چاہیے۔ میں بیمار ہوں میں نے کچھ ٹیسٹ کروانے ہیں مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔"

"لیکن میں آپ کو جانتی نہیں۔" میں اس کے نان اسٹاپ بولنے پر بولی۔

"آپ فون کر کے اپنے شوہر سے کنفرم کرسکتی ہیں۔ میں کوئی بھکاری نہیں، صرف ضرورت مند ہوں۔ اگر آپ اندر آنے کے لیے کہیں تو میں آپ کو اپنی ٹانگیں دکھا سکتی ہوں کتنی نیلی اور سوجی ہوئی ہیں۔ بس ایک بار مدد کردیں۔"

میں نے کچھ پیسے دے کر دروازہ بند کر دیا میرے پاس اس کی باتیں سننے کے لیے وقت نہیں تھا اس دن رات کو میں نے اپنے میاں سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ واقعی ضرورت مند ہے۔ بس وقت اور بیماریوں نے اس کا برا حال کردیا ہے۔

اگلے ہفتے وہ پھر میرے دروازے پر موجود تھی "پلیز باجی آخری بار مدد کردیں آئندہ نہیں آؤں گی۔" اب میں نے اسے اپنے میاں کے دفتر کا پتا دے دیا کہ وہ تمہاری اچھی مدد کردیں گے۔ اور انہوں نے اس کی مدد کر بھی دی۔

پندرہ دن بعد تقریباً اتوار والے دن میاں بازار سے سامان لے کر آئے اور مجھے بتایا کہ فرح کی کل ڈیتھ ہوگئی ہے۔ میں وہیں سکتے میں آگئی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ باجی اب کی بار مدد کردیں آئندہ آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ تقریباً دو تین سال ہوگئے ہیں اس بات کو لیکن وہ بھولتی نہیں۔ شکر اس بات کا کرتی ہوں کہ میں نے اسے خالی نہیں لوٹایا۔ اب ایسی ہی عادت بن گئی ہے کہ کوئی سوال ڈال دے تو میرے پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ مدد کردوں۔

3۔ ہمارا میکہ ملتان اور سسرال لاہور ہے۔ سال میں بچوں کی چھٹیاں ہونے پر دو بار چکر لگتا ہے۔ اپنی گاڑی پر آتے اور جاتے ہیں اس لیے کبھی کچھ خاص واقعہ نہیں ہوا۔

ہاں میری بہن ٹرین پر سفر کرتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ بہت واقعات ہوتے ہیں پچھلی بار انہوں نے وی آئی پی ڈبہ بک کروایا جب گاڑی چل پڑی تو ایک شخص بریانی کے ڈبے لے آیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ایک پکڑا دیے۔

یہ سب سمجھے کہ شاید وی آئی پی ڈبے میں بریانی بھی ملتی ہے، مفت میں حالانکہ اتنی مزے کی بھی نہیں لیکن مال مفت اور دل بے رحم تھا اس لیے مزے سے کھالی۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب آ گئے۔ پیسے لینے اب یہ سب ایک دوسرے کا منہ تکیں پانچ سو کا ایک ڈبا اور یہ چھ لوگ غصہ تو ان لوگوں کو بڑا آیا۔ جب انہوں نے کہا۔

"آپ نے بتایا کیوں نہیں۔"

تو اس نے کہا آپ نے پوچھا ہی نہیں۔ ناچار ان لوگوں کو تین ہزار روپے دینے پڑے۔

حالانکہ یہ لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لائے تھے اس طرح ان کا یہ سفر یادگار گزرا۔

جویریہ فیصل.....دریا خان

یہ سال بھی اپنی تیز رفتار سے بہت سی خوشیاں اور بہت سے دکھ دے کر گزر رہی گیا۔ میں سوچتی ہوں ابھی تو میں نے مڈل پاس کیا تھا۔ ابھی تو کالج ختم ہوا اور ابھی تو میں ایک خوب صورت رشتے میں بندھی تھی اور اب نکاح کو بھی دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے نا۔

اب آتے ہیں۔ سوالات کی طرف، سوال انتہائی مزے کے لیکن تھوڑے سے مشکل تھے۔

1۔ یہ سال میرے لیے زندگی میں آنے والے سب سالوں سے زیادہ خوب صورت تھا، کیونکہ میں نے اس سال اپنی اخلاقی برائیوں پر انتہا کا غور کیا۔ یقین کریں، اپنی برائیاں ختم کرنے کی کوشش میں انسان کی پوری جان لگ جاتی ہے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ تکلیف دہ اور محنت والا کام کوئی نہیں۔ سچ پوچھیں تو اس سال میں نے ہزاروں آہوں کے لمحات پائے ہیں۔ لیکن ایک سب پہ بھاری ہے وہ یہ کہ چاہیے آپ کو ہزاروں تکلیفیں ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑیں، عزت پر کسی بھی قیمت پر کمپرومائز نہیں کرنا۔

2۔ پچھلے مہینے میری نند کی شادی کی تقریب تھی۔ اس میں میرے ساتھ ایک خوب صورت واقعہ پیش آیا۔ سب دلہن کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے میرے شوہر کو بھی، اپنی بہن کے ساتھ تصویر بنوانے کے لیے بلایا گیا۔ تو جب وہ اٹھ کر جانے لگے میری بیٹی ماریہ نے انہیں روک کر کہا کہ بھائی ایک تصویر جویریہ کے ساتھ بنوائیں اور پھر مجھے پکڑ کر ان کے ساتھ کھڑا کر دیا اور جلدی سے تصویر بنوا دی، مجھے واقعی نہیں پتا چلا میرے ساتھ ہوا کیا۔ سب اتنی جلدی جلدی ہوا مجھے سوچنے سمجھنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔

اصل میں، میں تصویریں نہیں بنواتی اور یقین کریں، نکاح کے بعد ہم دونوں نے اکٹھی تصویر بنوائی ہی نہیں۔ تو وہ سب میرے لیے عجیب سا پیارا سا احساس تھا۔

3۔ بات وہی ہے، کھانے کو تو دنیا کی جہاں کی چیزیں لا دو کھا جاؤں گی لیکن سردی میں کھانا بنانا اف موت پڑتی ہے مجھے۔ سردی لگتی ہے بھی مجھے۔ ویسے ہمارے گھر ایک ہی قسم کی حلوہ بنتا ہے اور وہ حلوہ ماما بناتی ہیں۔

مزنہ کرن.....گوجرانوالہ

1۔ گئے سال نے سال کے شروع میں ہی ایک بہت بڑی خوشی دی۔ ہمارے گھر ایک ننھی سی پری، اتری ستائیس جنوری کو میرے بھائی کی بیٹی مرحا میری بھتیجی میری چھوٹی سی جان پیدا ہوئی۔ بہت خواہش تھی کہ بھائی کی بیٹی پیدا ہو اور اب وہ ننھی پری ماشاء اللہ سے چلنے لگ گئی ہے۔ دکھ تکلیف تو پھر زندگی کا حصہ ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی دکھ ضرور ہوتا ہے۔

2۔ گئے سال کے اکتوبر میں میرے ماموں کی بیٹی نور کی شادی تھی، کافی عرصے بعد ننھیال میں کوئی شادی آئی تھی۔ سب ہی بہت زیادہ ایکسائیٹڈ تھے۔ مہندی والے دن بہت مزہ آیا سب کزنز نے مل کر ڈانس کیا صبح کے چار بجے تک اور آدھے مہمان ہمارے گھر رکے ہوئے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ شادی ہمارے گھر میں ہے۔ خوب رونق لگی تھی۔ بارات والے دن دولہا کے بھائی کے ساتھ بہت بری ہوئی۔ اس بے چارے کی پاکٹ کاٹ لی کسی نے جس میں آئی فون 11 اور بیس ہزار تھے۔ اور دوسرا برا یہ ہوا کہ ہم نے ولیمہ والے دن، پائے بنائے کہ اگلے دن سب کھائیں گے ناشتے میں لیکن ان کو گرم کرنا بھول گئے اور وہ خراب ہو گئے، پھر کیا سب کو سینڈوچ اور انڈا بریڈ کا ناشتا کرنا پڑا اور پھر دوپہر کو بھائی اور بھابھی نے مل کر نہاری بنائی تو سب نے کھانا کھایا۔ (ہائے ہمارے پائے)

3۔ ہمارے گھر میں موسم سرما میں گاجر کی کھیر، گاجر کا حلوہ، ساگ، انڈوں کا حلوہ اور دالوں کا حلوہ بنا کرتا تھا۔ لیکن اب امی کے بعد کون اتنی محنت کرے۔ اب تو ہم سردیوں میں تو ساگ کو بھی ترس گئے ہیں۔ وہ تو اللہ ہماری چھوٹی مامی جان کو لمبی صحت والی زندگی دے۔ جن کی بدولت ہم ساگ کھا لیتے ہیں۔ وہ جب بھی بناتی ہیں۔ تو ہم سے ضرور شیئر کرتی ہیں۔ ورنہ تو صرف گاجر کا حلوہ ہی نصیب ہوتا ہے۔ وہ بھی اگر بھابھی کا موڈ ہو تو وہ بنا دیتی ہیں۔

سعدیہ مصطفیٰ..... مڑھ بھنگواں

1۔ گیا سال کیا دے کے گیا؟ بہت کچھ، بات اگر خوشیوں کی کروں تو میرے لیے سب سے بڑی کامیابی، سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ میں نے "حجاب" کرنا شروع کر لیا۔ قرآن حفظ ترجمہ و تفسیر کے ساتھ کرنے کا آغاز کر لیا۔ تجوید کے ساتھ مکمل کر لیا ہے الحمدللہ۔

گریجویشن میں ایڈمیشن ہو گیا۔ "آئی کام" میں فرسٹ ڈویژن سے کامیابی ملی۔

"کوئی دکھ" نہیں کوئی نہیں۔ اگر کہوں ہاں تو ہاں بہت ہیں مگر نہیں سعدیہ مصطفیٰ نے زندگی میں موو آن کر لیا ہے۔ بہت سارے سال زندگی میں پچھتاووں اور دکھوں میں گزار دیے۔ اب اور نہیں۔

ٹھیک ہے بہت سارے فیصلے غلط بھی ہوئے پچھتانے سے ہماری زندگی کے غلط فیصلے بدل جائیں گے؟ آگہی کا کوئی لمحہ۔

بالکل ہے، میں نے زندگی میں یہ بات وہ بھی اس سال ہی سیکھی کہ زندگی میں "موت" سے بڑھ کر بڑا اور کوئی "سچ" نہیں۔ زندگی میں "زندگی" سے بڑھ کر کوئی "دھوکہ" نہیں۔

2۔ بہت ساری تقریبات اٹینڈ کیں۔ پچھلے مہینے اٹھارہ نومبر کو ایک "الوداعی پارٹی تھی" ہم سارا سٹاف جس میں میل اسٹاف بھی ہے تو چونکہ میں حجاب کرتی ہوں تو کھانا بھی "حجاب" میں ہی کھا رہی تھی تو سر نے کہا تھا۔

"کمال ہے بھئی سعدیہ نقاب میں بھی آپ کھا رہی ہیں۔" جس کے جواب میں اسکول کی پرنسپل میم نرگس نے سر ذوالقرنین سے کہا کہ "ہماری مس سعدیہ بہت ٹیلنٹڈ ہیں یہ ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکتی ہیں۔" یہ لمحے یادگار ہیں اس تقریب کے میرے لیے۔

3۔ "تیسرا سوال میں بدلنا چاہتی ہوں اگر آپ اجازت دیں تو؟"

کوئی ایسا انسان جس کو آپ لائنز کے ذریعے کوئی میسج دینا چاہیں تو؟

"ہاں میں اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے پیرنٹس کے بعد میری ایک بہت عزیز دوست، ٹیچر "نورالعین" کو ہر اس چیز کے لیے شکریہ کہوں گی جو انہوں نے میرے لیے کیں۔"

☆☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

جنید اختر

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ"

"گزشتہ دنوں آپ کو عمرہ کی سعادت حاصل کرتے دیکھا، بہت اچھا لگا آپ کو مبارک ہو؟"

"بہت شکریہ..... جو اس جگہ ایک بار جاتا ہے اس کا دل بار بار مچلتا ہے دوبارہ جانے کو اور میں آپ پر یہ بھی واضح کردوں کہ میں، عمرہ کرنے نہیں بلکہ حج کی سعادت حاصل کرنے گیا تھا۔"

"تب تو آپ کو بہت ہی مبارک ہو۔"

"آپ نے بتایا کہ والد صاحب نے اعتراض کیا تھا تو اب؟"

کرتے ہیں؟"

"کرکٹ بہت پسند ہے۔ لیکن اگر آپ مجھے چوائس کا حق دیں گی تو میں بیڈمنٹن کی بات کروں گا کہ یہ مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔"

"زندگی انجوائے کرتے ہیں۔ اور زندگی سبق بھی دیتی ہے۔ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

"زندگی کو انجوائے کریں کیونکہ صحت ہے تو سب کچھ ہے اس لیے اپنی صحت میں زندگی کو انجوائے کریں۔ اور واقعی زندگی سبق دیتی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم پوزیٹو رہیں اور کسی سے گلہ شکوہ نہ کریں۔ کیونکہ ان باتوں سے دوریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"اپنی کمائی سے کیا لینا چاہتے ہیں؟"

"میری بھی خواہش ہے کہ میرا ایک خوب"

"ماں نے بہت سپورٹ کیا تھا اور اب تک کرتی ہیں الحمدللہ اور والد صاحب بھی کچھ نہیں کہتے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس وہی..... جو جاب والوں کی ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ کام بھی جاب کی طرح ہی ہے۔ فلم بھی کر رہا ہوں اور ڈرامے بھی۔"

"گزشتہ دنوں ورلڈ کپ کی بڑی دھوم رہی۔ انجوائے کیا؟"

"بالکل کیا..... بہت شوق سے دیکھا۔ گیم میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے، اس کو انا کا مسئلہ نہ بنایا کریں گے لوگ۔ بلکہ انجوائے کیا کریں۔"

"آپ کو کون سا گیم زیادہ کھیلتے ہیں یا پسند

صورت سا گھر ہو اور میں اس کو اپنی مرضی سے ڈیکوریٹ کروں۔"

"شوبز میں جب پہلی انٹری دی تھی تو کیا کیفیت تھی؟"

"ارے مت پوچھیں، کیا کیفیت تھی۔ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ کسی نے ریجیکٹ نہیں کیا تھا۔ بس پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہوتا گیا اور قدم جمتے گئے اور مزید جم رہے ہیں۔"

"جم سے جم یاد آ گیا۔ جاتے ہیں؟"

"ہاں..... مگر ریگولر نہیں کیونکہ وقت کی کافی قلت ہے۔"

"الیکشن ہونے والے ہیں آٹھ فروری کو..... کیسے پسند کرتے ہیں۔"

"مجھے سیاست میں اب کے دور میں کوئی بھی پسند نہیں ہے۔ ہاں مجھے "بے نظیر بھٹو" صاحبہ اچھی لگتی تھیں۔ ان کے بعد کوئی اچھا نہیں لگا۔ اور نہ ہی مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی ہے۔ الیکشن تو ہونے والے ہیں، اللہ کرے کوئی اچھا بندہ آئے جو ملک کے لیے مخلص ہو۔"

"ملک سے باہر جاتے ہیں، واپس آ کر کیسا لگتا ہے؟"

"اچھا ہی لگتا ہے کیونکہ کچھ بھی کہہ لیں۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے ملک سے پیار ہونا چاہیے اور مجھے تو بہت پیار ہے اپنے ملک سے۔ ہمیں اپنے ملک کی قدر کرنی چاہیے۔"

"شوبز میں ادھر ادھر سب لوگوں سے پالا پڑتا رہتا ہے کس طرح کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟"

"یہ کہنے میں تو کوئی حرج نہیں کہ اچھے اور مخلص لوگوں کو سب ہی پسند کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ منافق لوگ اچھے نہیں لگتے اور چونکہ میں منافق نہیں ہیں، تو میں اپنی اس عادت کی وجہ سے گھر کے اندر اور باہر کافی جگہوں پر نقصان اٹھا چکا ہوں۔"

"اب تک شوبز میں کیا کیا کر چکے ہیں؟"

"بارہ سے پندرہ ڈرامے کیے ہیں۔ کمرشلز بھی اچھے خاصے کر چکا ہوں۔ ایک فلم کی ہے جو ریلیز ہو چکی ہے، ایک مکمل ہو چکی ہے اور دو کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔"

"کس طرح کے کردار آسانی سے کر لیتے ہیں؟"

"ہر طرح کے خواہ وہ نگیٹو ہوں، پوزیٹو ہوں یا پھر رومینٹک ہوں یہ خیال ضرور رکھتا ہوں کہ ایسے رول کروں جن میں اداکاری کا مارجن زیادہ ہو۔ صرف اسکرین پر رہنا بڑی بات نہیں ہے کچھ کر کے دکھانا بھی بڑی بات ہوتی ہے۔"

"مطالعہ کا شوق ہے؟"

"بہت شوق ہے، کوئی اچھی تحریر مل جائے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ بہت زیادہ پسند ہیں۔"

"گھر میں ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟"

ہنستے ہوئے "سچ بتاؤں، امی کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاتا ہوں۔ اور خود بھی پکا لیتا ہوں اور کڑاہی گوشت تو بہت اچھا پکا لیتا ہوں۔ سب بہت پسند کرتے ہیں۔"

☆☆

امت العزیز شہزاد

والعصر

وری اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مرچکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو وری کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔

نانی وری کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آجاتی ہے۔

پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا تلخ ہے۔

عباد، وری کو پڑھانے آتے ہیں، وری بتاتی ہے کہ وہ کمبائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔

شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

وری کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آرہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

وری پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، واثلہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

رینا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروا دے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

pklibrary.com

وریٰ جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔
آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھالیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔
شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائنہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔
عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کر دیا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت سست کہتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔
بی ذی اپنا پروموشنل ٹیپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائنہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی ذی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔
شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں بات کا کہتی ہے۔
وریٰ ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ وریٰ حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آجاتے ہیں۔ وریٰ ڈر جاتی ہے۔
عامر بالی سے مل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور غصیل شوہر کی وجہ سے

pklibrary.com

پہلے ہی ناراض تھی۔ وریٰ بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اجنبی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔

نمبر نہ نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سست سناتا ہے۔

سہراب وریٰ کے بچ نکلنے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسیٰ نے اپنے گھر والوں کو سب بتا نہ دیا ہو۔

وریٰ رجا سے بات کرتی ہے۔

چھبیسویں قسط

ابن سلیمان

اے خود ناشناس

راز یزداں!!

اے دامن عقل تھامے قریہ قریہ

بے قرار پھرنے والی روح

خوب جان لو

کہ

راہ عشق نہیں آساں

بے نشان منزل

اور خردر بدری!!

''میں دوا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، کچھ دیر بعد اٹھی تو چائے لے کر آنٹی کے کمرے میں گئی تو تب دیکھا، وہ غسل خانے کے فرش پر گری ہوئی تھیں۔''

وہ لان سے اٹھ کر دوبارہ فیروزہ کے کمرے میں آ گیا تھا، اور کچھ بے چین سا ہو کر ایک بار پھر فیروزہ کے کمرے سے ملحقہ غسل خانے کا دروازہ وا کیے بغور اس مقام کو دیکھے چلا جا رہا تھا کہ جس جگہ اس روز بقول رینا فیروزہ اسے گری ہوئی ملی تھیں۔

وہ بے ہوش ہو کر گری تھیں یا گرنے کے بعد کسی وجہ سے ہوش و خرد بیگانہ ہو گئی تھیں؟ یہ معمہ اتنے برس گزر جانے کے باوجود حل طلب تھا۔

غسل خانے کا فرش زیتونی سبز رنگ کے ٹائلوں سے بنا تھا۔ اب تو خیر یہ کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ مگر جب فیروزہ کے زیر تصرف ہوا کرتا تھا تب یہاں ہلکے سبز رنگ کی صاف ستھری بالٹی، ڈونگا، ٹپ اور پٹراو غیرہ دھرا رہتا تھا۔

''تو کیا وہ گرتے سے کسی چیز سے بھی نہ ٹکرائی تھیں؟ اور اگر ٹکرائی تھیں، تو ان میں سے کسی شے نے بھی شور کیوں نہ کیا تھا؟''

یہ سوال آج بھی اسی روز کی طرح کی ہشت پا کی مانند اس کے دماغ میں پنجے گاڑے بیٹھا تھا کہ جس روز فیروزہ نے دروازے تک آ کر اسے الوداع کہا تھا۔ اسے لوٹنے میں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی، یا شاید ہو گئی تھی کہ جب وہ لوٹا تو یہ گھر ''اس کا'' نہیں رہا تھا۔

ایک ناگفتہ بہ سی ویرانی گھر کے در و دیوار میں سرایت کر چکی تھی اور کوئی وحشت سی وحشت تھی جو چہار اطراف دندناتی پھر رہی تھی۔

سنتے ہوئے، ہراساں، پریشان چہرے والی شانی اور حد درجہ رنجیدہ دکھائی دیتی شونا لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں اور رینا انہیں جو کچھ بتا رہی تھی، وہ سب اس نے بھی سنا تھا۔

''تو کیا ان کے گرنے کی آواز نہیں آئی تھی آپ کو؟'' شانی رونے لگی۔

''آئی ہوتی تو میں کیا فوراً جا کر نہیں دیکھتی؟'' وہ چہرے پر زبردستی افسردگی طاری کرتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں کب سے گری ہوئی ہوں گی وہ وہاں۔'' اس کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔

اور اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کا دل یہ آوازیں سن کر پھٹ جائے گا، سو وہ شونا سے اسپتال کا پتا پوچھ کر گھر سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

''میرا نام عماد زیدی ہے اور میں یہاں ''ڈیلی گرین'' کا نمائندہ ہوں۔''

ناشر کی تو بہت خواہش تھی کہ آتش کی کتاب کی تقریب رونمائی کا انعقاد ساؤتھ بینک سینٹر میں کیا جاتا مگر یہ بوجوہ ممکن نہ ہو سکا۔ یوں اب یہ تقریب وہاں کے بجائے مرکزی لندن کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل ''وی کراؤن'' کے ایونٹ ہال میں جاری تھی۔

چونکہ آتش کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جا رہی تھیں، اور اس کے افکار، بذریعہ یوٹیوب لیکچرز نوجوان نسل میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہال میں دنیا بھر کے جرائد و نیوز چینلز کے نمائندگان موجود تھے اور اس وقت تعارفی تقریر کے بعد پریس بریفنگ جاری تھی کہ تب ہی چہرے مہرے سے پاکستانی نژاد برطانوی دکھائی دیتے ایک نوجوان صحافی نے اپنا تعارف کروانے کے بعد سوال پوچھا۔

''اور میرا سوال سر آتش سے یہ ہے کہ آپ نے اپنی یہ کتاب چھپوانے کے لیے پاکستان کے بجائے یہاں کا انتخاب کیوں کیا؟''

''اس کا جواب میرے لیے دنیا یوں تھوڑا دشوار ہے کہ میں شہریت کے لحاظ سے آج تک کی تاریخ میں پاکستانی ہوں۔'' سیاہ گھٹنوں تک آتے کرتے اور سیاہ ہی سیدھے پاجامے میں ملبوس، سیاہ چمک دار بالوں کو جیل سے اچھی طرح جمائے۔ اپنے ناشر کے برابر میں بڑے طمطراق اور اعتماد سے بیٹھے آتش نے اس عماد زیدی نامی صحافی کا سوال پورے تحمل سے سننے کے بعد سامنے میز پر نصب مائیک پر آگے ہو کر ذرا سا جھکتے ہوئے اپنے مخصوص معنی خیز متبسم لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''اور اس سوال کا جواب دینے کی صورت میں میری سٹیزن شپ چھن جانے کا خدشہ ہے مگر میں پھر بھی یہ رسک لینا چاہوں گا۔''

اس کا انداز کچھ ایسا پر لطف تھا کہ جملہ حاضرین میں سے بعضوں نے تو یہ سب سن کر قہقہہ تک لگا دیا جب کہ وہ گویا تھا کہ۔

''تو بات دراصل یہ ہے میرے دوست کہ میرے ملک میں یقیناً ہر کام کی آزادی ہے ماسوائے ممنوعات کو چھیڑنے کے، غیر جانب دار رائے رکھنے کے۔ روایت سے الگ سوچنے کے، اپنی بات کہہ پانے کے۔''

اس کے اس مفصل جواب پر جہاں بہت سے چہروں پر بے ساختہ ستائش ابھری تھی وہیں چند پر استہزا، تمسخر جب کہ محترم ناشر کی گردن احساس تفاخر سے کچھ یوں اکڑ گئی تھی گویا کتاب کی اشاعت کو اپنا خدائی فریضہ سمجھ کر سرانجام دینے کے علاوہ آتش کو یہ سب کہنے پر بھی ان ہی نے ''مجبور'' کیا ہو۔

''پر بات کہہ دینے کی اتنی آزادی تو بہر حال موجود ہے ہی کہ آپ کی فالودر بی ذی نے وہیں رہتے ہوئے ایک ایسی بات کر دی ہے کہ جسے کرنے کے لیے آزاد معاشروں میں بھی خاصی جرأت درکار ہے۔''

اب پتا نہیں عماد زیدی کے اندر کا مسلمان بیدار ہوا تھا یا پاکستانی بے قرار، بہر کیف اس نے ایک بار پھر بہت سنجیدگی سے ایک ایسا سوال کر دیا تھا کہ جس کے کیے جانے کی توقع آتش کو کم از کم یہاں نہیں تھی۔ تب ہی ایک دم حد درجہ محتاط سا ہو کر بولا۔

''یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے، آپ میری کتاب کے بارے میں بات کیجیے۔''

☆☆☆

''کیا ہوا شہزادے؟ ابھی تو اندر گیا تھا۔ فوراً ہی واپس کیوں آ گیا؟''

سرور شاہ جو اپنے پُرتعیش ٹی وی لاؤنج میں کاؤچ پر نیم دراز ولایتی مشروب کے گھونٹ بھرتے ہوئے۔ چھیالیس انچ کی اسکرین پر بڑے مزے سے انگریزی گانے دیکھنے میں مشغول تھا، سرخ چہرے کے ساتھ سہراب کو لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر چونک گیا۔

''کیا ہوا؟ کیا قابو میں نہیں آ رہی؟'' اس نے دائیں آنکھ چھوٹی کر کے خاصے گھٹیا پن سے پوچھا تو سہراب جو اس کے سامنے والے دبیز صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔ فی الفور ایک مغروری تنتناہٹ سے بولا۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ سہراب جسے چاہے اسے قابو نہ کر سکے؟''

''واقعی ناممکن ہے۔'' وہ اسے داد دینے والے انداز سے ہنسا۔

''تب پھر مسئلہ کیا ہے، کمرے سے اتنی جلدی باہر کیوں آ گیا تو۔''

''مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے لب بھینچ کر مشروب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے دل ہی دل میں دہرایا۔

وہ اسے کیا بتاتا کہ مسئلہ وہ عروسی جوڑا بن گیا تھا جو عیسیٰ کے نام پر اس نے پہن لیا تھا اور جو اس کے ذہن سے یوں چپک گیا تھا گویا پیدائشی طور پر اس کا حصہ ہو۔ سو لاکھ سرور شاہ اس کے کرتوتوں کا راز داں سہی ہوتی ہیں نا کچھ باتیں جو انسان کسی پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا لہٰذا اسے ٹالتے ہوئے بولا۔

''مسئلہ تو کچھ بھی نہیں۔''

''کچھ بھی نہیں تو پھر اب دیر کس بات کی ہے؟'' اس نے ایک معنی خیز نگاہ اس پر ڈال کر پوچھا۔

''ابھی وہ ذہنی طور پر تیار نہیں۔'' وہ مشروب کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''اس لیے میں اسے کچھ وقت دینا چاہ رہا ہوں۔''

''محبت کر بیٹھا ہے اس سے؟'' سرور بہت گہری نظر سے اسے دیکھا۔ تو وہ ایک دم ہنس پڑا۔

''محبت؟ یہ کیا شے ہوتی ہے؟''

''یہ وہی ہے خان کہ جس کے نام پر تو آج تک کی تاریخ میں کوئی تین چار درجن لڑکیوں کو بے وقوف بنا چکا ہے۔'' سرور نے بڑے مزے سے جیسے اسے ''یاد'' دلاتے ہوئے کہا۔

''نہ...... نہ'' اس نے دائیں کان کی لو چھو کر گویا توبہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا۔ وہ سب مجھے واقعی پسند تھیں۔ بے وقوف تو وہ خود بنی ہیں۔''

''میرا یار پیس بھی تو ایسا ہے نا کہ مقناطیس کی طرح لڑکیاں اس کی جانب خود ہی کھنچی چلی آتی ہیں۔'' سرور توصیفی انداز میں بولا تو یک بیک اس کا موڈ حد درجہ خوش گوار سا ہو گیا۔ تب ہی وہ ذرا شوخ ہو کر بولا۔

''اللہ کی عطا......'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا جیسے اظہار تشکر کر رہا ہو۔ ''پر تیرے یار نے اس پر کبھی غرور نہیں کیا۔''

''کیا بات ہے خان...... کیا ہی بات ہے۔'' اسے چڑھ رہی تھی سو وہ لہک لہک کر بولا۔ پھر پوچھنے لگا۔

''خیر، یہ تو بتا، اب اس کا کیا کرے گا؟''

''نکاح کروں گا۔'' وہ جواباً بولا۔ ''اور کیا کرتا ہے؟''

pklibrary.com

''نکاح؟'' جھومتا ہوا سرور چونکا۔ ''پر اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے شاہ صاحب۔'' وہ کمینی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

''پر چھوڑ..... تجھے اب میں کیا سمجھاؤں؟'' چوں کہ سرور شاہ مکمل طور پر ''عالم بالا'' میں پہنچ چکا تھا سو مہراب نے مزید کچھ کہنا غیر ضروری خیال کرتے ہوئے گلاس ختم کرنے کے بعد اپنے گھر کی راہ لی۔

آنے والا اب جا چکا تھا۔ جب کہ وہ اندر تا حال ہوش خرد سے بیگانہ پڑی تھی۔

☆☆☆

''ہر وقت تمہاری فکر میں گھلتی رہتی تھیں، دیکھو تو کیا حال ہو گیا ہے میری ماں کا۔''

وہ جالے لگی چھت اور مٹی سے اٹے خشک فرش والے غسل خانے میں داخل ہو کر پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا، بہ نظر غائر نالیوں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ فیروزہ جیسی خوش قامت اور بھاری جسامت کی حامل، اس فرش پر کھڑے قد سے گریں اور پھر بھی کوئی آواز پیدا نہ ہو کہ تب ہی عامر کی کمر میں ڈوبی کرخت آواز اس کی سمع خراشی کا باعث بنی تھی۔

اس نے بے طرح چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو جانا کہ اب وہ یہاں نہیں تھا، بلکہ ماضی کی اس ملگجی سی شام میں پہنچ چکا تھا جسے ہزار ہا خواہش کے باوجود وہ اپنی کتاب زیست کے اوراق سے مٹا نہیں پایا تھا۔

وہ تقریباً سُن ہوتے ذہن کے ساتھ گویا بائیک اڑاتا۔ گھر کے نزدیکی اس نجی اسپتال تک پہنچا تھا کہ جہاں ایمرجنسی میں اس وقت فیروزہ داخل تھیں۔ شعبہ ایمرجنسی کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی خاموشی کی حامل راہداری ہی میں اسے عامر اور نعمی کھڑے مل گئے تھے۔ ٹھنڈی دیوار سے پشت ٹکائے نعمی بہت رنجیدہ و متفکر سی دکھائی دیتی تھی۔ جب کہ عامر کے نہ صرف حواس قائم تھے بلکہ وہ مستعد بھی تھا اور یہ کوئی ایسی قابل گرفت بات نہ تھی کہ ظاہر ہے اس وقت وہی گھر کا ''بڑا'' تھا ہاں مگر عجب تھا اس کا وہ لہجہ جو اس نے عیسیٰ سے مخاطب ہوتے سے اختیار کیا تھا گویا جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی کی وجہ سے تو ہوا ہے۔

''کیا ہوا ہے امی کو؟'' اس نے عامر کی بات یک سر ان سنی کرتے ہوئے نعمی سے استفسار کیا۔

''ڈاکٹرز نے ٹیسٹ کیے ہیں۔'' نعمی نے سیدھی کھڑے ہوتے ہوئے تحیر سے بتایا۔

''رپورٹ آنے ہی پر پتا چلے گا کہ کیا ہوا ہے۔''

''ابھی تک یہی نہیں پتا چلا کہ ہوا کیا ہے تو ٹریٹمنٹ کب شروع کریں گے۔'' وہ بے پناہ ذہنی انتشار و اعصابی دباؤ کے باعث چلا اٹھا۔

''ایک تو تم اپنے سیر سپاٹے کر کے اتنی دیر سے آئے ہو۔'' عامر نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اور اب یہاں آ کر ہمارے باپ بن رہے ہو۔''

''میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دیجیے۔'' وہ متوحش سے لہجے میں بولا۔ ''ورنہ میں امی کو لے جاؤں گا یہاں سے۔''

''شش..... شش.....'' عامر اسے کوئی طبیعت صاف کرنے والا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ تب ہی شعبہ انتہائی انگہداشت کے باہر تعینات گارڈ ان کے نزدیک آتے ہوئے کرختی سے بولا۔ ''یہ کیا شور ڈالا ہوا ہے آپ لوگوں نے ادھر، چلو جاؤ باہر.....''

''میری امی اندر ہیں۔'' وہ گارڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غراتے ہوئے بولا۔

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''بھائی! تم جاؤ۔'' عامر نے ایک تحقیر آمیز سی ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر، گارڈ سے بڑے نرم و خلیق لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں بھیجتا ہوں اسے باہر۔''

''ہاں صاب، دیکھ لو۔'' گارڈ عامر کے لب و لہجے سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔

''ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا ہے۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' گارڈ چلا گیا تھا اور عامر اس سے غالباً یہی کہنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے چلا جائے مگر اس سے قبل ہی وہ ہٹیلے پن سے بول اٹھا تھا۔

''دیکھو عیسیٰ۔'' اتنی دیر سے ان کی بحث سنتی نغمی نے اس بار آگے بڑھ کر عیسیٰ کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے حلاوت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یوں بھی ہم میں سے کوئی ایک ہی یہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ عامر کو یہاں رہنے دو۔''

''آپ مجھے یہاں رہنے دیں؟'' اس بار وہ جیسے بڑی بے بسی سے بولا تھا۔ ''انہیں گھر بھیج دیں۔''

''میرا ابھی یہاں رہنا ضروری ہے۔'' عامر درشتی سے بولا۔ ''تم میں تو کوئی احساس ذمے داری ہے نہیں، پتا چلا ڈاکٹر بلا رہے ہیں اور عیسیٰ صاحب ہو گئے غائب، اس لیے ابھی گھر جاؤ، کل اپنے شوق پورا کر لینا۔ مجھے تو امی کی یہاں اب لمبی ہی کہانی لگ رہی ہے۔''

☆☆☆

''دیکھیے بی ذی! رپورٹس آپ کی ساری بہت بہتر ہیں۔''

آج وہ تین ہفتے بعد مقررہ تاریخ پر ڈاکٹر پال کے پاس معائنے کی غرض سے آئی بیٹھی تھی۔ عموماً خاقان اس کے ہمراہ آیا کرتا تھا پر ان دنوں آفس کی غیر موجودگی میں اسے چونکہ حد درجہ چوکس اور مستعد رہ کر وہاں کے معاملات کی دیکھ ریکھ کرنا پڑ رہی تھی، سو اس نے آج بی ذی کو ڈرائیور کے ساتھ اکیلے ہی بھیج دینا چاہا تھا پر بی ذی یوں تن تنہا ڈرائیور کے ساتھ جانے پر کسی طور بھی راضی نہ ہوئی بلکہ خولہ کو ساتھ لے جانے کے لیے بضد ہوئی۔ تب خاقان نے خولہ کو دو چار سخت قسم کی ہدایات دینے کے بعد اسے بی ذی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ یوں اب وہ ڈاکٹر پال کے سامنے بی ذی کی وہیل چیئر کے ساتھ اسکارف سے چہرہ ڈھانپے سنجیدہ سی کھڑی ان کے مابین جاری گفت گو سن رہی تھی۔

''میری ساری رپورٹس بہتر ہیں تب میں اپنے پیروں پر کھڑی کیوں نہیں ہو پا رہی؟'' وہ بڑی بے بسی آمیز جھنجلاہٹ سے بولی تو ڈاکٹر پال ایک سرد سی سانس کھینچ کر عینک کی اوٹ سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر متانت سے بولے۔

''دیکھیے بی ذی، دنیا کا چاہے کوئی بھی اچھے سے اچھا، بڑے سے بڑا ڈاکٹر ہی کیوں نہ ہو، اس کی صلاحیتوں اور کی جانے والی کوششوں کی بہر حال ایک حد مقرر ہے۔''

''اور اس حد کے بعد؟'' بی ذی نے یک لخت چونک کر ڈاکٹر پال کا چہرہ دیکھتے ہوئے سراسیمگی سے پوچھا۔

''اور اس حد کے بعد ''وہ'' ہے، جو شفا دینے پر قادر ہے۔'' وہ حوصلہ دیتی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولے۔

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ جس قدر ہمارے بس میں ہے، ہم اتنا تو کر ہی رہے ہیں، باقی آپ دعا کیجیے۔ دعا معجزے دکھاتی ہے۔''

''آپ اتنی پریشان نہ ہوں میم۔'' ڈاکٹر پال نے بی ذی کی دواؤں کو کم کر کے اور ایک آدھ میں ردوبدل کر کے اسے روانہ کر دیا تھا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھی سو بہت خاموش اور گم صم سی دکھائی دے رہی تھی، تب ہی اسپتال کی راہداری سے گزر کر پارکنگ کی سمت جاتے ہوئے خولہ نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔

''ان شاء اللہ آپ تندرست ہو جائیں گی۔''

''وہ مجھے دعاؤں پر لگا رہے ہیں۔'' بی ذی مدھم مگر خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''اور تم کہہ رہی ہو کہ تندرست ہو جاؤں گی۔''

''جی میں یہ کہہ رہی ہوں۔'' وہ بہت مضبوط لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ مجھے دعاؤں پر یقین ہے۔''

''اچھا؟'' بی ذی طنز آمیزی سے بولی۔ ''کیا تم نے اپنی کسی دعا کو کبھی پورا ہوتے دیکھا ہے؟''
اور اس سے پہلے کہ خولہ اسے کوئی جواب دے پاتی، معاً چھ سات برس کی ایک پریوں کی سی معصوم صورت بچی سامنے سے بھاگتی آئی اور پوری شدت سے اس سے ٹکرا کر عقب میں گر پڑی۔
''ارے..... بیٹا۔'' خولہ پہلے تو غیر متوقع صورت حال پر ساکت ہوئی مگر پھر فوراً ہی بے اختیار بیٹھ کر اس بچی کو اٹھایا۔ ''دھیان سے، ایسے تھوڑی بھاگتے ہیں۔''
''میری بچی، میری جان۔'' خولہ نے حواس باختہ بچی کے بال سامنے سے ہٹا کر اسے تسلی دینا چاہی تھی کہ تب ہی دیوانہ وار بھاگتی وہ فربہی مائل، شفاف رنگت کی حامل لڑکی، اس تک چلی آئی اور بچی کو اس سے تقریباً جھپٹ کر لیتے ہوئے تڑپ کر سینے سے لگا لیا۔
''کہاں بھاگ رہی تھیں؟''
''آپ مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔'' گھبرائی ہوئی بچی ماں کی آغوش میں جاتے ہی بلک اٹھی۔
''ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں، میں چلی جاؤں گی کہیں۔''
''نہ..... نہ'' وہ اسے بے تحاشا چومتے ہوئے بولی۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے سیرت فاطمہ! ایسی بات کرنے والے گم ہو جاتے ہیں، پھر وہ کبھی نہیں ملتے۔''
''کیا ہوا یہ ٹھیک ہے؟'' ایک سنجیدہ صورت آدمی، دور سے انہیں دیکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان تک آیا اور بے قراری سے سوال کیا۔
''ہاں یہ میرا ہاتھ چھڑا کر بھاگ رہی تھی۔'' لڑکی کہ جس کے چہرے کا رنگ تا حال اڑا ہوا تھا، اسے جلدی جلدی بتانے لگی۔ ''ان سے ٹکرا کر گری تو انہوں نے اسے پکڑ لیا، ورنہ اب تک تو یہ ہاسپٹل سے باہر بھاگ گئی ہوتی۔''
''بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' وہ لب بستہ سی ساکت کھڑی خولہ کو مخاطب کر کے ممنونیت سے بولا۔
''دراصل ڈاکٹر نے اسے آئس کریم کھانے سے منع کیا ہے۔'' وہ لڑکی بتانے لگی۔ ''اور ابھی یہ وہی مانگ رہی تھی، میں نے انکار کیا تو خفا ہو کر ایک دم ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگنے لگی۔''
''ہاں بچے تو ضد کرتے ہی ہیں۔'' بی ذی کو پتا نہیں کیوں بچی کے لیے بے تحاشا فکر مند ہوتا یہ جوڑا بہت اچھا لگا تھا۔ تب ہی عادت کے برخلاف مسکرا کر جواباً بولی۔
''جی..... یہی تو..... آپ..... آپ غالباً بی ذی ہیں نا؟'' اس لڑکی نے گویا اچانک ہی اسے پہچانا تھا۔
''جی!'' بی ذی آج اس طرح پہچان لیے جانے پر نازاں ہونے کے بجائے اداس سی ہو گئی۔
''مجھے آپ بہت پیاری لگتی ہیں۔'' اس نے فوراً ہی کہا پھر جیسے اپنے جملے کی تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ ''دراصل مجھے آپ کا نام بہت پیارا لگتا ہے۔ ایک اپنائیت، اک سا محسوس۔''
''چلو بھئی۔'' اور ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ تب ہی وہ مرد بیزاری سے اسے ٹوک کر بولا۔ ''ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''
اور دیر تو واقعی ہو گئی تھی۔ تب ہی وہ لڑکی مسکرا کر انہیں الوداع کہتی آگے بڑھ گئی۔
''آپ پوچھ رہی تھیں نا کہ کیا کبھی میری کوئی دعا قبول ہوئی ہے؟''
ان کے جاتے ہی خولہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بہت غور اور کسی قدر حسرت آمیز نگاہوں سے انہیں دور جاتا دیکھتی بی ذی سے مخاطب ہو کر بولی۔
''آں..... ہاں۔'' وہ جیسے اپنے کسی خیال سے چونکی۔ ''ڈرائیور کو کال کرو۔'' اسے شاید اب اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، تب ہی اکتاہٹ زدہ سے لہجے میں بولی۔ ''اسے کہو کہ گاڑی یہیں لے آئے..... ہم

بہت دیر سے ویٹ کر رہے ہیں۔"

☆☆☆

"صوفی صاحب! آپ کی ہدایت کے مطابق بلاناغہ اپنی حاجت اللہ کے حضور پیش کر رہا ہوں پر داد رسی تا حال نہ ہو سکی ہے۔"

جانے والی اس کے پندار کو نا جانے کیسی چوٹ پہنچائی گئی تھی کہ آئینہ دیکھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے خود اس کی آنکھیں مضحکہ اڑا رہی ہوں۔ لوگوں سے ملنے جلنے سے وہ پہلے ہی کتراتا تھا، اب تو جیسے مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ مگر دل تھا کہ قرار نہ پاتا تھا۔

ذہن تھا کہ سوال اٹھاتا تھا کہ آخر وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر گئی۔ اور پھر گئی تو آخر گئی کہاں؟ کبھی جی میں آتا کہ وہ سہراب کے خلاف پرچہ کٹوا دے مگر پھر سوچتا کہ ایسا کر کے اسے کیا مل جائے گا کہ وہ تو اس الزام سے نہ صرف صاف طور پر انکاری تھا بلکہ اس کی جانب سے ایسے کسی اقدام کی صورت میں اس نے مقدمہ لڑنے کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ اور اس کے پلے تھا ہی کیا جو یہ محاذ کھول لیتا۔ ہاں مگر اندر ہی اندر یہ سوال اسے مار سیاہ کی مانند ڈنک مارے چلا جاتا تھا کہ وہ ایسے کیسے کہیں جا سکتی ہے اور پھر وہی کہ گئی تو گئی کہاں؟ اور اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ اللہ کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں تھا سو وہ روزانہ مصلی بچھا کر اس کے سامنے بیٹھ جاتا تھا کہ جواب مانگ سکے اور جو اسے تا حال نہ مل سکا تھا۔ یوں آج وہ بہت بددلی کے ساتھ صوفی صاحب کے در پر حاضر ہوا تھا۔

"صبر..... علی صبر۔" عقیدت سے آنکھیں بند کر کے تسبیح پھیرتے صوفی صاحب کی آج بھی یہی تلقین تھی۔

"پر میں آخر اور کتنا صبر کروں صوفی صاحب۔" اس کے ہر بن مو سے اضطرار جھلک رہا تھا مگر ظاہر ہے ان کی "آنکھیں" تو بند تھیں۔ سو بہت شانت سے لہجے میں نصیحت کرنے لگے۔

"جب بھی تھکنے لگو تو انبیاء کرام کی آزمائشوں کو یاد کر لیا کرو بیٹے..... ایسے تمہیں بہت حوصلہ ملے گا۔"

"پر میرا درجہ ایمان ان بلند ہستیوں سے بہت پست ہے حضرت۔" اس نے جیسے بہت بے چارگی سے انہیں آگاہ کرنا چاہا تھا۔

"پر بندہ مومن کا معیار تو وہی ہیں۔"

"سو تمہیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی مشق کرتے رہنا ہوگی۔"

"مجھے لگتا ہے، میں پاگل ہو جاؤں گا۔" وہ بہت آس بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے کوئی حل بتائیے حضرت۔"

"حل یہی ہے کہ استغفار کی کثرت کرو۔" انہوں نے دفعتاً اپنی شب بیداری کے سبب سرخ ڈوروں سے سجی آنکھیں کھول کر اسے شفقت سے دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔ "تم دیکھنا، وہ اپنی شان کریمی سے تمہاری ہر مراد پوری کر دے گا۔"

"اور جب تک مراد پوری نہیں ہو جاتی۔ تب تک میں کیا کروں؟"

"صبر۔" ان کا جواب وہی تھا۔ حالانکہ اس مرحلے پر سائل کے اس سوال کا جواب محض "صبر" نہیں تھا کہ صبر "جہد" کا ایک "جز" ہے اور جس کاوجود کوشش اور عمل کے بنا بے معنی اور قطعی بے روح ہے..... بہر کیف..... اس نے ایک بار پھر وہی تلقین سن کر سر جھکا لیا کہ ذہن کچھ اور پراگندگی کا شکار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"بابو!"

ایک لمحہ کے لیے یوں محسوس ہوا، گویا فیروزہ سامنے پلنگ پر بیٹھی اپنی ..... بھری آواز میں اسے پکار رہی

ہوں۔ تب ہی وہ اس بلاوے پر لبیک کہنے کو ایک جھٹکے سے اٹھا، مگر پھر فوراً ہی اپنی جگہ پر کچھ اس طرح سے ساکت و ہو گیا گویا برسوں سے یہاں نصب کوئی بے جان سا مجسمہ ہو۔

''بابو!''

فیروزہ نے ایک بار پھر اسے پکارا تھا، اور اس بار ان کی آواز میں کوئی ایسا تاثر تھا جیسے وہ پہچاننے کے باوجود صحیح طور پر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''بابو! سنو گے نہیں کے؟'' (سنو گے نہیں کیا؟)

ہاں..... بالکل اسی طرح تو انہوں نے اسے پکارا تھا کہ جب وہ عامر کے اسے اسپتال سے واپس بھیج دینے پر گھر جانے کے بجائے اسپتال کے سامنے واقع سڑک کی فٹ پاتھ پر جا کر بیٹھ گیا تھا کہ اس کا دل کسی طور پر بھی فیروزہ سے دور جانے پر آمادہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

اور رات گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔ سامنے کی پر شور سڑک اب ٹریفک سے تقریباً خالی ہو گئی تھی مگر اب بھی جب کوئی گاڑی گزرتی تو وہ اپنے انجمن زدہ پریشان کن خیالات سے چونک چونک اٹھتا تھا۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ہی موٹر سائیکلوں کی پارکنگ تھی۔ کبھی کوئی بائیک لگانے یا نکالنے آتا نگاہ اختیار اس اردگرد سے بیگانے پر بھی پڑ جاتی تھی۔ کچھ نگاہوں میں سوال ہوتا تو کچھ میں تاسف، کسی میں ترحم..... مگر وہ ان، سب نگاہوں سے بے خبر تھا اسے فی الوقت ہوش تھا تو محض اس قدر کہ اس کی رگ جاں اس وقت سخت مشکل میں پڑی تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت بیتا کہ معاً اسے اونگھ آ گئی۔

منتشر الذہن تھا سو نیم غنودہ سی حالت میں اس کا دماغ اسے نا جانے کہاں کہاں بھٹکاتا رہا اور پھر اچانک ہی اس کے کان کے قریب بہت ہی نزدیک فیروزہ نے جیسے سرگوشی سی کی تھی۔

''امی..... امی.....'' ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی سو اس نے حواس باختہ سا ہو کر اسپتال کی سمت بھاگنا چاہا۔

''ارے ارے بیٹا۔'' وہ کوئی بزرگ تھے کہ جنہوں نے اسے سامنے آنے والے رکشے کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔

''کیا ہوا، بہت پریشان دکھائی دیتے ہو؟'' انہوں نے ملائمت سے پوچھا تو وہ کسی ڈرے سہمے بچے کی طرح بولا۔

''میری امی..... امی ہیں آئی سی یو میں۔''

''شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے۔'' وہ آسمان کی جانب انگشت شہادت اٹھا کر اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''اس پہ بھروسا رکھو۔ تہجد کا وقت ہے۔ میں ساتھ والی مسجد جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو۔''

جی میں آئی کہ ایک نظر فیروزہ کو دیکھتا چلے مگر پھر گارڈ..... اور اس سے پہلے عامر کا خیال آنے پر سر جھٹک کر بزرگ کے ہم راہ مسجد کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

لیکچر تو آج تھا نہیں۔

ڈاکٹر کے پاس وہ جس قدر خوش امیدی اور بشاشت کے ساتھ گئی تھی، واپسی پر اتنی ہی نڈھال اور ذہنی طور پر پراگندہ سی تھی کہ لوٹتے ہی سو گئی.....

اور بالکل اسی کی طرح خواہ لمحہ بھر ہی کو سہی نیند کی آغوش میں چھپ جانا تو خولہ بھی چاہتی تھی مگر اول تو اسے کسی نے اس وقت اس ''عیاشی'' کی اجازت دینی نہیں تھی، دوم خود اس کے دل و دماغ اس وقت جس جذباتی جھٹکے سے گزرے تھے، اس کیفیت نے اس کی بھوک پیاس، نیند تو کیا، پہلے ہی سے لٹا پٹا چین و قرار سب مزید تہس نہس کر دیا تھا۔ سو وہ آتش کدے لوٹتے ہی کسی مشین کی طرح معمول کے کاموں میں جت گئی۔ شام کے

"جانے دو بی۔ڈی۔" شہراسے ٹوکتا ہوا بولا۔"اور کوئی کام کی بات کرو۔"
"یہ کام کی بات نہیں ہے؟" اسے یقیناً ٹوکے جانا ناگوار گزرا تھا سو ذرا برا مان کر بولی۔
"تمہارے نزدیک یہ باتیں کام کی کب سے ہونے لگیں بی۔ڈی؟" وہ حیرت زدہ سے لہجے میں بولا۔"آج سے قبل تو تم خود ایسی "بے کار باتوں" کا باقاعدہ ٹھٹھا اڑایا کرتی تھیں؟"
"ہاں...... "وہ گم صم سے لہجے میں بولی۔"اڑایا تو کرتی تھی مگر۔"
"مگر کیا بی۔ڈی؟" مگر سے آگے اسے مزید بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔
"کیا تم نے کبھی کوئی دعا مانگی؟" بی۔ڈی نے کسی خیال میں غلطاں، اچانک ہی پوچھا تھا۔
"اگر دعائیں مانگنے سے سب کچھ حاصل ہو جائے تو یہ دنیا جنت نہ بن جائے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال پوچھا تھا...... وہ لاجواب سی ہو گئی۔تب وہ قدرے توقف کے بعد گمبھیرتا سے بولا۔
"اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ بروقت اپنا ڈاکٹر تبدیل کر لو، یوں خالی خولی دعاؤں سے بھلا تمہیں تندرستی حاصل ہو سکتی ہے؟"
وہ دونوں اپنی باتوں میں مصروف تھے سو موقع غنیمت جان کر وہ بہت خاموشی سے اس منظر سے نکل گئی۔ پر نکلتے نکلتے اس نے جو کچھ سماعت کیا
ان لفظوں نے اس کے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھا دیا تھا۔
☆☆☆
"بیٹا! کہاں غائب ہو اتنے دن سے؟" شریفہ نے سہراب سے رابطہ قائم ہونے پر، چھوٹتے ہی شکوہ کر ڈالا۔دراصل وہ اسے کئی روز سے مسلسل کال کر رہی تھیں پر چونکہ اس کا نمبر بند تھا سو رابطہ ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔اور ان کی تشویش تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی تب انہوں نے کچھ سوچ کر بڑے محتاط انداز سے رینا کو کال ملائی کہ نہ جانے ان دونوں گھرانوں کے مابین ہوئی اس وری والی بدمزگی کے سبب وہ نہ جانے ان سے کیا برتاؤ کرے۔ مگر خیر گزری کہ اس نے تو ان سے یوں بات کی کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو......اور یہ بات ایک طرح سے درست بھی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا۔وہ اس کے ساتھ کب ہوا تھا جو اسے فرق پڑتا سو وہ کیوں ان کے ساتھ بے مروتی کا مظاہرہ کرتی اور پھر سہراب کی خاص الخاص تاکید بھی تھی کہ اپنے کسی بھی عمل سے ان لوگوں کو چونکانا نہیں ہے بہر کیف......شریفہ نے رینا ہی سے سہراب کا نیا نمبر حاصل کیا تھا اور اب اسے کال ملائی تھی۔
"کون؟" دوسری طرف وہ جو اس وقت سیاہ کرتے اور گھیر دار شلوار میں ملبوس، نک سک سے درست خوشبوؤں میں بسا، سرور شاہ کے کمرے میں کھڑا، سنگھار میز کے آئینے میں خود کو مغرور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، کچھ چونک کر گویا ہوا۔
"آپ کون بات کر رہی ہیں؟"
"ارے میں شریفہ۔" وہ جوش و خروش سے یوں بولیں گویا کہ وہ فوراً پہچان جائے گا۔"واثلہ کی امی۔"
"کون واثلہ؟ کون سی شریفہ؟" اب سے کچھ دیر بعد اس کا نکاح ہونے جا رہا تھا سو اسی وقت وہ اس خمار میں تھا لہٰذا کچھ جھنجلا کر بولا۔
"واہ بچے! اتنی جلدی بھول گئے۔" شریفہ کو قدرتی طور پر برا لگا۔سو اس بار ذرا چبا چبا کر بولیں۔"میں تمہارے دوست مفتاح کی امی۔"
"اوہ......آپ......" وہ بڑے بھرپور انداز سے چونکا پھر کچھ محتاط سا ہو کر ان کی خیریت دریافت کرنے لگا۔
"کیسی ہیں آنٹی آپ؟"

قریب جب بی۔ذی بیدار ہوئی تو اس کے لیے بلیک کافی بنانے لگی۔اسی اثناء میں شرر کی آمد کی خبر ملی ساتھ ہی اس کے لیے چائے تیار کرنے کا حکم بھی..... سو وہ اس کے لیے چائے رکھ کر بی۔ذی کو کافی دینے کے خیال سے کمرے میں چلی آئی مگر پہلے ہی قدم پر اسے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا کہ شرر اس کے خیال کے مطابق ڈرائینگ روم میں نہیں بلکہ بی۔ذی کے بیڈ کی دائیں دیوار کے ساتھ دھرے صوفے پر براجمان تھا، اور حیرت بھری آواز میں بی۔ذی اس سے پوچھ رہی تھی۔

"پھر آج تم کیسے ادھر آ گئے؟"

"تمہاری طبیعت پوچھنے چلا آیا تھا۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا تو اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر پونی کی شکل دیتی بی۔ذی کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے اور نگاہ بے اختیار اس بے نیاز کی سمت اٹھی تھی۔

"آج ڈاکٹر کے پاس وزٹ تھا نا تمہارا؟" اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر نہ جانے وہ کیا سمجھا جو اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں!۔" اس نے نگاہ اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے بکھرے بال جیسے تیسے پونی میں جکڑ کر سپاٹ لہجے میں ایک لفظی جواب دینے پر اکتفا کیا۔

اور ٹھیک اسی وقت دروازے کے باہر کھڑی خولہ جیسے اپنے کسی خیال سے چونکی، اور کچھ سوچ کر وہیں سے پلٹنے کے بجائے، دوپٹے سے اپنا جسم اور چہرہ اچھی طرح ڈھانپ کر اندر داخل ہو گئی۔

"تو کیا کہا ڈاکٹر نے؟" شرر ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر دوبارہ بی۔ذی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ گیا۔

"اس نے کہا کہ آپ دعا کریں۔" بی۔ذی کو جیسے ڈاکٹر پال کی اس بات نے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا، اسی الجھن زدہ سے لہجے میں اسے بتائے گئی۔

"چہ خوب!"..... وہ یہ سن کر ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔آنکھوں کی چمک پر طیش حاوی ہو گیا، اور لہجے میں تمسخر در آیا۔"تم دعا کرواور وہ خود کیا کرے گا؟"

"اس نے کہا کہ وہ کوشش کر رہا ہے۔"

خولہ سائیڈ ٹیبل پر کافی رکھ رہی تھی، وہ کافی کی سطح کو بغور دیکھتی یاسیت سے بولی۔

"اور اس کی کوششوں کی بہر حال ایک حد ہے۔"

"اور اس حد کے بعد؟" شرر نے بغور اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"اور اس حد کے بعد وہ لامحدود ہے، سو میں اس سے دعا مانگوں۔"

"ہاں۔" اس بات پر شرر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کرتے ہوئے ہنکارا بھرا تو بی۔ذی جو اس کی جانب سے جواباً کچھ کہے جانے کی منتظر تھی۔مضطربانہ بولی۔

"بتاؤ نا شرر..... کیا دعائیں واقعی ایگزسٹ کرتی ہیں؟" ہاں تم"

اسے اچانک ہی کافی کا کپ رکھ کر بہت خاموشی سے واپس پلٹتی خولہ کو دیکھ کر جیسے کچھ یاد آیا تو شرر سے سوال کرتے کرتے معاً اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"بتاؤ نا خولہ۔" بی۔ذی کچھ بے چین سی ہو کر اس سے مخاطب ہوئی۔"کیا کبھی تمہاری کوئی دعا قبول ہوئی وہاں ہاسپٹل میں تم مجھ سے اس بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھیں نا، وہ کیا کہہ رہی تھیں تم؟" اسے معاً دھیان آیا تھا..... خولہ مخمصے میں پڑ گئی۔وہ اس سوال کا جواب بی۔ذی کو دینا چاہتی تھی پر۔

"یا..... یاد نہیں"۔ وہ منمناتی آواز میں بس اسی قدر بولی۔

"ایسے کیسے یاد نہیں۔" بی۔ذی شاید اپنی کسی امید کا سرا اس کے جواب سے جوڑنے کی خواہاں تھی سو ذرا بے قراری سے مصر ہوئی۔"ذہن پر زور ڈالو نا۔"

''میں تو ٹھیک ہوں۔'' وہ پہچان لیے جانے پر طمانیت محسوس کرتے ہوئے بولیں۔ ''تم بتاؤ اتنے دن سے کہاں ہو؟ نہ گھر آئے، نہ فون کیا۔ پرانا نمبر بند کر رکھا تھا، نیا نمبر بھی نہیں دیا اور'' ان کے شکووں کی فہرست طویل تھی۔

مگر چونکہ اس کے پاس ان سے بات کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا سو درمیان سے بات قطع کر کے سوال کیا۔

''آپ کو میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''تمہاری خالہ سے لیا ہے اور کہاں سے ملنا تھا؟''

''اچھا..... اچھا۔'' اسے دل ہی دل میں ریناپر سخت تاؤ چڑھا جسے دبا کر وہ معتدل لہجے میں بولا۔

''جی بس میں وہ کچھ کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا، آپ بتائیے، آپ کیسی ہیں۔''

''میں تو ٹھیک ہوں۔'' شریفہ بہت میٹھے سے لہجے میں بولیں۔ ''تمہیں دیکھوں گی تو اور ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اس اتوار آجاؤ نا گھر پر..... رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا، کچھ ضروری بات ہے، وہ بھی کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے آنٹی میں آتا ہوں۔'' وہ انہیں ٹالنے والے لہجے میں بولا کہ سرور شاہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''رکھتا ہوں آنٹی اللہ حافظ۔'' اس نے جلدی سے کہا اور بنا دوسری طرف کا جواب سنے ترنت فون بند کر کے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

''چل خان..... جلدی چل۔'' سرور شاہ آنکھوں میں بے حیا سی چمک بھر کر اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مولوی صاحب آگئے ہیں..... انہیں تو اپنی محبوبہ کی طرح انتظار مت کروا۔''

☆☆☆

''اے وہ ذات کہ جس کے قبضۂ قدرت میں ذرہ ذرہ ہے۔''

ہمیشہ کی طرح وہ فیروزہ کے گرنے، اور گرنے کی صورت میں کسی آواز کے پیدا نہ ہونے کی وجوہات پر غور وغوص کرنے کے بعد گویا تھک ہار کر فیروزہ کے پلنگ پر آ بیٹھا تھا۔

پلنگ پر ہلکے فیروزی رنگ کی پھول دار چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہی چادر، جو فیروزہ کو سید صاحب نے ڈھاکہ سے لا کر دی تھی اور جسے وہ اکثر بچھا لیا کرتی تھیں..... برس ہا برس گزر جانے کے باوجود بھی اس چادر کا نہ تو کپڑا خستہ ہوا تھا اور نہ ہی رنگ اس قدر پھیکا پڑا تھا کہ نگاہوں کو ناگوار گزرے..... بالکل انہی یادوں کی طرح کہ جن میں اس وقت وہ گھرا بیٹھا تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو فجر سے ذرا پہلے نمازیوں کے لیے کھول دی جاتی تھی اسی مسجد کے مختصر سے صحن میں اس وقت وہ تہجد ادا کرنے کے بعد خالق کائنات کے سامنے اپنے چوڑی ہتھیلیوں والے مضبوط گندمی ہاتھ پھیلائے مجسم دعا بنا بیٹھا تھا..... بے قرار دل بھر بھر آ رہا تھا۔ اور سانسیں ضبط گریہ سے بھاری سی ہو رہی تھیں۔

''اے مالک الملک! تو جو چاہے تو کیا ہو نہیں سکتا؟ تو خود ہی تو کہتا ہے نا کہ مجھ سے مانگو میں عطا کروں گا۔ اور مجھے تیرے قول پر پورا بھروسا ہے سو میں اسی بھروسے کے ساتھ تیرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں۔

اے ذات بابرکت! میں اس وقت سراپا سوال ہوں اور سوالی کو کبھی دامان لوٹانا تیرا وصف نہیں۔''

اس نے آمین ثم آمین کہہ کر ابھی چہرے پر ہاتھ پھیرے ہی تھے کہ تب ہی فجر کی پہلی اذان بلند ہوئی۔

اور اسے یوں لگا، گویا کہ اس کی دعا بارگاہ بے نیاز میں شرف قبولیت پا گئی ہے..... سو اب کہیں جا کر اس کا دل مطمئن ہوا تھا لہٰذا ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو گیا..... چنانچہ اس نے بڑے جذبے و عقیدت سے اقامت صلوٰۃ سماعت کی اور سراپا عبدیت سے پہلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

''مجھے ابوذر کہتے ہیں اور میں سی۔ایس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔''

آج آتش کدے میں شرر کا چوتھا لیکچر تھا..... پچھلے دونوں میں تو وہ ماحول بڑا پرسکون اور کسی حد تک دوستانہ رکھنے میں کامیاب رہا تھا پر آج کا یہ لیکچر دشوار تر ثابت ہونے والا تھا، اس امر کا ادراک اسے آتش کی نئی کتاب کے مواد کے حوالے سے سوشل میڈیا پر اٹھنے والے طوفان کو دیکھ کر بخوبی ہو گیا تھا۔

''آئی بلیو آن مائی سیلف'' موضوع کے اعتبار سے ایک متنازعہ کتاب تھی..... جہاں'' ویسی روشن خیال'' اس کتاب کو اس گھٹن زدہ معاشرے میں امید کی موہوم سی کرن قرار دے رہے تھے وہیں مملکت خداداد کے ''مسلمان'' اسے اپنے اپنے ایمان کے لیے خطرہ گردانتے ہوئے، اس کے خلاف پوری قوت سے فعال ہو گئے تھے۔

الغرض اس وقت سوشل میڈیا پر بحث در بحث، یاوہ گوئی اور دشنام طرازی کا بازار گرم تھا..... ہر چند کہ صلاح الدین تقریباً روزانہ ہی اس کتاب کے حق میں پروگرام اپ لوڈ کر رہا تھا مگر بات فی الحال بنتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ بہر کیف، حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، میدان چھوڑ کر بھاگ جانا چوں کہ اس کی سرشت میں نہ تھا سو اس وقت یہاں موجود تھا اور پورے اعتماد سے آج کے لیکچر کی ابتدا کیا ہی چاہتا تھا کہ تب ہی ایک پتلون قمیص میں ملبوس، سر پر ٹوپی کیپ پہنے، پرکشش چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی سجائے ایک دراز قامت نوجوان نے اپنی گود میں دھرا کالج بیگ اپنی نشست پر رکھ کر اٹھتے ہوئے، پہلے ادب سے کچھ کہنے کی اجازت شرر سے طلب کرنے کے بعد، اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

''اور میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے سر آتش کی کتاب پڑھ لی ہے؟''

''مجھے ابھی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔'' وہ بہت چوکنا سا ہو کر محتاط لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر آپ نے پڑھ لی ہے تو بتا دیجیے اس میں کیا لکھا ہے؟''

''اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے، اسے میں دہرا تو نہیں سکتا۔'' وہ برہمی سے گویا ہوا۔ ''پر میں حیران ہوں کہ وہ سب لکھ کیسے دیا؟''

''آخر ایسا کیا لکھ دیا ہے۔ اس میں سر آتش نے میرے دوست؟'' شرر نے ماحول پر یک لخت طاری ہو جانے والے تناؤ کو کم کرنے کی خاطر دانستہ متبسم لہجے میں سوال کیا تو وہ کچھ جذباتی سا ہو کر بولا۔

''بہت سے پیراگراف اس میں ایسے ہیں جہاں سر آتش صاف صاف اللہ کے وجود سے منکر دکھائی دیتے ہیں۔''

''ہاں.....'' وہ بظاہر لاکھ پرسکون سہی، پر حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس کے من میں ایک شوریدہ سر طوفان سر اٹھانے لگا تھا۔ سو خاص ٹھہرتا سے ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔

''جو کچھ لکھا ہے سر آتش نے کہا ہے، اب آپ ہی بتایئے میں اس حوالے سے کیا کر سکتا ہوں؟''

''کر نہیں سکتے۔'' وہ چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ترنت بولا۔ ''پر اتنا تو بتا ہی سکتے ہیں کہ کیا آپ بھی ان کے اس موقف کے حمایتی ہیں؟''

یہ سوال نہیں گویا طلسم تھا کہ جسے پھونک کر اس نوجوان نے شرر کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔

تو کیا کش مکش کی راہ پر چلتے بالآخر وہ فیصلہ کن موڑ آ چکا تھا کہ جہاں سے آگے اسے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا؟

کیا اس ''جنگ'' کا اختتام قریب تھا کہ جو برسوں سے اس کے من میں جاری تھی؟؟

ساری کائنات جیسے دم سادھے اس کے جواب کی منتظر تھی اور آج ارادتاً اس طرف آنکلنے والی خولہ بھی۔

''جواب دیجیے شرر.....'' وہ بے چینی سے جواب جاننے کو مصر ہوا۔ ''کیا آپ سر آتش کے نظریے کو مانتے ہیں؟''

''میں مانتا ہوں یا نہیں۔'' چند ثانیے بوجھل خاموشی کے زیر اثر رہنے کے بعد وہ خود کو سنبھال کر بہت واضح اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ''یہ جان کر آپ کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ اہم یہ ہے کہ کیا آپ ان کے موقف کی رد میں کچھ پیش کر سکتے ہیں؟ اگر ہاں تو بات کیجیے اور نہیں تو اپنا مطالعہ وسیع کیجیے کہ دیگر سب باتیں محض وقت کا ضیاع ہیں۔''

اب اس سے زیادہ محتاط جواب بھرے مجمع میں وہ اور کیا دیتا؟ جواب..... جو واضح نہ ہونے کے باوجود ہر صاحب عقل کو بخوبی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ سوان میں سے بہتوں کی سمجھ میں آ گیا۔

جن میں سے ایک وہ بھی تھی وہ..... جو شرر کے منہ سے یہ سب سن کر بے اختیار زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اور اب اپنے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھے دل سے نکلنے والی چیخوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش میں حال سے بے حال، پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆☆☆

''ایسی ہوتی ہے شادی؟''

وہ سنہری کام کے سفید شرارے میں ملبوس، بھدے سے سنہری زیوات پہنے، سونی کلائیاں اور کورے ہاتھ لیے، کسی بھی قسم کی آرائش سے فطعی مبرا اپنی سیج پر بیٹھی یاسیت زدہ سی سوچ رہی تھی۔

وہ چاہے پیچھے رہ جانے والوں سے سب ہی ناتے کیوں نہ توڑ آئی ہو پر یہ وقت ایسا تھا کہ ان سب ہی کی یاد نے پوری قوت سے اس کے بھر بھر آتے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچ رکھا تھا..... خصوصاً نکاح نامے پر دستخط کرتے سے تو اسے لیاقت بیگم کا خیال اس شدت سے آیا کہ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

اس خفیہ نکاح کا انتظام سہراب کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

سو ''لوازمات'' مکمل تھے۔ پر ''کرائے کے گواہان''، ''بھاڑے کے وکیل'' میں ایسا کوئی نہ تھا جو اپنی زندگی کے اس اہم اور خاص الخاص لمحے میں آب دیدہ ہو جانے والی دلہن کی اشک شوئی کرتا سو اس نے خود ہی اپنے آنسو پونچھتے کے بعد میکانکی انداز سے نکاح نامے پر دستخط کر دیے تھے۔

☆☆☆

اگرچہ دل سہراب کے گزشتہ رویہ پر اس سے اب تک روٹھا ہوا تھا مگر اب اس کے پاس اس کے سوا اور رہ ہی کون گیا تھا کہ اب تو اس کا جو کچھ تھا، وہی تو تھا۔ وہ ابھی ان ہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ تب ہی ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھلا اور خوشبوؤں میں بسا اس کا ''دل دار'' گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''کنا سونیاں تینوں رب نے بنایا۔

جی کرے دیکھدا رہواں

وہ اسے دیکھ رہا تھا اور اس وقت اس کی حسین آنکھوں میں اس سفاک فاتح کی سی چمک تھی کہ جس نے بہت خون خرابے کے بعد کسی علاقے کو حاصل کیا ہے اور جو مفتوحہ زمین پر احساس ملکیت سے مغلوب کھڑا مسکرا رہا ہو۔

''حور جہاں، شعلہ پنہاں، جان جاں''۔ وہ بستر تک آیا اور دھم سے اس کے قریب گرتے ہوئے ایک عجب عالم سرمستی میں بولا۔

''کس قدر حسین دکھائی دے رہی ہو تم اس پاکیزہ رنگ میں، کوئی مجھ سے پوچھے۔''

''پر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اپنی شادی میں، میں یہ رنگ پہنوں گی۔'' یہ لمحہ ہی ایسا تھا کہ وہ نروٹھے پن سے روہانسے لہجے میں بے اختیار شکوہ کر گئی۔

''اچھا؟'' وہ اس کی جانب کروٹ لے کر بہت میٹھے لہجے میں بولا۔ ''پھر کون سا رنگ سوچا تھا تم نے؟ وہی جو عیسیٰ نے تمہارے لیے بھجوایا تھا؟''

''تم وہ بات بھول نہیں سکتے؟'' اس کا من چاہا جیون ساتھی، سہاگ سیج پر بیٹھ کر یہ کون سا موضوع نکال رہا تھا؟..... اسے حیرت کے ساتھ دکھ تھا..... سو وہ آزردگی سے کہہ گئی۔

''بھول جاؤں گا۔'' وہ عجیب انداز سے مسکرا کر بولا۔ ''اگر تم بھولنے دو تو۔''

''میں پوری کوشش کروں گی۔'' وہ بے وجہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی سو تابع داری سے بولی۔ ''بس تم خفا مت ہونا۔''

''اگر مجھے راضی رکھنا چاہتی ہو تو پھر وعدہ کرو۔'' وہ معنی خیز سے بولا۔

''وعدہ؟ کس بات کا۔'' اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔ ''اور یوں بھی وعدے تو آج کے دن تمہیں مجھ سے کرنے چاہئیں نا۔'' اس نے فلموں، ڈراموں، قصے، کہانیوں میں تو ہمیشہ یہی دیکھا تھا۔ مگر یہ حقیقت تھی..... ایسی حقیقت کہ جس کا ادراک تا حال اسے نہیں ہو سکا تھا۔

''میں وعدے کرتا نہیں، کرواتا ہوں۔'' وہ رعونت سے بولا۔

''بات تو یہی ہے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ بے لچک لہجے میں بولا۔ ''تو وعدہ کرو مجھ سے کہ تم نے آج سے اپنی ہر سوچ، ہر خواہش، پسند ناپسند سب میرے تابع کی۔''

''اگر تم اس پر خوش ہو سکتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔'' اس کا دل قرب کے باعث زور زور سے دھڑک رہا تھا سو وہ محجوب سے لہجے میں بولی۔ ''میں نے اپنی پسند ناپسند اور خواہشیں کیا، پوری زندگی تمہارے تابع کی۔''

''قائم رہنا اپنے اس وعدے پر۔'' وہ بہت شاد لہجے میں بولا تھا۔

''تم جانتے ہو، میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹتی۔'' وہ بہت تفاخر سے بولی۔ ''تب ہی تو آج تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

''ہاں..... تم واقعی میرے سامنے موجود ہو۔'' سہراب نے خمار آلود لہجے میں کہتے ہوئے ایک دم اس کا ٹھنڈا پڑتا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ پر تھاما نہیں۔ تھامنے اور پکڑنے کے بیچ جو فرق تھا۔

وہ آسانی سے سمجھ میں کہاں آ سکتا ہے۔

سو وہ بھی چوک گئی تھی۔

☆☆☆

''اچھا ہوا تم آ گئے، میں ساری رات کا تھکا ہارا ہوں، اب گھر جا کر آرام کروں گا۔''

اس نے اب بلا ارادہ ہی فیروزی چادر کے سفید پھولوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنا شروع کر دیے تھے..... اور یہ حرکت اضطراری تھی۔ وہ جیسے خود کو کسی کام سے باز رکھنے کی سعی ناکام کر رہا تھا پھر اس نے اذیت سے اپنی آنکھیں ایک دم بند کر لیں۔ پر ذہن پر اس کا بس نہ چلا۔

اور اس لمحے اس نے شدت سے ایک بار پھر یہی خواہش کی کہ اے کاش..... یادداشت مٹانے کا بھی کوئی آلہ ہوتا..... اگر ہوتا تو وہ خود کو بیچ کر بھی اسے خریدنے سے دریغ نہ کرتا مگر۔

مسجد سے ظاہر ہے کہ وہ سیدھا اسپتال چلا آیا تھا۔ جہاں بے آرامی اور نیند کے غلبہ کے سبب حال سے بے

حال دکھائی دیتے عامر نے اسے سامنے پا کر بنا کوئی طرم خانی دکھائے بے ساختہ اس سے کہا تو وہ سر ہلا کر دھیرے سے بولا۔

"ٹھیک ہے، آپ جائیے..... میں ہوں اب یہاں۔"

سو عامر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اور اس کے جانے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک نرس نے آ کر استفسار کیا کہ

"مسز فیروزہ سید کے ساتھ کون ہیں؟"

"جج..... جی..... میں۔" وہ جیسے بوکھلا کر اس کے سامنے آیا تھا۔

"کیوں..... کیا ہوا؟"

"پیشنٹ ہوش میں آ گئی ہیں۔ آپ کی....." اس نے گمبھیرتا سے بتایا۔ "کسی کو آواز دے رہی ہیں، آپ جا کر دیکھ لیں۔"

"اچھا..... اچھا....." وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس وقت وہ کس جذبے کے زیر اثر تھا..... دعا کے مستجاب ہو جانے پر شکر گزاری کے یا پھر والدہ کے ہوش میں آ جانے کے سبب فرط انبساط کے بہر کیف وہ فوراً سے پیشتر آئی۔ سی۔ یو میں داخل ہوا اور دبے قدموں چلتا ہوا فیروزہ کے بیڈ کے پاس جا کر رک گیا تھا۔

"ام..... می!" انہیں سرتاپا مختلف نالیوں میں جکڑا دیکھ کر اس کے دل کو جیسے کسی نے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ وہ جو ایک سرشاری کا احساس لیے اندر داخل ہوا تھا، اس کی جگہ اب رنجیدگی نے لے لی تھی..... سو وہ خواہش کے باوجود بھی انہیں بشاشت سے نہ پکار سکا..... مگر فیروزہ کے لیے یہ پکار بھی بہت تھی سو انہوں نے اپنی ورم زدہ آنکھیں ترنت کھول کر اسے دیکھا۔

"ہمرا بابو" آکسیجن ماسک میں چھپے ان کے سیاہ پڑتے لب ذرا سا پھڑپھڑائے۔

"جی امی..... میں ہوں۔" وہ ترپ کر ان پر جھکا کہ سن سکے کہ آخر وہ کہہ کیا رہی ہیں۔

"اپنا خیال رکھنا نے۔" وہ یہ کیا کہہ رہی تھیں؟ عیسیٰ نے بہت چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ رکھیں گی نا میرا خیال۔" پتا نہیں اس نے انہیں تسلی دی تھی یا خود کو دلاسا۔ اس بات پر ایک حزن زدہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر در آئی..... پھر وہ مدھم، بہت ہی مدھم سے لہجے میں بولیں۔

"دعا کرنا نے۔"

"ہاں..... ہاں میں نے بہت دعائیں کی ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس کی بات مکمل ہوئی اور ادھر ان کے وجود نے پہلا جھٹکا کھایا تھا۔

"یہ..... انہیں کیا ہو رہا ہے۔" وحشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"پلیز..... آپ باہر جائیں۔" آن واحد میں وہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ جیسے اٹل ہو گیا۔

"پلیز انہیں باہر نکالیں۔" آن ڈیوٹی ڈاکٹر نے نا جانے کس سے کہا اور فیروزہ پر جھک گئی۔

"یہ کولاپس کر رہی ہیں۔" کسی نے اسے پکڑ کر باہر نکالا، یہ تو اسے یاد نہیں..... ہاں مگر یاد تھا اس ڈاکٹر کا وہ جملہ..... وہ جملہ جس نے اس کی دنیا اندھیر کر دی۔

"انہیں وینٹ پر ڈالنا ہوگا..... ہری اپ"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت

سرما کی دھوپ

سرما کی نرم گرم دھوپ میں بیٹھ کر مالٹے کھانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ابا اس چھوٹے سے شہر کے سب سے بڑی کلاتھ ڈپو پر ملازم تھے۔

تنخواہ بہت زیادہ نہ سہی تو بالکل تھوڑی بھی نہ تھی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی مگر اتنی بہر حال نہ تھی کہ بلا ناغہ گھر واپسی پر موسمی فروٹ خرید کر لاتے۔ پھلوں کی تو فرحانہ زیادہ فرمائش بھی نہ کرتی تھی لیکن کینو اور مالٹے اس کی کمزوری تھے جیسے ہی ان پھلوں کا سیزن ہوتا، وہ باپ سے مالٹے لانے کی فرمائش کرنا نہ بھولتی۔

مہینے کے شروع میں تو بیٹی کی فرمائش پوری کرنے پر اماں کچھ نہ بولتیں لیکن جب تنخواہ کے پیسے بند مٹھی میں سے ریت کی مانند پھسلتے جاتے اور اگلی پہلی نزدیک ہونے کے باوجود بہت دور لگتی تو ایسی فضول خرچی پر وہ باپ اور بیٹی دونوں پر بگڑتیں۔

"آج پھر تم اپنی لاڈلی کی فرمائش پر پھل لے آئے، پتا بھی ہے ناں تنخواہ تقریباً ختم ہونے والی ہے۔" شام کو ابا کے ہاتھ میں مالٹے کا شاپر دیکھ کر اماں خفا ہوتیں۔

"اللہ مالک ہے فرحانہ کی ماں! ایک ہی تو فرمائش کرتی ہے میری بیٹی، وہ بھی پوری نہ کیا کروں۔ آجا فرحانہ! لے بیٹا تیرے مالٹے لے آیا ہوں۔" ابا بیوی کے تیور نظر انداز کرتے ہوئے بیٹی کو پکارتے۔

فرحانہ دوڑی دوڑی چلی آتی۔ سب بہن بھائیوں میں پھل کی منصفانہ تقسیم ہوتی۔ چھوٹے بہن بھائی اسی وقت مالٹے چھیل کر کھانے کے متمنی ہوتے،

pklibrary.com

لیکن پہلے اماں تو کتیں کہ اتنی ٹھنڈ میں اس وقت مالٹے کھانا نقصان دے گا پھر فرحانہ اماں کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

"ہاں ناں وقاص! تم لوگوں کی سردیوں کی چھٹیاں ہیں ناں کون سا دن میں اسکول جانا ہے کل دھوپ میں بیٹھ کر مزے سے کھائیں گے۔"

اور اگلے دن دھوپ میں بیٹھ کر مالٹے کھانے کا اپنا الگ ہی سواد ہوتا۔

☆☆☆

بابل کے آنگن میں بیٹیوں کا قیام سرما کی دھوپ جیسا ہی ہوتا ہے۔ دھوپ آنگن میں پھیلے دیر نہیں ہوتی اور ڈھلنے کا سماں آجاتا ہے۔

ہاجرہ اور فیض بخش کو بھی فرحانہ کی رخصتی کے سمے یوں ہی لگا تھا کہ ابھی کل ہی تو اس نے ان کے آنگن میں آنکھ کھولی تھی اور آج وہ بابل کا انگنا سونا کیے پیا دیس سدھار گئی تھی۔ بیٹی کی جدائی پر دونوں سوگوار تھے تو فرض سے سبک دوشی کا احساس اطمینان بخش بھی تھا۔ جو مرحلہ بیٹیوں کے والدین کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوتا ہے وہ رب کی رحمت سے بخیر و خوبی نمٹا تھا۔

کامل، فیض بخش کے چچیرے بھائی کا بیٹا تھا۔ قریبی شہر میں ان لوگوں کا اپنا دو منزلہ ذاتی مکان تھا۔ باپ اور تینوں بیٹے مل کر جنرل اسٹور چلاتے تھے۔ دکان موقع کی جگہ پر تھی آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی۔

کامل کے بڑے دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ کامل کی شادی پر اس کی دونوں بہنوں کی رخصتی بھی انجام پائی تھی۔

کامل سے فرحانہ کا رشتہ طے ہونے کے چند ماہ بعد ہی شادی کی تاریخ بھی ٹھہرا دی گئی تھی۔

ہاجرہ کا شمار ان ماؤں میں ہوتا تھا، جو بیٹی کی پیدائش کے وقت سے ہی اس کو رخصت کرنے کے لیے جمع جوڑ شروع کر دیتی ہیں۔ پھر اس کے سسرال والے بھی بھلے مانس لوگ تھے ان کی جانب سے کوئی فرمائش یا مطالبہ سامنے نہ آیا۔ سارے مرحلے خوش اسلوبی سے نمٹے اور فرحانہ کامل کی دلہن بن کر اس کے گھر پہنچ گئی۔

☆☆☆

کامل محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا اس کے سنگ فرحانہ خوش تھی، ہاں ابھی سسرال میں قدم جمانے اور دل لگانے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

یہ ایک بھرا پرا گھر تھا۔ اس کی دونوں جیٹھانیوں کے چار چار بچے تھے۔ وہ ان ہی کے کاموں میں ہلکان ہوئے رہتیں۔

ساس فطرتاً بری نہ تھی مگر مزاج کی کچھ تیز تھیں سسر بے ضرر مگر بلا کے خوش خوراک، ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے چکر میں ہی بہوؤں کا زیادہ وقت باورچی خانے کی نذر ہو جاتا۔

سونے پہ سہاگہ دونوں نندیں بھی قریب ہی بیاہی گئی تھیں۔ وقت بے وقت ان کی تشریف آوری ہوتی رہتی ان کے لیے الگ سے اہتمام ہوتا۔

فرحانہ کام سے جی چرانے والی لڑکی نہ تھی لیکن سسرال کے طور طریقوں کو سمجھنے اور اپنانے کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔

میکے کے برعکس اس گھر میں کھانا پینا بہت کھلا تھا۔ سسر گھر آتے ہوئے سموسے، جلیبی یا اس طرح کی سوغات لاتے، سب لوگ مزے لے لے کر کھاتے۔ فرحانہ شرماشرمی میں تھوڑا بہت ہی کھاتی ایسے ہی ایک دن اسے تنہائی میں کامل نے ٹوکا۔

"اب یہ گھر تمہارا بھی ہے، کچھ کھاتے ہوئے کیوں شرماتی ہو۔ آج ابو سموسے اور چکن رول لائے تھے اور میں دیکھ رہا تھا۔ تم سے ایک سموسہ بھی پورا نہ کھایا گیا۔" شوہر کی بات سن کر وہ مسکرا دی۔

"تلی ہوئی چیزیں تو برسات میں ہی زیادہ لطف دیتی ہیں میں تو سردیوں کے موسم میں اپنے ابا جی سے ایک ہی فرمائش کرتی تھی۔" فرحانہ کو باپ کی یاد آئی اور یاد کے ساتھ ہی آنکھیں بھی بھیگ سی گئیں۔

"کون سی فرمائش بھئی، ہمیں تو حسرت ہی ہے

کہ تم مجھ سے بھی کوئی فرمائش کرو۔" کامل نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا۔

"اچھا پھر کل مالٹے لے آیئے گا۔ مجھے سردیوں میں دھوپ میں بیٹھ کر مالٹے کھانا بہت پسند ہے۔"

اس نے شوہر سے شرماتے ہوئے فرمائش کی اور اس معصومانہ فرمائش پر کامل نہال ہی ہو گیا۔ اگلے دن شام ڈھلے جب وہ دکان سے لوٹا تو بڑا سا مالٹوں سے بھرا شاپر بھی اس کے پاس تھا۔

فرحانہ اور بڑی بھابھی کچن میں تھیں، اس نے بھابھی کے ہاتھ میں شاپر پکڑا دیا۔ بھابھی نے مصروف سے انداز میں پھلوں والی ٹوکری میں مالٹے رکھ دیے۔ رات کو جب سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ بیڈ روم میں آئی تو کامل اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں جی کھا لیے مالٹے۔"

"اب رات کو کھاتی؟" فرحانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ "دن میں دھوپ میں بیٹھ کر کھاؤں گی بلکہ آپ بھی ہوں تو مزہ آئے لیکن آپ کو تو چھٹی والے دن بھی فرصت نہیں ملتی۔ چھت پر دھوپ میں بیٹھ کر میرے ساتھ مالٹے کھائیں۔ اتنا مزہ آئے گا ناں۔"

فرحانہ کے کہنے پر کامل نے محبت سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کی بیوی میں آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری نہ تھی کیسی معصومانہ خواہش اور فرمائش تھی اس کی۔

"اپنے بیڈ روم میں جتنا مرضی وقت اکٹھے گزار لیں۔ جان من لیکن دن کی روشنی میں اگر اماں ہم بھائیوں میں سے کسی کو بھی اس کی زوجہ کے سنگ دیکھ لیتی ہیں ناں تو ان کا کم سے کم طعنہ زن مرید یا جورو کے غلام والا ہوتا ہے اس لیے تم دھوپ میں بیٹھ کر رج کر مالٹے کھاؤ لیکن اس خاکسار کو معاف ہی رکھو۔"

اس کے شرارتی انداز میں کہنے پر فرحانہ بھی مسکرا دی تھی۔ دل ہی دل میں شوہر کی محبت پر نازاں اور مغرور بھی تھی۔ اس نے فرمائش کی شوہر نے فوراً پوری کر دی۔

اب فرحانہ یا کامل کو کیا پتا تھا کہ آہ کی طرح فرمائش کو بھی پوری ہونے کے لیے ایک عمر چاہیے ہوتی ہے۔ اگلے دو دن فرحانہ کو منہ دھو کر کپڑے بدلنے کی فرصت نہ مل پائی تھی۔

منجھلی بھابھی کے دن پورے تھے۔ رات کے آخری پہر انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ فجر کے وقت انہوں نے بیٹے کو جنم دیا۔ اوپر تلے کی چار بیٹیوں کے بعد اللہ نے اب بیٹے سے نوازا تھا اور شاید اس بیٹے کے انتظار میں ہی وہ سات سالوں میں پانچ بچوں کی اماں بن گئی تھیں بہرکیف فرحانہ کے سسرال میں اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

دن میں بھابھی ہسپتال سے گھر لوٹیں تو گھر میں مبارک دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بڑی بھابھی اور فرحانہ گھر کے کاموں میں پھرکی بن گئی تھیں۔ اب خیر سے منا تین دن کا ہو گیا تھا۔ مہمانوں کا سلسلہ کچھ تھما تو فرحانہ نے سکون کا سانس لیا۔

وہ رات کا کھانا بنانے کچن میں گئی تو پھلوں کی ٹوکری پر نگاہ پڑی۔ اس گھر میں شاید کوئی بھی پھلوں کا اتنا شیدائی نہ تھا۔ ٹوکری ابھی بھی بھری پڑی تھی۔ دن میں دھوپ میں بیٹھ کر مالٹے کھانے کی فرصت کسے ملنا تھی۔ فرحانہ نے وہیں کھڑے کھڑے مالٹا چھیلنا شروع کیا تھا۔

"بہو ہانڈی بنانے کے بعد اپنے ابو کے لیے تھوڑے سے گڑ والے چاول ......" ساس کوئی ہدایت دینے کچن میں آئیں تو بولتے بولتے رک گئیں۔

"لو بھلا بتاؤ تم نے تو ابھی تک چکن کا پیکٹ بھی فریج سے نہیں نکالا۔ میرا بچہ یہ مالٹے کہیں بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں، فرصت سے بیٹھ کر سکون سے کھا لینا۔ ابھی تو جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ پتا تو ہے کامل کے ابو گھر آنے کے بعد کھانے کی کیسی جلدی مچاتے ہیں۔" انہوں نے اسے رسانیت بھرے انداز میں ٹوکا۔

pklibrary.com

شرمندہ ہوتے ہوئے ادھ چھلا مالٹا واپس ٹوکری میں رکھا اور فریج کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

چند دن بعد ماں کی اجازت سے کامل اسے تین چار دن کے لیے میکے چھوڑ آیا تھا، وہ شادی کے بعد پہلی بار رکنے کے ارادے سے میکے آئی تھی۔ وہ تو خوش تھی سو تھی سب گھر والوں کا خوشی سے برا حال تھا۔ اماں نے اس کی پسند کے سب پکوان تیار کر رکھے تھے۔ صبح دکان پر جانے سے قبل ابا نے بھی لاڈ بھرے انداز میں بیٹی سے کچھ لانے کا پوچھا۔

"بس ابا! یاد سے مالٹے لے آیئے گا۔" اس نے جھٹ فرمائش کی۔

"آپا! آپ کے سسرال میں مالٹے نہیں آتے کیا؟" وقاص نے پوچھا۔ فرحانہ کی نگاہوں میں مالٹوں بھری ٹوکری گھوم گئی، ساس کے ٹوکنے کے بعد اس نے ایک مالٹے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

"آتے ہیں وقاص! بہت آتے ہیں۔ بس وہاں دھوپ نہیں آتی۔ دھوپ کے لیے اوپر چھت پر جانا پڑتا ہے اور چھت پر جانے کی فرصت مشکل سے ہی ملتی ہے۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ فیض بخش نے چونک کر بیٹی کو دیکھا مگر خاموش رہے۔

شام کو گھر آتے ہوئے وہ بیٹی کے لیے ڈھیر سارے مالٹے لے آئے تھے۔ اگلے دن دکان کی چھٹی تھی۔ سب گھر والے دھوپ میں بیٹھ کر مالٹے کھا رہے تھے۔ جب فیض بخش نے ذرا تشویش کے عالم میں بیوی سے سرگوشی کی۔

"یہ اپنی فرحانہ کل کیا کہہ رہی تھی۔ اسے وہاں دھوپ میں بیٹھنے تک کی فرصت نہیں، خوش تو ہے ناں وہاں۔" ان کے دل میں اندیشے سر ابھار رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے بہت خوش ہے بلاوجہ کے وہم نہ پالیے۔" فیض بخش چونکہ اکثر و بیشتر ایسی باتیں ٹوکتے رہتے تھے اس لیے ہاجرہ نے انہیں فوراً ٹوکا تھا۔

"پتا نہیں کیوں مجھے فرحانہ کچھ مرجھائی مرجھائی سی لگ رہی ہے۔" ان کی تشویش کم نہ ہوئی۔

"شادی کے بعد لڑکیوں کو سسرال میں قدم جمانے میں تھوڑا وقت لگتا ہے فیض بخش! اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بیٹی کے قدم وہاں جمنا شروع ہو گئے ہیں۔ کامل بہت خیال رکھتا ہے اس کا ہمیں اور کیا چاہیے۔"

ہاجرہ نے شوہر کی تشفی کروائی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹی کو دیکھے گیا۔

"اور جہاں تک سرما کی دھوپ کا تعلق ہے تو آپ کا کیا خیال ہے فیض بخش! برسوں پہلے جب میں بیاہ کر آپ کے گھر آئی تھی تو مجھے سرما کی دھوپ فوراً مل گئی تھی۔" اس نے مسکرا کر شوہر سے پوچھا۔

"تھوڑا وقت لگتا ہے فیض بخش! ایک لڑکی جب بیاہ کر دوسرے آنگن میں جاتی ہے تو اسے آسودگی بھری نرم گرم سی دھوپ ملنے سے پہلے کچھ نرم گرم سے رویے بھی جھیلنے پڑتے ہیں یہ کوئی انہونی بات نہیں، نہ ہی ان معمولی باتوں کو جی سے لگا کر کڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ کی لاڈو کو بھی یہ ہی سمجھاؤں گی کہ جو میسر ہے اسے رب کا کرم جان کر اس پر شکر سیکھے۔ اسی آنگن میں اسے مقدر بھر سرما کی دھوپ ضرور ملے گی۔ تن من آسودہ کر دینے والی دھوپ۔"

آٹھ جماعت پاس ہاجرہ کی باتوں میں تجربے کی بھٹی سے گزر کر کسی فلسفی کی مانند گہرائی آ گئی تھی۔ فیض بخش نے نرمی سے مسکرا کر شریک حیات کو دیکھا پھر محبت بھری نگاہ بیٹی پر ڈالی جو ماں باپ کی سرگوشیوں سے بے نیاز چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ مالٹے کھانے میں مشغول تھی۔

☆☆

pklibrary.com

قانتہ رابعہ

ادھورے خواب

انتہائی سمجھ دار اور ذمہ دار وقت اور اصولوں کی پابند ناہید عالم نے بچوں کو پڑھانے سے قبل مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم ان امتحانات میں اچھے نمبر لو گے تو ہم تم سب بچوں کو چڑیا گھر لے کر جائیں گے۔" ناہید کے چاروں بچوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھے انہیں قابو کرنا اور بالخصوص پڑھنے کے لیے آمادہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

یہ ضروری نہیں کہ محنتی والدین کے بچے بھی محنتی ہوں نکمے والدین کے بچے ست الوجود ہوں قدرت بسا اوقات معاملہ الٹا کر بھی دکھا دیتی ہے اب یہی حالات تھے۔ ماں کی محنت اور تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑنے کی شہرت تھی تو بچے پڑھنے لکھنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

بچوں نے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"صرف چڑیا گھر؟"

"نہیں بھئی صرف چڑیا گھر نہیں، مینار پاکستان، شاہی قلعہ اور جہاں تم کہو گے"؟؟ اس نے آوارگی پر ہر وقت تیار چٹورے بچوں سے، کہا جن کے امتحانات سر پر تھے اور انہیں دو منٹ بیٹھ کر پڑھنا یا سبق یاد کرنا دوبھر ہو گیا تھا۔

"کیا سچ مچ ہم جائیں گے اصلی والے چڑیا گھر؟" سات سالہ نوری نے پوچھا اسے بندر اور بھالو کی کہانیاں سن سن کر بندر، بھالو، ہاتھی اور زرافہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

"کیا کہا چڑیا گھر اور شاہی قلعہ، میں تو جھولوں

pklibrary.com

والے پارک میں بھی جاؤں گا۔ جہاں بجلی سے چلنے والے جھولے اوپر آسمانوں تک لے جاتے ہیں۔" دس سالہ فواد نے فرمائش کی۔

"ہاں ٹھیک ہے بھئی بس تم دل لگا کر امتحان کی تیاری کرو جس دن تمہارا نتیجہ آیا تم لوگوں کے نمبر اسی فیصد سے زائد ہوئے۔ اگلے دن ہی تمہیں لے جاؤں گی۔" ناہید نے بچوں سے کہا۔ بچے بھی سنجیدہ ہوئے۔ یہ تو انہیں بھی معلوم تھا کہ ان کی ماں بات کی پکی اور قول کی سچی ہے جو کہتی ہے پورا کر کے دکھاتی ہے۔

"اوں ں آپ نانی اماں کے ہاں شیخوپورہ تو لے کر نہیں جاتیں لاہور کیسے لے کر جائیں گی؟" بارہ سالہ صدام بولا۔

"افوہ کہا ہے ناں کہ نانی اماں کے گھر اس لیے نہیں لے کر جاتی کہ ساری رقم تو وہاں آنے جانے میں خرچ ہو جائے گی پھر لاہور کیسے جائیں گے؟ بس اب تم لوگ پڑھنا شروع کر دو میرا وعدہ ہے ضرور لے کر جاؤں گی ان شاء اللہ۔"

☆☆☆

اس کے بعد حیرت انگیز طور پر سب ہی امتحانات کی تیاری میں سنجیدہ ہو گئے۔ اب تک دو مرتبہ لاہور جانا ہوا تھا ایک مرتبہ ننھے ماموں کی بارات کے ساتھ دوسری مرتبہ بھی کوئی تقریب ہی تھی۔ جس میں شرکت کے لیے جس گھر میں گئے اگلے دن اسی گھر سے واپسی ہوئی اب جب سے ناہید نے بتایا تھا کہ لاہور میں چڑیا گھر، مینار پاکستان کے علاوہ بھی سیر کے لیے جائیں گے تو بچوں کو واقعی سب کچھ بھول گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے وہ لاہور کی سیر پر نکل جاتے۔

چونکہ گھر میں آمدنی کم اخراجات زیادہ تھے تو بڑی مشکل سے بچت کر کر کے ناہید نے اتنی رقم جمع کر ہی لی تھی کہ بچوں کی ساری نہ سہی آدھی خواہشیں تو پوری ہو ہی جائیں۔

بچوں کو پڑھتا دیکھ کر دونوں خوش تھے بلی الصبح فجر کی نماز باجماعت پڑھنے سے دن کا آغاز ہوتا۔ ناہید ناشتہ بناتے ہوئے دس منٹ کے لیے لیپ ٹاپ پر قرآن مجید کی تلاوت اور ترجمہ ضرور سنتیں یہ ان کا اس گھر میں داخل ہونے سے ہی روزانہ کا معمول تھا، بچوں کے کان بھی کچھ نہ کچھ سنتے اور جس آیت کا ترجمہ سمجھ میں نہ آتا امی ناشتے کے دوران سمجھا دیتیں۔ اکیس دنوں کے اندر اندر سب کے امتحانات ختم ہو گئے رزلٹ بھی دو ہفتوں میں آنا تھا تو یہ دو ہفتے بہت بے چینی سے سو طرح کے سوالات کرتے ہوئے گزرے۔

"امی جان! کیا گینڈا بھی چڑیا گھر میں رہتا ہے؟"

"کیا مگرمچھ کے لیے وہاں پر چھوٹا سا سمندر ہوتا ہے۔"

"امی جان اگر سانپ ہمیں دیکھ کر جنگلے سے باہر آ گئے۔"

بس ایسے ہی بچوں کے بچکانہ سوالات سنتے اور جواب دیتے رزلٹ والی صبح طلوع ہو گئی۔

تعلیم اور علم کی قدر دان ناہید کے لیے یہ دن عید بقر عید سے بھی اہم ہوتا، نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ناہید کا خواب بچوں کو پڑھا لکھا کر اچھا شہری اور کامیاب زندگی تھی۔ ان دونوں کے لیے اچھی ملازمت اور بڑا عہدہ لازمی تھا پس وہ ان تین کونوں والے نصب العین کے لیے دن رات بچوں پر محنت کرتی تھی۔ بچوں کو رزلٹ والے دن اسکول بھیجنے سے پہلے اس نے صدقہ نکالا دو نفل ادا کیے اور اچھے رزلٹ پر شکرانے کی منت مانی۔

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ بچے اسکول پہنچے خلاف توقع سب کے نمبر نوے سے بیانوے فیصد تھے۔

سب خوش تھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بچے

زیادہ جوش میں ہیں جانے کے لیے یا ناہید، بچوں کے شان دار رزلٹ سن کر۔

اگلے دن کے لیے ناہید نے کباب، کٹلس بنا لیے تھے کیچپ، کولڈ ڈرنک بھی موجود تھیں، اللہ اللہ کر کے اگلی صبح کا سورج جانے کی نوید لے کر روشن ہوا۔ نمکو بسکٹ آلو کے پراٹھے بھی بنا کر رکھ لیے گئے، سات بجے رکشہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ بچوں نے فجر کی نماز کے بعد نیند پوری کرنے کے بجائے نہا کر نئے کپڑے پہنے۔ پالش سے چمکتے جوتے پہنے سب مسکراتے ہوئے رکشے میں بیٹھ گئے۔ ناہید کے شوہر نور عالم گجرانوالہ کی ایک فیکٹری میں ملازم تھے، انہیں تاکید کر دی گئی تھی کہ ایک دن کی چھٹی لے کر وہ بھی بچوں کی خوشی میں شامل ہوں جب وہ رکشہ میں بیٹھے تو ابو بھی گجرانوالہ سے چل چکے تھے۔

بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ کوچ ٹرمینل پر پہنچ چکے تھے، کوچ چلنے میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے ٹکٹ کے پیسے نکالنے کے لیے ناہید نے جونہی ہاتھ والا بیگ کھولنا چاہا تو انہیں موبائل فون کی مدھم سی رنگ ٹون سنائی دی بیگ کی زپ کھول کر دو چار مرتبہ ادھر ادھر ہاتھ مارا بالآخر موبائل فون مل ہی گیا لیکن ہاتھ میں لیتے لیتے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ کال کٹ چکی تھی۔ انہوں نے چشمہ نکالا آنکھوں پر لگا کر دیکھا تو ان کی بھابھی کا نام اسکرین پر ابھی بھی جگمگا رہا تھا۔ انہوں نے یا اللہ خیر کہہ کر ان کا نمبر ملایا۔

''السلام علیکم بھابھی جان! کیسی ہیں آپ؟ آج صبح صبح کیسے یاد کیا؟'' انہوں نے رسمی سا سوال کیا۔

''صبح صبح؟ بھلی مانس رات تین بجے سے ٹرین میں بیٹھے ہوئے تھے، اللہ اللہ کر کے پانچ بجے گاڑی چلی اب تو خیر ہم ریلوے اسٹیشن پر اتر چکے ہیں بس یہ پوچھنا تھا کہ یہ رکشہ والے بڑے چالاک ہوتے ہیں دوسرے شہر سے آنے والوں کو بہت کرایہ بتاتے ہیں بھلا تمہارے گھر کا یہاں سے کتنا کرایہ ہوتا ہے عام طور پر؟'' بھابھی جان نے پوچھا اور ناہید حیرت سے گم صم موبائل اسکرین کو تکے جا رہی تھی۔

''ارے کچھ تو بولو کہیں سوتے سے جگا تو نہیں دیا میں نے؟ بھئی کیا کروں تمہارے نالائق بھتیجوں سے وعدہ جو کر بیٹھی تھی کہ رزلٹ اچھا ہوا تو تمہاری اکلوتی پھوپھو ـــــ کے گھر لے جاؤں گی بچے تو مارے خوشی کے رات سوئے ہیں نہیں ٹرین کا وقت ساڑھے تین تھا، شوق میں دو گھنٹے پہلے ہی ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔''

ناہید کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے یہ نہیں کہ اسے بھابھی جان یا ان کے بچوں کی آمد بری لگی تھی۔

نہیں نہیں بالکل نہیں، بس کوتاہی یہ ہوئی کہ پروگرام بنا کر وہ میزبان کو تو بتا دیتیں، بغیر بتائے یا بغیر اجازت کے تو قرآن مجید میں بھی صاف منع کیا گیا ہے۔ بچوں کو صورت حال پتا چل چکی تھی۔

واپسی کے سفر میں چاروں بچوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ سب کو اس بات کا تو علم تھا کہ کہیں بھی جانے سے پہلے انہیں بتانا، دستک دینا لازم ہے کیا ممانی جان کو یا بچوں کو نہیں معلوم حالانکہ ممانی جان خود بھی اسلامیات کی ٹیچر ہیں اور بچے بھی ماشاء اللہ اچھے مہنگے اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں کیا انہیں بھی اس بات کا نہیں معلوم؟ اگر معلوم تھا تو بتایا کیوں نہیں؟؟ کیوں؟

سب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن دل بجھے ہوئے تھے اور قدم سستی سے گھسیٹتے ہوئے ٹرمینل سے باہر کی جانب، جہاں ان کی ممانی بچوں کے ساتھ ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

☆☆

عنبرین ابدال

رنگ باز

باہر نیلے آسمان پہ سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں نے قبضہ کر کے موسم کو خوب صورت بنا دیا تھا۔ وہ کھانا تیار کر چکی تھی، جب اچانک ہی اس کی ساس نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے سوجی کے حلوے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

"بہو! سب گھر پہ ہیں۔ اور موسم بھی اچھا ہے۔ سوجی کا حلوہ بھی بھون لو۔" ہانڈی کے ڈھکن کو اٹھاتے ہوئے اس کی ساس نے پاس کھڑی ماورا کی طرف دیکھا۔ جو ہاتھ میں ہرا دھنیا لیے سالن میں ڈالنے کے لیے کھڑی تھی۔ اس کی ساس نے ماورا کے سامنے اپنے ہاتھ کو بڑھایا۔ تو ماورا نے ہرے دھنیے کی پیالی کو اپنی ساس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور خود "جی اچھا" کہہ کر کیبنٹ سے حلوے کا سامان نکالنے لگی۔

ہرا دھنیا سالن میں ڈالنے کے بعد انہوں نے ہانڈی پر ڈھکن رکھا اور خود دروازے کی سمت بڑھ گئیں۔ ماورا نے پلٹ کر اپنی ساس کی جانب دیکھا، پھر ہولے سے سر جھٹک کر سوجی کے شاپر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"بہو! سلاد اور چٹنی بھی تیار ہے ناں۔" اس کی ساس پلٹ کر اس سے استفسار کر رہی تھیں۔

"جی تیار ہے۔" ماورا نے تابعداری سے اثبات میں سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ سب ہی گھر والے اس وقت لاؤنج میں محفل سجائے بیٹھے تھے۔ ویک اینڈ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی شادی شدہ نند بھی آئی ہوئی تھی۔

ماورا اب ایک طرف کڑاہی میں سوجی بھون رہی تھی تو دوسری طرف، اس نے چاشنی کو چولہے پہ چڑھا رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سوجی کے بھوننے کی دھیمی دھیمی خوشبو کچن سے نکل کر لاؤنج میں پھیلنے لگی تھی۔

"اتنا سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے جیسا قیصر کی مرتبہ کیا تھا اس بار بھی ویسا ہی کریں گے۔" صبا کے بولنے کی آواز کچن میں موجود ماورا کے کانوں سے ٹکرائی تو لاشعوری طور پر ماورا کے ہاتھ لمحے بھر کے لیے رکے تھے۔

"امی! انسان کو زندگی گزارنے کے گُر آتے ہوں۔ تو سمجھ لیں انسان کی زندگی آسان ہے۔ اب آپ خود ہی ماورا اور قیصر کو دیکھ لیں کیسی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سارے چونچلے تو بس شادی سے پہلے کے ہوتے ہیں۔ ایک بار شادی ہو جائے تو پھر نئی باتوں اور نئے رشتوں کو سنبھالنے میں ہی اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ پرانی باتیں خود بخود محو ہو جاتی ہیں۔

"رشتہ بہت اچھا ہے۔ نبیل کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بس جو باتیں ہم نے پہلے کی تھیں وہی باتیں اب کریں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" صبا نے جیسے حقیقہ بیگم کی ساری فکرمند کو لمحوں میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

"پھر بھی ہماری پہلے بھی رشتے داری ہے، یہ نا ہو کہ کوئی بدمزگی ہو جائے۔"

حقیقہ بیگم ابھی بھی تذبذب کا شکار تھیں۔ اس بار صبا کی مدد کے لیے قیصر نے اپنے فون کی اسکرین

ناولٹ

pklibrary.com

سے سر اٹھایا اور ماں کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے امی!" صبا یہ سارے رسم و رواج تو شادی سے پہلے اور رشتہ طے کرنے کے دوران ہوتے ہیں۔ ایک بار دلہن رخصت ہو کر گھر آجائے اور اسے تحفے میں وہی دیا جائے جو میں نے ماورا کو دیا تھا۔

یقین کریں بولنے کے لیے پیچھے کوئی لفظ بچتا ہی نہیں۔ آخر کو جو تحفہ میں نے ماورا کو دیا تھا۔ وہ کوئی عام تحفہ تو نہیں تھا۔"

قیصر نے فون ۔۔۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بات کے اختتام پہ، ہولے سے قہقہہ لگا کر ماں اور صبا کی طرف دیکھا۔ اور پھر محفل کشت زعفران بن گئی تھی۔ لیکن جانے کیوں کچن میں چولہے کے سامنے کھڑی ماورا کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی تھی۔ کچن اور لاؤنج سے متصل کھڑکی، ماورا کو لاؤنج میں بیٹھے افراد کے لہجوں اور لفظوں کے ساتھ ساتھ چہرے کے استہزائیہ تاثرات کو بخوبی دیکھنے میں مدد دے رہی تھی۔

دفعتاً حقیقہ بیگم کی نظر، لاؤنج کی کھڑکی سے ہوتی ہوئی کچن میں کھڑی ماورا کی طرف اٹھی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی تینوں اولادوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں ہی اپنی اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ایک بار پھر ٹلک شگاف قہقہے لگا رہے تھے۔

پھر وہی بلند آوازیں، اس نے آنکھوں کے سامنے چھائی دھند کو زور سے اپنے دوپٹے کے پلو سے رگڑا۔ اور ابلتے ہوئے چاشنی کے پانی کو جیسے ہی کڑاہی میں انڈیلا تو گرم گرم حلوے کے چھینٹے اڑ کر اس کے ہاتھ سے ٹکرائے تھے۔

"سی۔" ماروا نے جلدی سے دیگچی کو شیلف پہ رکھا اور اپنے سرخ ہوتے ہوئے ہاتھ کی جلد کو ڈبڈبائی نظروں سے دیکھا۔

لیکن یہ تکلیف تو اس تکلیف کے سامنے بہت کم تھی۔ جو وہ کچھ دیر پہلے محسوس کر رہی تھی۔ ماروا نے چولہے کی آنچ کو کم کیا اور چمچہ پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی تھی۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ تھی یا پھر آنسوؤں کے باعث دھند کا قصور تھا۔ چمچہ اس کے ہاتھ میں آنے کی بجائے زمین بوس ہو گیا تھا۔

"ارے ماورا کیا کر رہی ہو؟"

حقیقہ بیگم کہتے ہوئے کچن میں داخل ہوئیں۔ پھر ان کی نظر ماروا پہ پڑی جو زمین پہ پڑے چمچے کو اٹھا رہی تھی۔

"بس تم لڑکیوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔ ذرا سا ایکسٹرا کام کیا کہہ دیا تم نے تو....."

حقیقہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے آگے آئیں۔ اور زور سے چولہے بند کیا پھر جیسے ہی خشمگیں نظروں سے ماورا کی طرف دیکھا۔ تو کی ان کی نظر اس کے سرخ ہاتھ پر پڑی تو ان کی بڑبڑاہٹ فوراً ہی بند ہو گئی۔

"پھر ہاتھ جلا لیا۔ کوئی تو کام ڈھنگ سے اور دھیان سے کر لیا کرو ماورا۔"

کہتے ہوئے حقیقہ بیگم پلیٹیں اور چمچہ میں گھی لے آئیں۔ خود اپنے ہاتھ ماورا کے جلے ہوئے ہاتھ پہ گھی لگایا۔ جانے کیوں آنسو آنکھوں سے قطار در قطار نکلے چلے آرہے تھے۔

"ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ تم تو بچوں کی طرح رونے ہی لگ گئیں۔" حقیقہ بیگم نے مسکرا کر کہا اور روتی ہوئی ماروا نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی بے تاثر سی نگاہوں سے حقیقہ بیگم کو عجیب سا احساس ہوا تھا۔

"تم ایسا کرو، جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لو۔ میں کھانا نکال لوں گی۔"

حقیقہ بیگم نے دل ہی دل میں صبا کو ہزار صلواتیں سناتے ہوئے عام سے لہجے میں ماورا سے کہا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید ماورا ان کی بات نہیں مانتی۔ لیکن اس وقت وہ خود بھی ان سب کی نظروں کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی تھی یا شاید وہ اس وقت ان سب کی شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی وہ سر کو اثبات میں ہلاتے حقیقہ بیگم کے سامنے

سے ہٹ کر کچن کا دروازہ پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں آ کر گرنے کے انداز میں اپنے بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فریم میں موجود اپنی اور قیصر کی شادی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے ماورا سوچے جا رہی تھی۔

"انسان کو ٹرکس آنی چاہیے۔ تو کیا نہیں ہو سکتا۔" یہ جملہ قیصر کا من پسند جملہ تھا۔ جسے وہ دن میں کئی بار بولتا تھا۔

"ٹرکس میں اور دھوکہ دینے میں بہت فرق ہوتا ہے مسٹر قیصر..... یہ ٹرکس نہیں یہ وہ دھوکہ ہے جو ہم کسی اور کو نہیں بلکہ خود کو عمر بھر دیتے رہتے ہیں۔

اس دھوکہ دہی کو اپنی چالاکی سمجھتے ہیں۔ یہ گر تب تک کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جب تک کوئی ہمیں اندر سے جھنجھوڑ نہ دے۔ اور جس دن ایسا ہوتا ہے اس دن سے ایک بار ضمیر پہ محسوس ہونے لگتا ہے اور پھر ہر بار ہر ساعت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پہ بار کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور ضمیر پہ بوجھ کو لیے جینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت زیادہ....."

ماورا بڑبڑا رہی تھی اور پھر پشت کے مل بیڈ پر گر گئی تھی۔

ابھی کون سا برسوں بیت چکے تھے جو وہ سب بھول جاتی۔ نہیں جو کچھ ہوا تھا اس کے لیے برسوں بھی کم تھے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے، اس کے بالوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ماضی کا ہر لمحہ اب مجسم ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے آن کر ٹھہر رہا تھا۔

کتنی ہی بار اس نے خود کو ان لمحوں کی قید سے آزاد کروانے کی کوشش کی تھی..... لیکن ماورا نے بے چینی سے کروٹ لی تھی اور پاس پڑے تکیے کو اٹھا کر اپنے چہرے پہ رکھ لیا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ وہ سب، جب اس دن وہ کالج سے گھر لوٹی تھی اور۔

☆☆☆

"السلام علیکم!" گھر میں داخل ہوتے ہی ماورا نے اونچی آواز میں سلام کیا اور لاؤنج کے صوفے پہ اپنے کندھے پہ لٹکتے ہوئے بیگ کو، اچھال کر گرایا۔ اور خود بھی دھم کے انداز میں صوفے پہ بیٹھ کر اپنی گردن کو، صوفے کی بیک پہ ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچن سے نکلتی آصفہ بیگم کو تو مانو بیٹی کے انداز دیکھ کر غصہ آ گیا تھا۔

"ماروا!" تیکھی انداز میں کہتی ہوئی آصفہ بیگم بیٹی کے قریب آئی تھیں۔

"سچ میں امی! میں نے سلام کیا تھا۔ لیکن شاید آپ کچن میں تھیں تو آپ نے....."

ماں کو شعلہ بار نظروں سے، اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو ماورا جلدی سے بول اٹھی تھی۔

لیکن پھر اگلے ہی لمحے، ماں کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جلدی سے اپنے اوندھے پڑے بیگ کو سمیٹ کر اپنے پاس کر لیا۔

"پتا نہیں تم کب بڑی ہو گی ماروا۔" آصفہ بیگم کے لہجے میں جہاں بھر کی بے چارگی در آئی تھی۔

"امی! اتنی بڑی تو ہو گئی ہوں۔ ابھی بھی آپ کہہ رہی ہیں۔ میں کب بڑی ہوں گی۔" کہتے ہوئے ماورا ہنسنے لگی تھی۔ اسے یوں ہنستا دیکھ کر آصفہ بیگم کے لب بھی مسکرانے لگے تھے۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتیں۔" انہوں نے ایک محبت بھری نظر بیٹی کے چہرے پہ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ ماورا ان کی اس بات کا جواب دیتی کمرے سے نکلتے ہوئے امان صاحب کے کانوں سے اپنی شریک حیات کا فقرہ ٹکرایا تھا۔

"ارے بھئی بیگم میری بیٹی کے معاملے میں زیادتی مت کیا کریں۔ میری اتنی پیاری اور فرماں بردار بیٹی ہے اور آپ ہیں کہ اسے ہر وقت ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔" امان صاحب نے کہہ کر ماورا کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تو ماورا جلدی سے بھاگ کر باپ کے گلے لگ گئی تھی۔

"بس آپ کے اسی لاڈ پیار کا نتیجہ ہے جو میڈم کی زندگی میں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں۔" آصفہ بیگم کو ہمیشہ کی طرح امان صاحب کے بے وقت لاڈ پہ غصہ آیا تھا۔

"اچھا اب ہمیں کھانا ملے گا یا پھر ہمیں ڈائٹ پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔" اس سے پہلے کہ آصفہ بیگم کچھ بھی کہنے کے لیے اپنا منہ کھولتیں۔ امان صاحب نے کھانا لگانے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

"لگا رہی ہوں میں کھانا اور اپنی اس لاڈلی کو بھی کہہ دیں یونی فارم چینج کر کے فریش ہو کر آجائے۔" آصفہ بیگم نے امان صاحب کے کان میں ٹھسر پھسر کرتی ماورا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور خود کچن کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

"شکر ہے پاپا۔ آپ ٹھیک ٹائم پہ آگئے۔ ورنہ تو آپ کی ہٹلر بیگم نے مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر ہی مار دینا تھا۔" آصفہ بیگم کے نظر سے ہٹتے ہی ماورا نے سکون کا سانس لیا۔ امان صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"اچھا اب باقی باتیں بعد میں جلدی سے فریش ہو کر آجاؤ۔ ورنہ اپنی ممی کا پتا ہے ناں۔"

امان صاحب نے اسے ڈرایا تو وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

زندگی سبک روی سے گزر رہی تھی۔ جب فیصل بھائی کے سسرال ـــــ سے ایک رشتہ ماورا کے لیے آیا تھا۔ امان صاحب نے رشتے کی بات کرنے سے پہلے ہی فیصل بھائی کو منع کر دیا تھا۔

"بھئی ماورا بہت چھوٹی ہے۔ اور ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس لیے تم نمرئی سے معذرت کر لو۔"

امان صاحب نے بہو کا نام لیتے ہوئے کہا۔ فیصل اپنی فیملی کے ہمراہ اومان میں مقیم تھا۔

"لیکن بابا! رشتہ بہت اچھا ہے۔ نمرئی کی خالہ نے خود نمرئی سے بات کی ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے اور....." اس سے پہلے کہ فیصل اپنی بات مکمل کرتا۔ امان صاحب نے اس کی بات کو بیچ سے کاٹ دیا تھا۔

"بیٹا کہا ہے ناں۔ ابھی ماورا بہت چھوٹی ہے۔" امان صاحب کے کہنے پہ فیصل نے خاموش ہونا ہی بہتر سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں وہ یہ بات ماں سے کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

"رشتہ بہت اچھا ہے امی! ہماری ماورا اپنے پاس رہے گی۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ نمرئی کی سگی خالہ ہیں۔ آپ پاپا کو سمجھائیں۔ گھر بلانے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ آپ انہیں چائے پہ انوائٹ کر لیں۔ اگر آپ کو اور پاپا کو وہ لوگ اچھے لگیں۔ تو بات آگے بڑھائیں گے۔ نہیں تو انکار کر دیں گے۔" فیصل نے مدبرانہ انداز میں ماں سے کہا تھا۔

"بیٹا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن....."

"امی! ماورا کا خاندان میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یا تو سب عمر میں بہت بڑے ہیں۔ جن کی شادیاں ہو چکی ہیں یا پھر سب بہت چھوٹے ہیں۔ حقیقت پسندی سے بات کریں گے تب ہی اچھا ہوگا۔ ابھی تو چھوٹی چھوٹی ہی کہہ کر ٹائم گزار دیں اور پھر بعد میں پریشان ہوتے پھریں گے۔ آپ پلیز پاپا سے بات کریں۔" فیصل کی بات میں دم تھا۔ آصفہ بیگم خود بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ اور اگر رشتہ اچھا ہے تو پہلے رشتہ طے کرنے اور منگنی کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ شادی ہم ماورا کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد بھی کر سکتے ہیں۔" آصفہ بیگم بیٹے کی بات سے متفق نظر آرہی تھیں۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں اور ایک دو دن میں تمہیں بتاتی ہوں۔" آصفہ بیگم نے کہتے ہوئے گفتگو کو سمیٹا تھا اور پھر فیصل سے بہو اور پوتے کی بات کرنے کے بعد، انہوں نے کال بند کر دی تھی۔

☆☆☆

"وہ لوگ ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں۔ بلانے

میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ اور پھر فیصل ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ اکثر والدین چھوٹی ہے چھوٹی ہے کہہ کر اپنی بیٹیوں کے لیے آنے والے رشتوں کو انکار کردیتے ہیں۔ اور پھر بعد میں خود ہی سب سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔"

آصفہ بیگم نے شوہر کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں کہا اور خود بھی ان کے سامنے پڑے صوفے پہ آبیٹھی تھیں۔

"ابھی ماورا تھرڈ ایئر میں ہے۔ اور....." امان صاحب نے ذرا سا جھک کر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ بچے جتنے بھی بڑے ہوجائیں ماں باپ کی نظروں میں وہ بچے ہی رہتے ہیں۔ ماشاءاللہ ہمارا بیٹا خود اب ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن ہم بھی فیصل کے بارے میں بات کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ فیصل تو ابھی بچہ ہے۔ یہی تو ماں باپ کا دل اور فطرت ہوتی ہے۔ بیٹیوں کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ماورا کے بارے میں تو....."

آصفہ بیگم بات کرتے کرتے رکی تھیں۔ بیٹی کے ذکر پہ محبت سے ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

"یوں لگتا ہے ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب نرس نے ننھی سی پری کو میری گود میں دیا تھا۔ جب ہماری بیٹی نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے۔ یہ نہ کچھ دنوں کی بات ہے اور نہ ہی چند گھنٹوں پہلے کی۔

وقت کے تھال میں لمحے سکے بن کر کرتے ہوئے دن سالوں میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ ہماری بیٹی انیس برس کی ہوچکی ہے۔ گزرتا وقت تیزی سے گزرا یا پھر پلک جھپکتے یہ نہیں پتا مجھے، بس یہ پتا ہے انیس برس بیت چکے ہیں۔

ہماری بیٹی کو ہمارے آنگن میں اترے اور ریت رواج کے مطابق، ہماری مینا کی رخصتی کا وقت قریب ہے۔ چاہے دو سال بعد ہی کیوں نہ ہو تو کیا بہتر نہیں بیٹی کے لیے آنے والے پہلے رشتے کو بنا دیکھے انکار کرنے کے بجائے دیکھ لیا جائے۔"

آصفہ بیگم نے اپنی بات کے اختتام پہ امان صاحب کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں موجود کپ کو لبوں سے لگانا بھول کر اپنی شریک حیات کی باتیں سن رہے تھے۔

"آں ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔" امان صاحب ان کے پکارنے پہ چونکے تھے اور اب آصفہ بیگم کی باتوں سے متفق ہوکر سر اثبات میں ہلا رہے تھے۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں رات میں ہی نمرٹی سے کہتی ہوں اپنی خالہ سے کہہ دے۔ وہ جب چاہیں ہمارے گھر آسکتی ہیں۔"

آصفہ بیگم نے کہتے ہوئے اپنے سامنے رکھے چائے ٹھنڈی ہوکر اپنا اصل ذائقہ کھوچکی تھی۔

"یہ چائے تو ٹھنڈی ہوچکی ہے۔"

آصفہ بیگم نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کپ کی طرف اشارہ کیا تو امان صاحب نے بھی اپنا کپ ٹیبل پر واپس رکھ دیا تھا۔

"میں نئی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

آصفہ بیگم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا امان صاحب نے سر کو ہلانے پہ اکتفا کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھے اخبار کو پھیلا کر اپنی نظروں کے سامنے کرلیا تھا۔

☆☆☆

نمرٹی کی خالہ اپنی بیٹی اور نمرٹی کی والدہ کے ہمراہ، ان کے گھر اسی اتوار کو پہنچ چکی تھیں۔

"میں رک نہیں پائی جیسے ہی نمرٹی نے مجھے آپ کی طرف سے گرین سگنل کا اشارہ دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنی بیٹی کو اس کے سسرال سے آنے کا پیغام بھجوادیا تھا۔"

وہ خاتون کہتے ہوئے آصفہ بیگم کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ آصفہ بیگم نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پھر بولیں۔

”رشتہ ہونا یا نہ ہونا یہ تو قسمت کی بات ہے۔ باقی تو سب چلتا ہی رہتا ہے۔“

”یہ بات تو آپ نے ٹھیک کہی۔ رشتہ ہونا تو مقدر کی بات ہے لیکن مجھے یقین ہے۔ میرے بیٹے سے ملنے کے بعد آپ انکار نہیں کر پائیں گے۔ ماشاء اللہ سے میرا بیٹا پڑھا لکھا اور برسرروزگار ہے۔ شکل وصورت میں خوب صورت ہے یعنی آپ کی بیٹی کے لحاظ سے رشتہ مناسب ہے۔

آپ چاہے جتنا مرضی سوچنے اور سمجھنے کا ٹائم لے لیں۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ لیکن بس اپنی ماورا کو مجھے دے دیں۔ مجھے ماورا بہت اچھی لگتی ہے۔“

وہ خاتون ماورا کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ اور پھر اس کے بعد ہی عتیقہ بیگم نے گھر کی دہلیز پکڑ لی تھی۔ اور پھر عتیقہ بیگم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

قیصر میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پانچ ماہ کے دوران آصفہ بیگم اور امان صاحب نے ہر لحاظ سے جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی عتیقہ بیگم کو رشتے کے لیے ہاں کہی تھی۔

ماورا جو اس سارے عرصے میں سوائے ایک بار عتیقہ بیگم کے سامنے آنے اور ہر بات سے انجان اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ آصفہ بیگم کے بتانے پہ ٹپٹاسی گئی تھی۔

”رشتہ، شادی۔“ ماورا کو ابھی ان میں سے کسی بھی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اب ناراضی بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تمہارے پاپا اور بھائی نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ قیصر ہر لحاظ سے تمہارے لیے پرفیکٹ ہے۔ اور تم دیکھنا تم اس کے ساتھ بہت خوش رہوگی۔“

آصفہ بیگم نے بیٹی کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے مستقبل کی پیش گوئی کی لیکن ماورا تو رونے لگی گئی۔ اسے یوں روتا دیکھ کر آصفہ بیگم کے دل میں کتنے ہی خدشوں نے سر اٹھایا۔

”ماورا کیا تم کسی اور کو پسند......“ آصفہ بیگم اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پائی تھیں کہ ماورا نے زور زور سے اپنے سر کو نفی کے انداز میں ہلایا تھا۔

”تو پھر......“ آصفہ کو بیٹی کے رویے سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

”میں آپ کو اور پاپا کو چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جاؤں گی۔“ ماورا کہتے ہوئے ماں کے گلے لگی تھی۔

”کیا سچ میں یہی بات ہے۔“

”سچ میں امی۔“ ماروا نے منہ بناتے ہوئے ناراضی سے کہا۔ اس بار آصفہ بیگم نے منہ بنا کر بیٹھی ماورا کی چٹاچٹ بلائیں لے ڈالی تھیں اور پھر فیصل اور نمرئی کے آنے کے بعد ہی رشتے کو باقاعدہ طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“ عتیقہ بیگم نے کھوئے والے رس گلے کو منہ میں ڈالتے ہوئے وہاں پہ موجود سب ہی لوگوں سے کہا تھا۔

”آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو۔“ آصفہ بیگم نے جواباً کہا۔

”تو بس ٹھیک ہے ابھی منگنی کی ڈیٹ بھی طے کر لیتے ہیں۔“ فیصل نے کہتے ہوئے عتیقہ بیگم کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ واضح طور پر مدھم ہوئی تھی۔

”منگنی جیسے فنکشن کرنے میں ٹائم اور پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نہیں میرا مطلب ہے اسلام میں تو بس نکاح کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ دکھاوے کے رسم ورواج تو ہم انسانوں نے بنا رکھے ہیں۔ انسان کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔

ماروا ہماری بیٹی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے عتیقہ بیگم نے اپنے پاس بیٹھی ماورا کو بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا۔

اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر اپنے ہاتھ میں موجود، انگوٹھی اتار کر ماورا کی انگلی میں پہنا دی تھی۔

pklibrary.com

ہاتھ کی دوسری انگلی میں رنگ پہنتے ہی گھوم گئی تھی۔

"لیجیے آپ کی تسلی کے لیے ہم نے باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کردی ہے۔"

حقیقہ بیگم نے کہتے ہوئے سامنے پلیٹ میں رکھی برفی ماورا کو کھلاتے ہوئے کہا اور اپنی طرف حیرت سے دیکھتی ہوئی آصفہ اور امان صاحب کی طرف دیکھا۔ جنہیں اس سب کی توقع ہی کہاں تھی۔

"بات اصل میں یہ ہے، میں ایسی فضول خرچیوں میں اور دکھاوے کے طور پر منعقد کیے گئے فنکشنز سے کہیں زیادہ لڑکی کے اصل حق یعنی حق مہر پر توجہ دوں گی۔ میری بھی بیٹی ہے اور میری طرح ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو۔

اللہ نہ کرے ہمارے رشتے میں کوئی بھی بدمزگی ہو۔ لیکن پھر بھی میں اپنی بہو کے مستقبل کی سکیورٹی پہ زیادہ توجہ دوں گی۔ ماورا کے حق مہر کی بات کریں مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ کیا ایسی فضول خرچیوں پہ ہم اپنی انرجی ویسٹ کریں۔"

حقیقہ بیگم کے لہجے میں حلاوت تھی۔ مٹھاس تھی۔ آصفہ بیگم اور امان صاحب ہی نہیں وہاں پہ موجود دوسرے رشتہ دار بھی حیرانی سے حقیقہ بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسے لوگ بھلا دنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ جو اس سوچ کے مالک ہوتے ہوں۔

یہاں تو لوگوں کو حق مہر پہ ناراض ہوکر باراتوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ اور حقیقہ بیگم خود اپنے منہ سے..... ماورا کے ماموں، خالہ اور چچا کے چہروں پر خوشی ہی خوشی تھی۔

کھانا انتہائی خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے، دور شروع ہوا۔ ہنسی باتوں اور قہقہوں کی آواز اندر کمرے میں موجود ماروا کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ جو پچھلے دو گھنٹے سے اپنا سر جھکائے اپنے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کو بے دھیانی میں گھمائے جا رہی تھی۔ وہ بیک وقت دو کیفیات کا شکار

وہ خوش تھی کہ سب اتنا اچھا رشتہ ملنے پر بے حد خوش ہیں۔ لیکن ہر لڑکی کی طرح شادی کو لے کر اس کے بہت سارے ارمان تھے۔ اور یہاں تو پہلے ہی مرحلے کو اسلام کی تعلیمات اور کفایت شعاری کی بات کر کے۔ ماورا بے چینی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ڈھلتی شام کو، اب رات میں مدغم ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"شاید میں کچھ زیادہ ہی منفی سوچ رہی ہوں۔ اتنے اچھے موقع پہ مجھے اداس کردینے والی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ اچھے گمان بہت کمال کا کام کرتے ہیں۔"

ماورا بڑبڑاتے ہوئے پلٹی اور اپنی دراز میں رکھی قیصر کی تصویر کو نکال کر دیکھنے لگی تھی۔ اس نے استحقاق بھری نظر قیصر کے چہرے پر ڈالی تو یوں لگا تصور میں موجود قیصر کی آنکھوں کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

ماورا نے اپنے نچلے ہونٹ کو اپنے دانتوں تلے دبایا، پھر شرما کر قیصر کی تصویر کو دراز میں رکھ کر جیسے ہی پلٹی۔ اپنے عقب میں کھڑی نمرئ بھابھی کو دیکھ کر سٹپٹا ہی گئی۔

"اچھا جی ابھی سے یہ حال ہے کہ چھپ چھپ کر موصوف کو دیکھا جا رہا ہے۔" نمرئ بھابھی نے ماورا کی لرزتی پلکوں تلے براؤن آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ تو ماورا نے شرما کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپالیا۔

"یہی نہیں وہاں بھی یہی حال ہے۔ یقین کرو قیصر نے میرا سب کے بیچ بیٹھنا محال کردیا تھا۔ یہ لو تم اس سے بات کرلو۔" نمرئ بھابھی نے کہتے ہوئے اپنا فون ماورا کی سمت بڑھایا۔

"نن..... نہیں بھابھی۔" ماورا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ لیکن تب تک نمرئ قیصر کو کال ملا چکی تھی۔

ابھی پہلی بیل بھی پوری نہیں گئی تھی کہ دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا تھا۔

"چلو جی تم دونوں نے تو لگتا ہے اب پہلی محبتوں کو پیچھے چھوڑ دینا ہے۔"

نمرئی نے قیصر کے فوراً ہی کال پک کرنے پہ خفیف سا طنز کیا تھا۔ تو جواب میں قیصر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

اس کے ہنسنے کی آواز اسپیکر سے نکل کر نمرئی کے پاس کھڑی ماورا کے کانوں سے بھی ٹکرائی تھی۔ ماورا کا دل دھڑکا، رخسار گلال ہوئے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی نمرئی کے کان سے لگا بھی چکی تھی۔

"چلو تم قیصر سے بات کرلو میں باہر مہمانوں کے پاس جارہی ہوں۔" نمرئی عجلت بھرے لہجے میں کہہ وہاں سے جاچکی تھی۔ تو ماورا اپنے نام پہ چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جہاں قیصر اس کا نام پکار رہا تھا۔ دل دھڑکنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے قیصر کی باتیں سن رہی تھی۔

وہ بس بیچ میں "تم میری بات سن رہی ہو ناں۔" کہہ کر ماورا سے پوچھتا اور اس کے ہلکی سی آواز میں کہے گئے "جی۔" کو سن کر پھر سے باتوں میں مصروف ہوجاتا۔ اسے بولنے کا بہت شوق تھا۔ اور ماورا کو اسے بولتے سننا اچھا بھی لگ رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے نمرئی کی بارات والے دن دیکھا تھا۔ اور پہلی ہی نظر میں وہ اس کی محبت کا شکار ہوگیا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا گھر آنے کے بعد، میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ شادی کرنی ہے تو بس اسی لڑکی سے کرنی ہے۔ پھر اس کی ماں کیسے نمرئی سے اس ماہ رشتے کی بات کرتی رہی تھیں۔ لیکن نمرئی تذبذب کا شکار تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ رشتہ ہونے کے بعد اس کے رشتے میں کوئی بدمزگی نہ ہوجائے۔ آخر کو فیصل کی اکلوتی اور چھوٹی بہن کا معاملہ ہے۔ لیکن پھر بار بار کہنے پہ نمرئی نے فیصل سے بات کر ہی لی تھی۔ دو بھائی، ایک بہن اور ماں والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ فیصل کے لیے ماورا کے لیے سب سے زیادہ پلس پوائنٹ چھوٹی فیملی تھی۔ بہن کی شادی ہوچکی تھی۔ گھر میں دو بھائی اور ماں، اور پھر قیصر بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ اور یوں محنت کے بعد بالآخر ہمارا رشتہ ہو ہی گیا۔

قیصر کہہ کر ہنسا تو ماورا بھی مسکرادی تھی۔ مزید چند منٹ بات کرنے کے بعد قیصر نے کال بند کردی تھی۔ یہ شاید قیصر سے بات کرنے کا اثر تھا۔ ماورا جو کچھ دیر پہلے تک عجیب سی کیفیات میں گھری تھی۔ اب مکمل طور پر ریلیکس ہوکر دل سے مسکرائی تو پھر مسکراتی ہی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

"اللہ سب ہی بیٹیوں کے نصیب اپنی ماورا کے جیسے کرے۔" مہمانوں کے رخصت ہوجانے کے بعد ماورا کی ممانی نے دل سے دعا دی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ نکاح نامے میں بیس تولے سونا۔ اور وہ بھی لڑکی کے حق مہر کے طور پر۔ آج کے دور میں ایسا کون سوچتا اور کرتا ہے۔" آصفہ بیگم کی بھابھی تو ابھی تک عقیقہ بیگم کی اس بات پہ انگشت بدنداں تھیں۔

"اللہ ماورا کے نصیب اچھے کرے۔" ماموں نے کہتے ہوئے اپنی شریک حیات کو گھورا تھا۔

"ہاں، ہاں اللہ ماورا کو ہر بری نظر سے بچائے۔ میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" فریحہ بیگم نے کھسیا کر کہا اور ایک بار پھر آصفہ اور امان صاحب کو مبارک باد دینے لگی تھیں۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ اپنے گھر والوں کو خوش دیکھ کر ماورا بھی بے حد خوش تھی۔ شادی کی تاریخ ماروا کے فائنل ایگزامز کے بعد رکھی گئی تھی۔ یعنی ابھی پورا ڈیڑھ سال باقی تھا۔

"ہم اچھی طرح سے ماورا کی شادی کی تیاریاں کرسکتے ہیں۔ اگر عقیقہ آنٹی بیس تولے سونا حق مہر میں لکھوا رہی ہیں۔ تو ہمیں بھی شادی کی تمام تیاریاں شایان شان طریقے سے کرنی چاہئیں۔" فیصل نے ماں اور باپ کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن بیس تولے زیور

کی بات مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ٹھیک ہے فیصل کی فیملی اچھی خاصی ہے لیکن۔" امان صاحب نے بات کو ادھورا چھوڑا تھا۔

"آپ کو تو بلاوجہ وہم کرنے کی عادت ہے۔ انہوں نے کون سا یہ بات ہمارے سامنے کی ہے۔ بلکہ ہمارے پورے خاندان کے علاوہ اپنے خاندان اور داماد کے سامنے یہ بات کی ہے۔ اور عتیقہ بیگم نے کہا ہے۔ نکاح نامے پہ زیور منتقل لکھوائیں گے۔ یہ بات بھی انہوں نے خود کی ہے۔ ہم نے تو ان سے ایسی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی۔" آصفہ بیگم کو امان صاحب کی فکر مندی ایک آنکھ بھی نہیں بھائی تھی۔

اسی لیے قدرے تیز لہجے میں بولتی چلی گئیں۔

"ہاں امی! ٹھیک کہہ رہی ہیں بابا۔ ہمیں کسی بھی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔" فیصل نے ماں کی بات میں ہاں میں ہاں ملائی تو امان صاحب کندھے اچکا کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

ماورا کالج سے گھر واپس آئی تھی۔ تو آصفہ بیگم، رضیہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔

"کیا ہوا کوئی مہمان آرہا ہے۔" ماورا نے سجی ہوئی ٹرالی کی طرف دیکھتے ہوئے ماں سے سوال کیا۔

"مہمان آرہے ہیں۔ بلکہ آگئے ہیں تمہارے سسرال والے آئے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔" آصفہ بیگم نے مصروف سے لہجے میں بیٹی سے کہا تھا۔

"یہ لوگ پھر آگئے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو فیصل بھائی اور نمرہ بھابھی سے ملنے آئے تھے۔ جب وہ واپس جارہے تھے۔ آج پھر......" جانے کیوں ماورا جی بھر کر بدمزہ ہوئی تھی۔

"ماورا ......" آصفہ بیگم نے بیٹی کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"میں نے تمہاری ایسی تربیت تو نہیں کی ہے ماورا کہ تم کسی کے آنے پہ بھی ایسے ری ایکٹ کرو۔ وہ بھی اپنے سسرال والوں کے آنے پہ۔"

آصفہ بیگم نے کہا تو ماورا نے فوراً ہی اپنے دائیں کان کو سوری کے انداز میں پکڑا پھر جلدی سے پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ ماورا نے فریش ہونے کے بعد کپڑے تبدیل کیے۔ ابھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں کو سنوار رہی تھی جب رضیہ اسے بلانے کے لیے کمرے میں آئی تھی۔

"اچھا میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" ماورا نے کہہ کر اپنے لمبے بالوں کو باندھا اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ بیڈ پہ پڑے اپنے دوپٹے کو اٹھا کر سر پہ سیٹ کیا اور کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم!" ماورا ڈرائنگ روم کے دروازے پہ ہی جھجک کر رکی تھی۔

"وعلیکم السلام آؤ آؤ وہیں کیوں رک گئیں۔ میرے پاس آکر بیٹھو۔"

عتیقہ بیگم نے کہتے ہوئے اپنے دونوں بازوؤں کو بہو کے لیے پھیلا دیا تھا۔ ماورا ہر بار ہی ان کے ایسے محبت بھرے مظاہرے پہ جھجک سی جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ماں کے اشارہ کرنے پر عتیقہ بیگم اور صبا کے درمیان آبیٹھی تھی۔ چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد عتیقہ بیگم نے چائے کا کپ سامنے ٹیبل پہ رکھا اور آصفہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"وہ میں اس لیے آئی تھی کہ میں نے جو رنگ ماورا کو پہنائی تھی وہ اس کے ہاتھ کی انگلی میں بہت کھلی ہے وہ رنگ آپ مجھے واپس کردیں۔ میں ماورا کو دوسری رنگ دینا چاہتی ہوں تاکہ بچی رنگ ہاتھ میں پہنے تو رکھے، کیا فائدہ ہے ایسی رنگ کا جو انگلی میں آئے ناں اور دراز کی زینت بن کر پڑی رہے۔ میری بیٹی اپنے ہاتھ میں رنگ پہنے گی تو خوش تو ہوگی ناں۔" عتیقہ بیگم نے کہتے ہوئے پاس بیٹھی مارو اکو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

"ماورا! جاؤ آنٹی کو رنگ لا کر دے دو۔" آصفہ بیگم نے ماورا سے کہا۔

pklibrary.com

یاورا اپنی جگہ سے اٹھی اور عتیقہ بیگم کی انگوٹھی لاکر ان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے اس سے بھی پیاری رنگ لے کر آؤں گی۔"

عتیقہ بیگم نے ہتھیلی پہ ہی رنگ کو اپنی انگلی میں سجاتے ہوئے ماورا سے کہا۔ تو ماورا مسکرا کر سر کو جھکا کر رہ گئی تھی۔ دس، پندرہ منٹ کے بعد عتیقہ بیگم اپنی بیٹی کے ہمراہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ارے اتنی جلدی کیا ہے۔ بیٹھیے ناں۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔" آصفہ بیگم نے آداب میزبانی نبھائے تھے۔

"نہیں نہیں مجھے بہت کام ہے۔ ابھی سنار کے پاس بھی جانا ہے اور بھی چھوٹے موٹے بہت سے کام ہیں۔ کھانا پھر کبھی سہی۔ نہیں بلکہ آپ بھی امان صاحب کے ساتھ ہمارے گھر چکر لگائیے گا۔ قیصر تو آپ لوگوں کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ آپ کے آنے سے بہت خوش ہوتا ہے۔" عتیقہ بیگم نے آگے بڑھ کر آصفہ بیگم سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور۔" داماد کے ذکر پہ آصفہ بیگم خوشی سے نہال ہوئی تھیں۔ وہ مہمان کو رخصت کرنے کے بعد واپس آئیں تو رضیہ کچن صاف کرتی ہوئی نکلی۔

"بیگم صاحبہ ایک بات کہوں۔ آپ برا مت منانا۔" رضیہ نے کہا۔

"ہاں بولو۔" آصفہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنی گردن پہ ہاتھ رکھا۔ انہیں اپنی گردن کے پٹھے میں کھنچاؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ جہاں آپ نے ماورا بی بی کا رشتہ طے کیا ہے ناں۔ یہ لوگ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔" رضیہ کہتے ہوئے آصفہ بیگم کے پاس قالین پہ آبیٹھی تھی۔

"نہیں مطلب آپ خود سوچیں، کنجوسی کی حد ہی ہے۔ ہونے والی بہو کی انگلی میں سب کے سامنے اپنی انگوٹھی پہنادی تھی۔ اور آج وہ لینے کے لیے بھی آ گئیں اور اگر اتنی ہی ضروری تھی ان کے لیے اپنی انگوٹھی تو پہلے ماورا کے لیے رنگ خریدتی۔

"اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی پہنا کر پھر اپنی انگوٹھی مانگ لیتیں۔ اپنی انگوٹھی بھی لے گئیں۔" رضیہ نے جانے کیوں بات کے آخرے حصے کو منہ ہی منہ میں بدبدانا ضروری سمجھا تھا۔

آصفہ بیگم کے دل میں بھی یہ بات آئی تو تھی وہ بھی الجھی تھیں۔

"جہاں رشتہ داری ہو۔ وہاں چیزوں کو کیا اہمیت دینی۔" آصفہ بیگم نے رضیہ سے کہا تھا۔ مگر دیکھا ڈرائنگ روم کے دروازے پہ کھڑی ماروا کی طرف تھا۔

سونے چاندی سے بیٹیاں محبت اور عزت سے اپنے گھروں میں بستی ہوتیں تو، سارے امیر لوگوں کی بیٹیاں ہنسی خوشی اپنے گھروں میں رہتیں۔

دلوں میں گنجائش اور محبت ہو تو چھوٹی چھوٹی باتیں خود بخود اگنور ہو جایا کرتی ہیں اور پھر عتیقہ بیگم کہہ کر گئی ہیں۔ وہ سنار کی دکان پہ ہی جا رہی ہیں۔

اس کا مطلب تو یہی ہے ناں۔ وہ خود ماروا کو کہہ گئیں ہیں کہ اس کے لیے رنگ لینی ہے تو وہ ہی لینے گئی ہوں گی۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو یوں سر پہ سوار کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اور ویسے بھی رضیہ تم اپنا دماغ ایسی باتوں میں مت چلایا کرو۔ بلکہ اپنے ہاتھوں کو چلایا کرو۔ چلو جلدی سے جا کر ماورا کے لیے روٹی اتار دو۔ میری بچی صبح ناشتا بھی نہیں کر کے گئی تھی۔"

آصفہ بیگم نے کہتے ہوئے دروازے میں کھڑی ماورا کے لیے اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا دیا تھا۔ ماورا بنا کچھ کہے ماں کی مہربان بانہوں میں سما گئی تھی۔

پھر کتنے ہی دن آصفہ بیگم، عتیقہ بیگم کی آمد کی منتظر رہی تھیں۔ یہ بات تو ان کے دل میں بھی تھی کہ منگنی کے نام پر پہنائی گئی انگوٹھی کے تبادل، دوسری

pklibrary.com

انگوٹھی ماورا کو دی جانی چاہیے۔ وہ بھی تب جب عتیقہ بیگم خود ماورا کے سامنے کہہ کر گئی تھیں اور جانے کس خیال سے ماورا اور دو تین بار آصفہ بیگم سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔

"امی! آنٹی جھوٹ بول کے وہ رنگ لے گئی ہیں۔ رنگ کی بات نہیں ہے۔ وہ تو مجھے ایسی بھی کہتیں تو میں دے دیتی۔ وہ تو انہی کی رنگ تھی۔ لیکن....." ماورا کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھرایا تھا۔

"اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے بیٹا۔ ہوسکتا ہے مصروف ہوگئی ہوں گی یا کوئی اور مسئلہ ہوگا۔ میں نے اور تمہارے پاپا نے بہت سوچ سمجھ کر اس رشتے کو ہاں کی ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔"

بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آصفہ بیگم نے تسلی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

لیکن وہ بھول گئی تھیں یہ دنیا ہے۔ سات رنگ کی دنیا۔ دنیا کے ہر ماں باپ اپنی بیٹیوں کے نصیب کا فیصلہ کرتے ہوئے ہر طرح کی چھان بین اور تسلی کر لینے کے بعد ہی، اپنی بیٹیوں کے ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں ہم انسانوں کو پہچاننے میں، انہیں سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح آصفہ بیگم اور امان صاحب کے ساتھ ہوا تھا ہوا یوں تھا کہ.....

☆☆☆

ماورا کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے۔ اس کی شادی سے ایک ماہ پہلے فیصل بھی اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آچکا تھا۔ ہر چیز ماورا کی پسند کی تھی۔ خوب انتظامات کیے ہوئے تھے کہ جب شادی سے دو دن پہلے عتیقہ بیگم اپنی بیٹی اور چھوٹے بیٹے کے ہمراہ مہندی اور بارات کا جوڑا لے کر ماورا کے گھر آئی تھیں۔

چھوٹے سے اٹیچی کیس کو کھولا گیا۔ ماورا تو اپنی چیزوں کو دیکھتے ہی بے اختیار رونے لگی تھی۔ دونوں سوٹ ہی جانے کہاں سے لائے گئے تھے۔ لہنگے کا تو سب سے زیادہ برا حال تھا۔ ماورا کے ساتھ ساتھ خود آصفہ بیگم کو بھی بے انتہا دکھ ہوا تھا۔

"کچھ تو سوچنا ہے تھا آپ کو۔ ہماری بیٹی کے لیے ایسی چیزیں لاتے ہوئے۔" آصفہ بیگم خود کو کہنے سے روک نہیں پائی تھیں۔

"کیا مطلب؟" صبا کے تیور فوراً ہی بدلے تھے۔

"دیکھیں ہم نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ فضول شوشا میں ہم پیسے خرچ کرنے والے نہیں ہم مسلمان ہیں۔ اور شرعی کاموں پہ زیادہ دھیان دیں گے۔ آپ کی بیٹی کو بیس تولے زیور حق مہر میں دینے کا مطلب آپ جانتی ہیں۔

یعنی تقریباً تقریباً پچیس لاکھ ہم آپ کی بیٹی کی سکیورٹی دے رہے ہیں۔ ظاہری بات ہے۔ حق مہر میں لکھوا رہے ہیں تو دیں گے بھی۔ اب ہم حق مہر کی رقم ادا کر سکتے ہیں یا پھر لاکھوں کے پیسے یوں ہی ضائع کر دیں۔

وہ تو ہم بالکل بھی نہیں کریں گے۔ اور ویسے بھی ماورا نے یہ کپڑے پہن کر ہمارے گھر ہی آنا ہے۔ تو پھر جب ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ بھی اعتراض نہ کریں۔"

صبا نے تیز تیز لہجے میں بولتے ہوئے آصفہ بیگم کو خاموش کروایا تھا۔

آصفہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ لیکن امان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اپنی شریک حیات کو کچھ بھی بولنے سے منع کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جو کہہ رہی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے مہمانوں کے سامنے مزید کوئی تماشا نہیں بنانا۔"

امان صاحب نے ساری گفتگو کو سمیٹ لیا تھا۔

ماورا کے سسرال والوں کے جانے کے بعد، آصفہ بیگم نے شکوہ بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"یہ خوشی کی بات ہوتی ہے اور وہ لوگ اس بات

کو نہیں سمجھ رہے۔ اپنی دانست میں وہ شرعی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مطلب سادگی سے......"

"بس آپ بھی رہنے دیں۔ ان کی صفائیاں دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ اگر شرعی شادی کرنا چاہتے ہیں تو لاکھوں کا سامان لیتے ہوئے منع کیوں نہیں کیا۔ پہناونیوں کے نام پہ اتنے مہنگے سوٹ کیوں لیے اور تو اور قیصر جو بھی پہن کر آئے گا۔ آپ کی طرف سے پہن کر آئے گا۔ یہ کہنے کے بعد ہزاروں روپے کی شاپنگ کرتے ہوئے انہیں اسلام یاد نہیں آیا۔"

آصفہ بیگم کو آج پہلی بار اپنی ہونے والی سمدھن پہ شدید غصہ آرہا تھا۔ لیکن پھر امان صاحب اور فیصل کے سمجھانے پہ، اوپرے دل سے ہی سہی وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

دوسرے خرچوں کے ساتھ ساتھ، آصفہ بیگم ماورا کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کی پسند کا لہنگا اور مہندی ایک سوٹ دلوا لائی تھیں۔ ماورا کا لہنگا اور سوٹ فیصل کو اور امان صاحب کو کھاتے ہوئے آصفہ بیگم اپنے دل میں بستے، خدشے کو زبان پہ لانے سے روک سکی تھیں۔

"مجھے نہیں لگتا وہ حق مہر بھی لکھوائیں گے۔" جو وہ کہہ رہے ہیں امان صاحب! ان سے کہیں شرعی شادی کر رہے ہیں تو حق بھی شرعی مقرر کر لیں بلاوجہ کی بدمزگی نہ ہو جائے۔"

آصفہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"امی! آپ کیوں ایسے پریشان ہو رہی ہیں۔ اور ٹھیک ہے ناں۔ جہاں سب کچھ ہم نے کیا۔ وہاں لہنگا اور سوٹ بھی خرید لیا۔ آپ خواہ مخواہ ہی پریشان نہیں ہوں۔ اور نہ ہی ہمیں کریں۔"

فیصل کہتا ہوا ماں کے قریب آ کر بیٹھا اور انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

بیٹے اور شوہر کے ساتھ ساتھ بیٹی کو پریشان دیکھ کر، آصفہ بیگم نے خود کو سنبھالا دیا اور سب کچھ اللہ کی رضا پہ چھوڑ دیا۔ اب سب رشتہ دار کل یہاں پہنچنے والے تھے۔ ایسے میں اب وہ کیا خود بھی پریشان ہوتیں اور باقی سب کو بھی کرتیں۔

"ماشاء اللہ یہ لہنگا ہماری بیٹی پہ کتنا اچھا لگے گا ناں۔"

سرخ لہنگے کا کام دار دوپٹا اٹھا کر پھیلاتے ہوئے آصفہ بیگم نے کہا۔

"اللہ ہماری بیٹی کو نظر بد سے بچائے۔"

امان صاحب نے دل ہی دل میں کہا اور چہرے کو دوسری طرف جانب کر لیا۔ تاکہ کوئی بھی ان کی آنکھوں میں در آنے والی نمی کو دیکھ نہ پائے۔ بیٹی کو رخصت کرنے کا خیال ہر باپ کو یوں ہی افسردہ کر دیا کرتا ہے۔ امان صاحب نے سوچا اور پھر سر کو جھٹک کر مسکرا کر آصفہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئے، جو اب انہیں بیٹی کی چوڑیاں دکھا رہی تھیں۔

☆☆☆

حق مہر وہی مقرر ہوا تھا جو عتیقہ بیگم نے کہا تھا۔ آصفہ بیگم جو دل میں دو دن پہلے کی کھٹاس لے کر بیٹھی تھیں۔ اب دل ہی دل میں خوب شرمندہ ہو رہی تھیں۔ پہلی بار کسی بیٹے کی ماں کا دل اتنا بڑا دیکھا ہے۔ ہال میں موجود سب رشتے دار ستائش بھری نظروں سے عتیقہ بیگم اور ان کے ساتھ آئی ہوئی بارات کو دیکھ رہے تھے۔ ہر کوئی آگے بڑھ کر عتیقہ بیگم سے مل رہا تھا۔ اور ان کے اس فیصلے کو سراہ رہا تھا۔

دلہن بنی ماورا اپنے سسرال والوں کی تعریفیں زبانی سن سن کر نہال ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا سسرال واقعی قسمت والوں کو ملتا ہے۔ دل میں جو گلے شکوے تھے وہ سب ختم ہو رہے تھے کچھ دیر کے لیے ہی سہی ماورا نے خود کو بدگمان اور بدظن ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ لیکن اب وہ خود شرمندہ ہو رہی تھی۔

ماورا رخصت ہو کر اپنے سسرال آچکی تھی۔ مختلف رسموں کے بعد اس کی اکلوتی نند نے مارواکے اردگرد بیٹھی اپنی کزنز کے جھرمٹ کو ہٹایا اور ماورا کو سہارا دیے اس کے کمرے میں لے آئی۔ ماورا خود بھی

pklibrary.com

بیٹھے بیٹھے بے انتہا تھک چکی تھی۔ صبا نے سہارا دے کر اسے بیڈ پہ بٹھایا اور جلدی سے خود اس کے سامنے آ بیٹھی۔

"ہائے ماورا! تمہاری امی نے کتنی پیاری رنگ دی ہے مجھے۔" صبا نے اپنے ہاتھ میں پہنی رنگ کو اپنی نظروں کے سامنے کیا۔

"امی کے کنگن بھی بہت پیارے ہیں۔ تھینک یو میری پیاری بھابھی۔ تھینک یو سو مچ۔" کہتے ہوئے صبا ماورا کے گلے لگ گئی تھی۔

"اچھا اب تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتی اور ساتھ میں قیصر کو بھی اس کے دوستوں کے چنگل سے آزاد کرواتی ہوں۔"

ہنستے ہوئے کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ قیصر کے نام پر ماورا نے شرما کر اپنے سر کو جھکا لیا تھا۔

دروازے پہ کھٹکا سا ہوا تھا۔ آنے والا قیصر ہی تھا۔ ماورا نے شرما کر اپنے سر کو جھکایا۔

☆☆☆

"السلام وعلیکم!" قیصر نے سلام کیا۔ ماورا نے آہستگی سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا کہ قیصر ہولے سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"سچ میں یہ اتنی پیاری بیویاں بعد میں کہاں کھو جاتی ہیں۔ اب دیکھو نا تمہارا جواب سننے کے لیے مجھے اپنی پوری توجہ تم پہ مبذول کرنی پڑی ہے۔ اور شادی کے چند ماہ کے بعد......"

قیصر کی بات پر ماورا بھی مسکرائی تھی۔ سر جھکائے جھکائے اس کی گردن میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ قیصر اسے خود سر اوپر کرنے کا کہے۔ لیکن ماروا کو ایسا کچھ کہنے کا تکلف نہیں کیا۔ بلکہ اس کی بات پر ماورا کا جھکا ہوا سر خود بخود اوپر کی جانب اٹھ گیا تھا۔

"وہ جو حق مہر لکھوایا ہے۔ وہ میں ادا نہیں کر سکتا۔ تم......" قیصر رکا تھا۔

"تم مجھے وہ حق مہر معاف کر دو۔ تم نے مجھے حق مہر معاف کر دیا ہے ناں۔"

اپنی جانب حیرت سے دیکھتی ماورا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قیصر نے سوال کیا تھا۔ کچھ چھن کر کے ٹوٹا تھا۔ وہ ابھی اسی بات پہ غور کر رہی تھی کہ جب قیصر اپنی جگہ سے اٹھا اور سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک کاپی پینسل نکال کر ماورا کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ جس پر لکھا تھا ماورا خود اپنی مرضی اور خوشی سے قیصر کو حق مہر معاف کر رہی ہے۔

"تم یہاں سائن کر دو۔" قیصر نے تحریر کے نیچے خالی حصے پہ اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ جو چند لمحے پہلے ٹوٹا تھا وہ ماورا کا دل تھا۔ جو قیصر کے اس انداز اور بات پہ ٹوٹا تھا۔ اور اب اس کا دل ٹوٹ کر کتنی کرچیوں میں بٹا تھا۔ یہ تو بس ماورا جانتی تھی۔

"کرو بھی سائن، پھر میں نے ابھی تمہیں منہ دکھائی بھی دینی ہے۔"

قیصر نے خاموش بیٹھی ماورا کو مخاطب کیا تھا۔ اس سچویشن اور اس وقت ماورا قیصر سے کیا کہتی۔ چند گھنٹوں کی دلہن آخر بول بھی کیا سکتی تھی۔ ماورا نے خاموشی سے قیصر کے ہاتھ سے پینسل لی اور سائن کر دیے۔

تھینک یو سو مچ۔ اب ایک بار منہ سے بھی کہہ دو۔ اسلام کی رو سے یہ بھی ضروری ہے ناں۔"

قیصر نے ماورا کے دستخط کو دیکھتے ہوئے ذرا کی ذرا ماروا کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سے کاپی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں نے آپ کو اپنا حق مہر معاف کیا۔" مشکل سے ہی سہی ماورا نے یہ جملہ ادا کر دیا تھا۔

"تھینک یو۔ یہ ہوئی ناں پیاری بیوی والی بات ایک منٹ میں پہلے اسے سنبھال کر رکھ آؤ۔"

قیصر نے بڑی احتیاط سے کاپی سنبھالی اور اٹھ کر دیوار گیر الماری میں موجود کیبنٹ کی دراز میں کاپی رکھ کر لاک لگا کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

pklibrary.com

"اچھا اب میں تمہیں منہ دکھائی دوں۔ سوچو منہ دکھائی میں کیا ہوگا؟" ماورا کے ہاتھ تھامتے ہوئے قیصر نے ماورا سے دریافت کیا۔

"مجھے کیا پتا۔"

ماورا نے آہستگی سے کہا۔ ابھی چند لمحے پہلے قیصر نے جو کہا تھا۔ ماورا کو دکھ ہوا تھا۔ اگر اتنا حق مہر دینے کی استطاعت نہیں تھی تو دوسری باتوں کی طرح، یہ بات بھی کلیئر کی جاسکتی تھی اور ویسے بھی یہ بات خود قیصر کے گھر والوں نے کی تھی۔ ان کی طرف سے ایسا کوئی بھی مطالبہ نہیں تھا۔ پھر ایسا ٹوپی ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

"پھر بھی گیس تو کرو۔ میں تمہیں منہ دکھائی میں کیا گفٹ دینے والا ہوں۔" قیصر نے ماورا کے ہاتھ کو ہلکے سے دباتے ہوئے ضد کی تھی۔

"کوئی رنگ ہوگی۔" ماورا کو اب قیصر کے انداز سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس لیے اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے انگوٹھی کا کہہ دیا تھا۔

"ناں ناں۔" قیصر نے نفی میں سر کو ہلایا۔

"تمہاری منہ دکھائی میں، میں تمہیں وہ دوں گا۔ جو بہت بہت قیمتی ہے اور کسی نے بھی آج تک اپنی دلہن کو وہ نہیں دیا ہوگا۔"

قیصر گردن کو اکڑائے کہہ رہا تھا۔ اب کی بار ماورا سچ میں الجھی تھی۔

"کیا کوئی ڈائمنڈ رنگ ہے یا پھر ڈائمنڈ سیٹ" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"اچھا چلو میں تمہیں منہ دکھائی دیے ہی دیتا ہوں۔"

قیصر بیٹھے بیٹھے سائیڈ ٹیبل کی طرف جھکا اور ہاتھ ڈال کر سرخ کور میں لپٹا قرآن پاک نکال کا ماورا کی طرف بڑھا دیا۔ فوری طور پر تو ماورا کو سرخ کور میں لپٹی شے کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ الجھی نظروں سے قیصر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ارے بھئی میری طرف دیکھتی رہو گی یا کھول کر بھی دیکھو گی۔"

قیصر کے کہنے پر ماورا نے اپنا حنائی ہاتھ قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ اندر سے گولڈن کلر کے کور والا قرآن پاک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"اچھا ہے ناں۔" قیصر پر جوش انداز میں ماروا سے پوچھ رہا تھا۔ کیا کہتی سوائے اپنا سر اثبات میں ہلانے کے۔

"دیکھا ایسی منہ دکھائی کو کسی نہیں ملی ہوگی۔"

قیصر پر جوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماروا کے پاس بولنے اور کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جب اگلے دن ماورا کزنز نے اس سے منہ دکھائی کے بارے میں پوچھا تو قرآن پاک کا سن کر سب ہی خاموش ہو گئے تھے۔

"ٹھیک ہے قرآن پاک بھی دیا ہے۔ لیکن ساتھ میں کچھ اور بھی تو دینا چاہیے تھا۔"

ماورا کی کزن نے نمرئی بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو نمرئی نے فوراً ہی "مجھے اس معاملے میں مت گھسیٹیں۔" لاپرواہی سے اپنے کندھوں کو اچکا دیا تھا۔ ماورا سر کو جھکائے اپنی ہتھیلی پہ سجی مہندی کو دیکھتے ہوئے، کتنے ہی آنسو اپنے اندر اتار چکی تھی۔ وہ اپنے والدین کو افسردہ اور اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے حق مہر کو معاف کروانے والی بات اپنے گھر والوں سے چھپائی تھی۔

☆☆☆

زندگی شاید ماورا کا ابھی اور بھی امتحان لینا چاہتی تھی۔ یہ اس کی شادی کے ایک ہفتے بعد ہی کی تو بات تھی۔ ماورا اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو پیاس کے شدید احساس نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا خالی جگ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"افوہ۔" ماورا نے جگ کو واپس ٹیبل پہ رکھا۔ تکیے کے پاس پڑے اپنے دوپٹے کو کھینچ کر اور پاؤں میں سلیپر باڑس کر ہی اپنے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی لاؤنج سے اس کے

سسرال والوں کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

شاید وہ سب اپنی باتوں اور ہنسی میں اتنا مشغول تھے کہ انہیں ماورا کے دروازہ کھولنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

امی! ویسے آپ کا نسخہ اچھا خاصا نمبر لے گیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے۔

مطلب ہم نے پہلے دن ہی حق مہر کے نام پر بیس تولے زیور کا کہہ کر ماروا کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ پورے خاندان سے بھی واہ واہ سمیٹ لی۔ اب تو ہر کوئی ہمارا گرویدہ بنا ہوا ہے ہر کوئی اب نیل کورشتہ دینے کی دوڑ میں شامل ہو گیا ہے۔"

صبا نے کہتے ہوئے ماں کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور ایک بار پھر اپنے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑی تھی۔

"تم ہنس رہی ہو۔ امی نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ بیس تولے سونا مطلب....." قیصر نے جیسے جھرجھری لی تھی۔

"ہاں تو امی نے ہی تمہیں اس کا حل بتا بھی تو دیا تھا کہ کمرے میں جاتے ہی سب سے پہلے حق مہر معاف کروانے کی بات کر لینا۔ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب بے چاری لڑکی نہ ہاں کر سکتی ہے نہ ہی انکار۔ بس وہی کر سکتی ہے جو اس کا مجازی خدا اسے اس وقت کہہ رہا ہوتا ہے۔ اور پھر بتاؤ امی کی بات ٹھیک ثابت ہوئی ناں۔ کر دیے نہ تمہیں ماورا نے سائن۔" صبا کی ہنسی ذرا تھمی تھی۔

"ہاں یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" قیصر نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی کمر کو صوفے کی پشت سے لگایا تھا۔

لیکن تم نے کچھ زیادہ ہی کنجوسی کی حد کر دی تھی۔ چلو ہم نے آگے پیچھے تو اسے کچھ نہیں دیا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا منہ دکھائی کے لیے سونے کی ہلکی سی انگوٹھی لے آنا۔ لیکن تم قرآن پاک لے آئے۔ چلو قرآن پاک کے ساتھ ساتھ تم اسے رنگ بھی دے دیتے۔ آخر کو اس کے ماں باپ نے بھی تو ہمیں اتنا کچھ دیا ہے۔" عتیقہ بیگم نے کہا۔

"ارے امی جانے دے قرآن پاک سے اچھا کیا ہے۔ بس اللہ اللہ خیر صلا۔" قیصر نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"انتہا کے کنجوس ہو تم۔" صبا نے قیصر کے بازو پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"امی! اگر اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ ہم نے حق مہر معاف....."

قیصر کسی خدشے کے تحت سیدھا ہوا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے ایک بار شادی ہو جائے۔ پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہوتی۔ پتا چل بھی جائے تو کیا یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا معاملہ ہے۔ کوئی تیسرا اس میں کچھ نہیں بول سکتا۔"

عتیقہ بیگم نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بیٹے کو تسلی دی اور اندر اپنے کمرے میں کھڑی ماورا، اپنے سسرال اور شوہر کی ذہنی پستی دیکھ کر واپس پلٹی اور شدت سے رو دی تھی۔

"ہم عقل مند کیسے لوگ ہیں۔ دکھاوے، جھوٹ، دھوکہ دہی کو اپنی طاقت سمجھتے ہیں۔ خود کو عقل مند سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات کو پاؤں تلے روندنا اسلامی احکامات کا مذاق بنانا۔ یہ تو جیسے معمول کا حصہ بن گیا ہے۔"

اس دن ماورا کے اندر کتنا کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ اعتبار، یقین، اپنا پن اس نے اس سب سے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ اسے قیصر سے الجھن ہونے لگی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس الجھن میں خود کے ساتھ کچھ کر لیتی۔ فیصل بھائی چند دنوں کے لیے اسے اپنے گھر رہنے کے لیے لے آئے تھے۔ گھر آتے ہی اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اب واپس یہاں نہیں آئے گی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس کے قدموں تلے جنت رکھ دی گئی تھی۔ وہ جو قیصر اور اس کے گھر کبھی واپس نہ جانے کا سوچ کر آئی تھی۔ چپ چاپ واپس آ گئی تھی۔ زندگی گزر رہی تھی۔ اب تو اس کی شادی کو بھی دو سال ہونے والے تھے۔ اب گھر میں نبیل کی شادی کا شور اٹھنے لگا تھا۔ یعنی ایک اور ماورا کے ساتھ وہی سب ہوگا۔ جو کل انہوں نے اس ماورا کے ساتھ کیا تھا۔

"لیکن نہیں۔" ماورا اپنے چہرے پہ بکھرے آنسوؤں کو صاف کرتی اٹھ بیٹھی تھی۔

"میں ان لوگوں کو کسی اور کے ساتھ ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ اسلام آسانی کا دین ہے۔ جو ہمیں ہر معاملے میں آسانی دیتا ہے۔ لیکن حقیقہ بیگم اور قیصر جیسے لوگ ان احکامات کو بس اپنے مطلب اور فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ نہ تو ان لوگوں کو حق مہر کا مذاق بنانے دے گی۔ اور نہ ہی کسی اور لڑکی کے جذبات کو یوں روندنے دے گی۔"

ماورا دل ہی دل میں سوچتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر رک باہر کی سمت بڑھ گئی۔ جہاں وہ سب ابھی تک محفل سجائے بیٹھے تھے۔

وہ کمزور نہیں تھی لیکن قیصر کی کنجوسی اور ذہنیت سے وہ وقتی طور پر خود کو کمزور کر گئی تھی۔ لیکن اب .....اب وہ بول رہی تھی۔

انہیں بتا رہی تھی۔ وہ ان سب کی اصلیت جانتی ہے۔ لاؤنج میں بیٹھے سب ہی افراد حیرت سے ماورا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے تو وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماورا سب جانتی ہے۔

"جہاں قسمت ہو وہاں رشتے جڑ جاتے ہیں آنٹی۔ لیکن جھوٹ کی بنیاد پہ بنے رشتے کبھی بھی بار آور درخت کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ حق مہر کوئی مذاق نہیں ہے۔ جو آپ لوگوں کی بیٹیوں کے ساتھ کرتے پھرتے ہیں۔

یہ اللہ کی طرف سے ایک لڑکی کے لیے انعام ہے۔ ایک لڑکی کی سیکیورٹی ہے۔ جو خدا نے کسی دوسرے ماں باپ کے ہاتھ سے اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی دوسرے انسان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دی ہے۔ کل میرا ہاتھ تھا قیصر، آج کسی اور بیٹی کا ہاتھ ہوگا۔ لیکن آنے والے کل میں یہی ہاتھ تمہاری بیٹی کا ہوگا۔"

ماورا نے کہتے ہوئے قیصر کی گود میں بیٹھی عینا کی طرف اشارہ کیا۔

"ماں باپ کا دل اپنی اولاد کے بارے میں بہت نازک ہوتا ہے۔ اور آپ جیسے لوگ۔"

ماورا رونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن وہ رو رہی تھی۔ قیصر بولنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

"واہ واہ دکھاوے تعریفوں کے لیے اور بہت سے طریقے ہیں۔ لیکن آپ لوگ تو ہر حد سے ہی گزر گئے۔ ایک بات یاد رکھیے گا۔ جو کچھ آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔

وہ میں کسی اور کے ساتھ نہیں ہونے دوں گی۔ آپ لوگوں کو اللہ کی پکڑ سے خوف نہیں آتا۔ لیکن مجھے آتا ہے۔ کل کو ماں باپ کا کیا اولاد کے سامنے آتا ہے۔ اور میں نہیں چاہتی اللہ کے احکامات کا مذاق بنانے کی پاداش میں قیصر کو جو سزا ملے اس میں میری بیٹی بھی حصے دار ہو۔"

ماورا رو رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ اور باقی لوگ حیرت کے سمندر سے نکل کر شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر رہے تھے۔ کتنی ہی دیر گزری تھی ماورا کو روتے ہوئے کہ جب اس کے گھٹنے پہ کسی کا ہاتھ آن ٹھہرا تھا۔ روتی ہوئی ماورا نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے قریب حقیقہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں اللہ کی پکڑ سے ڈر نہیں لگتا۔ اپنی واہ واہ کروانے کے لیے میں....."

حقیقہ بیگم کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا تھا۔

"پتا نہیں اللہ مجھے اس سوچ اور حرکت پہ

معاف کرتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں تم سے معافی مانگتی ہوں بیٹا۔"

عتیقہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ماورا کے سامنے جوڑا تھا۔ دنیا کی نظروں سے وہ اس سب کو چھپا گئی تھیں۔ لیکن ان دو سالوں میں کئی بار ان کے ضمیر نے ماورا کے حق مہر پر جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے پہ کئی بار ان کی سرزنش کی تھی۔ لیکن عتیقہ بیگم ہر بار کوئی نا کوئی تاویل، یا دلیل دے کر اپنے ضمیر کو سلا دیا کرتی تھیں۔ لیکن آج ان کے ضمیر نے جو لعن طعن کرنا شروع کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ جو وہ ماورا کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی تھیں۔

"مجھ سے معافی نہیں مانگیں آنٹی! اللہ سے معافی مانگیں۔ ہمارا رب بہت مہربان ہے اگر ہماری غلطیوں کی سزا ہمیں فوری مل جائے تو شاید ہم ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہیں۔ وہ ہمیں ڈھیل دیتا ہے بس اس لیے کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف خود کریں اور معافی خود مانگ لیں۔

کچھ غلط کیا ہو۔ ضمیر مطمئن نہیں رہنے دیتا۔ جیسے آپ کے بیٹے کو بھی اس خلش نے دو سال سے سکون سے نہیں رہنے دیا۔"

ماورا نے سر کو اٹھا کر قیصر کی طرف دیکھا۔ قیصر نے اپنا سر شرمندگی سے جھکا لیا تھا۔

"جتنی حیثیت مرد کی ہوتی ہے۔ اتنا ہی حق مہر لکھوایا جاتا ہے۔ وہ حق مہر جس کو ادا کرنے کی ایک مرد میں ہمت ہوتی ہے۔ طاقت ہوتی ہے۔ لیکن آپ سب جانتے تھے آپ نے جان بوجھ کر یہ سب کیا تھا۔

تب ہی تو ہر دو دن کے بعد قیصر مجھ سے یہ پوچھنا نہیں بھولتے تھے کہ میں نے حق مہر معاف کر دیا ناں۔"

ماورا کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی، تاسف تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور قیصر کی گود میں بیٹھی عینا کو جھک کر اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جب وہ اجتماعی طور پر بیٹھ کر ایسی سازشیں کرتے تھے۔ تو ماورا نے آج انہیں اجتماعی طور پر بیٹھ کر شرمندہ ہونے اللہ سے معافی مانگنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں جانے سے پہلے ماورا نے پلٹ کر ایک نظر ان سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ جہاں شرمندگی تھی۔ ندامت تھی۔ پچھتاوا تھا۔ یعنی توبہ کی گنجائش ابھی باقی تھی اور اگر زندگی میں توبہ کی گنجائش مل جائے تو اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہوگی۔

آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کے ساتھ ماورا کے لب مسکرائے تھے۔ یعنی وہ ابھی مکمل طور پر مردہ ہوئے ضمیروں کے ساتھ نہیں بلکہ زندہ ضمیروں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ امید کی کرن ابھی باقی تھی۔ احساس گناہ کے بعد احساس توبہ کا سفر تھا۔ طے ہو سکتا تھا۔ اور یہ بات ماورا کے اطمینان کے لیے کافی تھی۔

ہم لوگ بھی ناں۔ دنیاداری کو نبھانے کے لیے کیا کچھ کر جاتے ہیں۔ لیکن احساس بس چند لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔ جیسے عتیقہ بیگم اور ان کی اولاد کو احساس ندامت ہو رہا تھا۔

"امی ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" صبا کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز عتیقہ بیگم کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ تو عتیقہ بیگم نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہاں ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" قیصر نے دھیرے سے کہا اور اپنے کمرے کے کی سمت بڑھ گیا۔ سب سے پہلے معافی مانگنے کا حق دار بھی تو وہی تھا۔

☆☆

نگہت سیما

ماہ الملوک

مکمل ناول

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاز یب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا ایک بیٹا آزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زمل تھی آزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

پانچویں قسط

pklibrary.com

"کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" ماسٹر عبدالعزیز اجنبی تک حیران کھڑے تھے۔

"تو میں نے کون سی پہیلی ڈال دی ہے ماسٹر صاحب۔ سیدھی بات کی ہے کہ اب شادی کی تاریخ دے، دیں تو میں بھی اپنے اسلم کے سر پر سہرا سجاؤں۔" وہ ہنسی۔

"میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا ماسی! اسلم کی شادی کی تاریخ سے بھلا میرا کیا مطلب۔"

ماسٹر عبدالعزیز اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

www.pklibrary.com

"لو آپ کا تعلق کیسے نہیں باپ آپ ہیں تو شادی کی تاریخ کیا میں گاؤں والوں سے لینے جاؤں گی۔"

اب وہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر زور سے ہنسی۔

"صاف بات کریں ماسی! پہیلیاں نہ بجھوائیں۔"

ماسٹر عبدالعزیز الجھے ہوئے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"تو صاف بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ میں نے زہرا سے برسوں پہلے بات کی تھی اپنے اسلم اور زیب النساء کے رشتے کی تو تب اس نے کہا تھا کہ ہماری بیٹی ابھی چھوٹی ہے۔ پھر ہم اسے پڑھانا چاہتے ہیں تو میں نے کہا تھا۔ سو بسم اللہ کر کے پڑھائیں۔ میرا اسلم کون سا بوڑھا ہوا جا رہا ہے تو بس تب سے ہی اس انتظار میں تھی کہ زیبو پڑھ لے تو..... پر آہ۔"

وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

"بے چاری زہرا چلی گئی اور اب تو اسے بھی مرے دو سال ہو گئے اور زیبو پڑھ بھی نہیں رہی تو میں نے کہا اب کتنا انتظار کروں۔ میرا بھی اکلوتا (ایک ایک) بیٹا ہے تو بس ماسٹر جی مجھے آج تاریخ دے دیں کہ کب اپنے بیٹے کی بارات لے کر آؤں۔"

ماسٹر عبدالعزیز نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"ہم نے کب اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو دیا کہ آپ تاریخ لینے آ گئیں۔ زہرا نے آپ کو کہہ تو دیا تھا کہ ہمیں ابھی اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی۔"

"ہاں تو یہ ہی کہا تھا کہ ہمیں ابھی شادی نہیں کرنی۔ تو میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ چلو ٹھیک ہے۔ انتظار کر لوں گی۔ صاف صاف یہ تو نہیں کہا تھا کہ رشتہ ہی نہیں دینا۔"

"تو ٹھیک ہے ماسی! میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دینا آپ کے بیٹے کو۔"

ماسٹر عبدالعزیز نے بمشکل اپنا غصہ دبایا۔

"میں سالوں سے انتظار کر رہی ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں رشتہ ہی نہیں دینا۔ واہ بھئی واہ۔" نور بھری نے تالی بجائی۔ "اگر رشتہ نہیں دینا تھا تو پھر لارا کیوں لگایا تھا۔"

"کسی نے آپ سے لارا نہیں لگایا تھا۔ آپ کے اپنے دماغ کا فتور ہے سب۔ زہرا نے ایک طرح سے انکار ہی کر دیا تھا اب آپ ہی نہ سمجھیں تو قصور کس کا ہے۔" ماسٹر عبدالعزیز اب بھی تحمل سے کام لے رہے تھے۔

"پر میرا اسلم تو زیب النساء کو اپنی منگ ہی سمجھتا ہے۔ تب ہی تو انتظار کر رہا ہے۔" ماسی نور بھری اب کے ذرا نرمی سے بولی تھی۔

"اچھا!" ماسٹر عبدالعزیز کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تب ہی مراثیوں کی لڑکی بھگا کر لے گیا تھا۔ وہ تو میراثی تھوڑے تگڑے تھے تو لڑکی برآمد کروالی اور صرف برآمد ہی نہیں کروائی۔ جیل کی ہوا بھی کھلا دی۔"

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے ماسٹر صاحب! وہ تو کمی کمینوں کی لڑکیاں خود ہی اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ایسا صابر اور سوہنا جوان ہے میرا اسلم۔ شریف اور بھولا سا۔" لہجے میں خود بخود ہی فخر آ گیا تھا۔

"میرا منہ مت کھلواؤں ماسی بھری!" وہ بیزار سے ہوئے تھے۔ سارا گاؤں جانتا ہے آپ کے بیٹے کی شرافت اور بھولپن۔ کہیں تو ابھی دو چار قصے کھول کر سنا دوں۔"

"سارے گاؤں والے جلتے ہیں میرے پتر سے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ بس آپ مجھے بتائیں کہ کب بارات لے کر آؤں اپنے شہزادے پتر کی۔ بہو تو بس میری زیب النساء ہی بنے گی۔"

حق جتاتا انداز تھا لیکن ماسٹر عبدالعزیز کا صبر جواب دے گیا تھا۔

"بس۔" انہوں نے ذرا سا دایاں ہاتھ بلند

کیا۔

"بہت ہو گیا۔ اپنے بتاشوں کا تھال اٹھائیں اور جائیں۔ آئندہ اس مقصد کے لیے میرے گھر مت آیئے گا۔ انکار کر چکا ہوں صاف صاف پھر بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میرا بیٹا بے غیرت نہیں ہے۔ دیکھتی ہوں کیسے کوئی اور اس کی منگ کو بیاہ کر لے جاتا ہے۔"

ماسی نور بھری نے بتاشوں کا تھال اٹھایا اور بڑبڑاتی ہوئی دروازہ زور سے بند کرتی گھر سے باہر نکل گئی۔ ماسٹر عبدالعزیز سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ کیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ کیا کوئی ایسا بھی دھوکا باز ہوتا ہے۔"

"ابا!" زیب النساء جو باورچی خانے میں ماسی نور بھری کے لیے چائے بنانے گئی تھی اور ماسٹر عبدالعزیز کے آنے کے بعد وہاں ہی پیڑھی پر بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی پریشان ہو کر باہر آئی تھی۔

"یہ..... یہ ماسی کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں تم پریشان مت ہو۔ ایسے ہی کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی اسے اور نادان عورت اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔"

"ابا" وہ سب کچھ سن چکی تھی۔

"مجھے اسلم بھائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر کبھی گلی میں سے گزرتے ہوئے سامنا ہو جائے تو ایسے گھورتے ہیں جیسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ میں ہوں نا اور ہاں آئندہ جب میں گھر پر نہ ہوں تو دروازے کی اندر سے کنڈی لگا کر رکھنا۔"

اندر ہی اندر وہ فکر مند سے تھے لیکن اسے تسلی دی اور پھر اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے کہ کیسی تیاری ہے۔ اگر وہ مطمئن ہے تو اگلے ماہ ایڈمیشن جائیں گے تو وہ اس کا ایڈمیشن بھجوا دیں گے۔

"جی ابا! تیاری تو ہے۔ تھوڑی سی انگلش کی تیاری رہتی ہے۔ بی پیپر کی۔ مضامین وغیرہ کی۔ لیکن ہو جائے گی ابھی تو کافی ٹائم ہے۔"

وہ بھی مطمئن ہو گئی تھی جانتی تھی کہ ابا کبھی بھی اسلم جیسے لوفر سے اس کی شادی نہیں کریں گے لیکن ماسٹر عبدالعزیز مطمئن نہیں تھے، اسے تو تسلی دے دی تھی لیکن خود بے حد مضطرب اور بے چین تھے۔ کبھی ماسی نور بھری کی ڈھٹائی پر غصہ آتا کہ کیسے ایک جھوٹی بات پر ڈٹی ہوئی تھی اور کبھی خود پر غصہ آتا کہ جب پہلی بار وہ رشتہ لے کر آئی تھی تو بجائے یہ کہنے کے کہ زیب النساء ابھی چھوٹی ہے۔ صاف صاف انکار کر دیتے تو اس طرح دیدہ دلیری سے وہ بتاشوں کا تھال اٹھا کر نہ چلی آتی۔

رات کو انہیں ٹھیک طرح نیند بھی نہیں آئی تھی۔ اسکول میں بھی وہ ایسے ہی مضطرب اور بے چین سے رہے تھے، حتیٰ کہ جب وہ چوہدری عبدالمالک کے ہاں ان کے بیٹوں کو پڑھانے گئے تب بھی ایسے ہی مضطرب اور بے چین سے تھے۔ چوہدری عبدالمالک کے بڑے دونوں بیٹے تو اب یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے جبکہ دونوں چھوٹوں کو وہ حساب پڑھانے جاتے تھے اور کبھی کبھار چوہدری عبدالمالک سے بھی دعا و سلام ہو جاتی تھی، زیادہ تر تو وہ مصروف ہوتے تھے۔ لیکن آج اتفاق سے وہ گھر پر موجود تھے، جب ماسٹر عبدالعزیز بچوں کو پڑھا چکے تو معمول کے مطابق خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے وہ بھی وہاں ہی آ گئے۔

بچے چلے گئے تو عبدالعزیز صاحب سے خیر خیریت معلوم کرتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ وہ کچھ پریشان ہیں، ہمدرد آدمی تھے تو پوچھ بیٹھے کہ وہ کچھ پریشان ہیں اور ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے بھی سب کچھ بتا دیا کہ بہت مضطرب اور پریشان تھا اور کوئی اپنا نہ تھا جس سے

حال دل کہتے۔ عبدالمالک چوہدری نے ساری بات سن کر تسلی دی۔

"فکر نہ کریں ماسٹر صاحب! نور بھری اور اسلم کو تو میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ دوبارہ اس ارادے سے آپ کے گھر کی طرف نہیں آئے گی۔ رہی زیب النساء بیٹی کے رشتے کی بات، تو میرے ایک دو جاننے والے ادھر صادق آباد میں ہیں آپ کی ہی آرائیں برادری کے، ان سے بات کروں گا مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ یقیناً کہیں نہ کہیں بات بن جائے گی۔ باخدا اگر میرا بڑا اپنے ماموں کی بیٹی سے منسوب نہ ہوتا اور چھوٹے نے وہاں ہی یونی ورسٹی میں کوئی لڑکی پسند نہ کر لی ہوتی، تو میں اسی وقت زیب النساء بیٹی کو بہو بنا کر گھر لے آتا۔"

چوہدری عبدالمالک ایسا ہی تھا دلیر، سخی اور اعلا ظرف اسی لیے سارے چک والے اس کی عزت کرتے تھے اور اگر کسی کو کوئی مسئلہ ہوتا تو چوہدری عبدالمالک کے پاس ہی جاتے اور وہ بہت خلوص سے ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا۔

ماسٹر عبدالعزیز، چوہدری عبدالمالک کا شکریہ ادا کر کے حویلی سے نکلے تو اضطراب اور پریشانی کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ استانی کے بعد اب چوہدری عبدالمالک سے بھی انہوں نے زیب النساء کے رشتے کے لیے کہہ دیا تھا اب جو اللہ چاہے۔

وہ سر جھکائے اپنی ہی سوچوں میں گم گلی میں داخل ہوئے تو گلی میں عین اپنے گھر کے دروازے کے سامنے اسلم کو ٹہلتا دیکھ کر، چونکے وہ انہیں آتا دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا اور اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا اپنے گھر میں چلا گیا۔ ماسٹر عبدالعزیز ایک بار پھر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے وہ زیب النساء کو استانی جی کے گھر چھوڑ جایا کریں گے اور واپسی پر لیتے ہوئے گھر آجائیں گے کہ بھلے سے دروازے کی کنڈی اندر سے لگی ہو۔ چھت سے چھت ملی تھی اگر نیت خراب ہو تو دیوار پھلانگ کر چھت پر آیا جا سکتا تھا۔

استانی جی تو ان کی بات سن کر خوش ہو گئی تھیں وہ سارا دن گھر پر اکیلی ہوتی تھیں۔ ظہر کے بعد کچھ بچیاں قرآن پڑھنے آجاتی تھیں تو دل ذرا بہل جاتا تھا۔ فاطمہ بھی تین چار ماہ بعد ہی چکر لگاتی تھی وہ بھی دو تین روز کے لیے۔ اگرچہ دو دن بعد ہی چوہدری عبدالمالک نے انہیں بتایا تھا کہ انہوں نے اسلم اور نور بھری کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ اگر اسلم نے آپ کے گھر کی طرف نظر بھی ڈالی تو پھر ساری عمر کے لیے جیل میں سڑتا رہے گا۔ پھر بھی کچھ استانی جی کا اصرار تھا اور کچھ ان کا اپنا دل بھی وہی سا تھا، سو وہ ہر روز صبح زیب النساء کو استانی جی کی طرف چھوڑ جاتے تھے اور واپسی پر لے جاتے تھے۔

زیب النساء استانی جی کے گھر وقت گزار کر بہت خوش تھی، استانی جی سے باتیں کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ سالن وہ رات کو ہی بنا کر رکھ دیتی تھی۔ روٹیاں جا کر پکا لیتی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے بھی محسوس کیا تھا کہ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں اور چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔

زہرا کے بعد جس طرح وہ بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اب بولنے لگی تھی۔ کام کرتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ کر پڑھتے ہوئے وہ پہلے کی طرح باتیں کرتی رہتی تھی۔ اپنی استانی جی کی فاطمہ آپا کی زہرا کی۔

یہ نہیں تھا کہ اس نے زہرا کو بھلا دیا تھا اس کا ذکر کرتے کرتے، اب بھی اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں رخسار گیلے ہو جاتے تھے لیکن وہ زندگی جو زہرا کے بعد اس کے اندر مر گئی تھی۔ ایک بار پھر نمو پانے لگی تھی۔ استانی جی کے پاس رہ کر اس نے حوصلہ، صبر اور شکر کرنا سیکھا تھا۔ اس نے اللہ کی رضا پر راضی ہونا سیکھ لیا تھا۔

استانی جی کی زندگی اس کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی، جس کا ہر ورق اسے کچھ سکھاتا تھا اور استانی جی ہر روز کوئی نہ کوئی ورق کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔

استانی جی جو نوجوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ چھوٹی سی فاطمہ تب ان کی گود میں تھی۔ ان کی زندگی کی

کتاب ان کی جدوجہد ان کے صبر، حوصلے اور ہمت کی کہانی تھی اور وہ ایک ایک صفحہ پڑھ رہی تھی اور سیکھ رہی تھی۔ صبر، حوصلہ، شکر۔

ماسٹر عبدالعزیز ان کے ممنون تھے اور وہ اکثر اپنی ممنونیت کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انہیں ایف اے کے داخلہ فارم لینے رحیم یار خان جانا تھا پر ائیویٹ داخلہ بھجوانے کی تاریخ کا اعلان ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ایک ساتھی ٹیچر کے گھر جس کا تعلق رحیم یار خان سے تھا اس کے سسر کی تعزیت کے لیے بھی جانا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ استانی جی سے کہیں گے کہ آج رات، زیب النساء ان کے گھر پر ہی رہے گی ہو سکتا ہے واپسی پر انہیں دیر ہو جائے یا پھر وہ رات آ ہی نہ سکیں ،سو اس روز جب وہ زیب النساء کو چھوڑنے گئے تو انہوں نے استانی جی سے درخواست کی تو استانی جی نے ان کی توقع کے مطابق انہیں تسلی دی تھی۔

"آپ بے فکر ہو جائیں ماسٹر صاحب!"

"میں ہاف ڈے کی چھٹی لے کر اسکول سے ہی چلا جاؤں گا۔"

انہوں نے زیب النساء کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ روز کی طرح گلی کا موڑ مڑنے تک انہیں دیکھتی رہی۔ جب وہ دروازہ بند کر کے مڑی تو استانی جی صحن عبور کر کے برآمدے میں پہنچ چکی تھیں۔ فاطمہ آپا کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔

"کیا فاطمہ آپا آئی ہوئی ہیں۔"

تیزی سے صحن عبور کر کے وہ ان کے قریب پہنچی تھی اور فاطمہ کے کمرے کی طرف جاتے جاتے استانی جی رک گئیں۔

"نہیں مہمان ہے۔ فاطمہ کے کمرے میں ٹھہرایا ہے۔ رات اقبال آیا تھا۔ شکاریوں کے ایک گروپ کے ساتھ اسے انہیں لے کر آگے جانا تھا لیکن یہ بچہ راستے میں ہی بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی ضد کر کے ساتھ چلا آیا کہ بخار ہے اتر جائے گا۔ اور یہاں آتے آتے تو اس کا بخار اتنا بڑھا کہ ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تو اقبال اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ رات بھر گھریلو ٹوٹکے ہی استعمال کرتی رہی ہوں اور کچھ دوائیں اقبال بھی دے گیا تھا۔ رات بھر سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی، فجر کے وقت جا کر کہیں بخار ذرا کم ہوا ہے۔ دیکھنے جا رہی ہوں کہ جاگ رہا ہے تو کچھ کھانے کو دے دوں پھر ذرا حکیم صاحب کو بلا کر لے آتی ہوں۔"

زیب النساء جانتی تھی کہ استانی جی کا بھانجا اکثر شکار کے موسم میں شوقین لوگوں کے گروپ کو شکار کے لیے لے کر جاتا تھا۔ وہ جو فاطمہ آپا کے آنے کا سوچ کر خوش ہو گئی تھی کچھ اداس سی ہو کر وہاں برآمدے میں پڑے موڑھے پر بیٹھ گئی اور استانی جی فاطمہ کے کمرے میں چلی گئیں اور کچھ ہی دیر بعد واپس آ گئیں۔

"بے سدھ پڑا ہے بے چارہ بخار پھر تیز ہو گیا ہے شاید، زیب النساء بیٹی میں ذرا حکیم صاحب کو لے کر آتی ہوں۔ تم میرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔ بلا ضرورت باہر نہ نکلنا۔ میں بس ابھی گئی اور ابھی آئی۔"

زمانے کے سرد و گرم کو چکھی ہوئی استانی جی آج زیب النساء کو رات، گھر پر رکنے پر ہرگز راضی نہ ہوتیں اگر ماسٹر صاحب کو رحیم یار خان نہ جانا ہوتا۔

"اگر ڈر لگے تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

جاتے جاتے انہوں نے تاکید کی تھی۔ اور زیب النساء ان کے چادر اوڑھنے تک ان کے کمرے میں جا چکی تھی۔ اور اس کا ارادہ استانی جی کے آنے تک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھنے کا تھا۔ ابھی اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ کھانسی شروع ہو گئی۔ پچھلے دو تین دنوں سے اسے خشک کھانسی ہو رہی تھی۔ جب شروع ہوتی تو رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ابھی بھی کھانس کھانس کر آنکھوں میں پانی آ گیا اور حلق میں جیسے کانٹے سے چبھنے لگے تھے، وہ بے اختیار پانی پینے کے ارادے سے باہر نکلی اور گھڑونچی پر رکھے گھڑے سے کٹورے میں، پانی ڈال کر مڑی ہی تھی کہ نگاہ غیر ارادی طور پر فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف اٹھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے وہ کھڑا تھا۔

"پانی پلیز۔" اسے مڑتے دیکھ کر گھٹی گھٹی سی

آواز اس اجنبی کے لبوں سے نکلی تو وہ بے اختیار کٹورا ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھی۔ اور دو قدم کی دوری پر رک کر اس نے کٹورا آگے بڑھایا۔

"تھینک یو!" اس نے کٹورا تھامنے کے لیے ہاتھ چوکھٹ سے ہٹایا تو لڑکھڑایا۔

"سنبھل کر پلیز ....." زیب النساء کی نظریں اٹھیں۔ بخار کی حدت سے تپا ہوا چہرا۔ مندی مندی سوجی ہوئی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے سلکی بال۔ "کیا یہ کوئی شہزادہ ہے جو دور دیس سے راہ بھول کر ادھر آ گیا ہے۔" اور کٹورا تھامتے ہوئے اس کی نظریں بھی جیسے اس حسین چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔

"کیا یہ کوئی پری ہے جو آسمانوں سے اتر کر میری پیاس بجھانے آئی ہے یا میں پرستان میں ہوں۔"

دونوں ایک دوسرے کو مبہوت سے دیکھ رہے تھے۔ اور لرزتے ہاتھوں میں پکڑے کٹورے سے پانی چھلک چھلک کر نیچے گر رہا تھا نہ کٹورا بڑھانے والے کو احساس تھا نہ تھامنے والے کو، بس وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

کیوپڈ نے مسکرا کر اپنی کمان کو چوما اور آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

اگست کے ان حبس بھرے دنوں میں آج کا دن اتنا حبس بھرا نہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور صحن میں موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر تنی جالی موتیے کی بیل پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ زمل اپنی مخصوص جگہ پر سیڑھیوں میں بیٹھی، کیاریوں کے پاس پڑی سوکھی لکڑیوں میں چڑیوں کو پھدکتے دیکھ رہی تھی، جب اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دھیان سے سامنے خاکستری چڑیا کو دیکھ رہی تھی، جو اپنے بچے کو اپنی چونچ میں دبا با جرے کا دانہ کھلا رہی تھی۔

"تو شادی کی تیاریاں ہو گئیں؟" آزین دو سیڑھیاں چھوڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

"ابھی کہاں، اتنا ڈھیر سارا کام تو رہتا ہے مونا تائی کہہ رہی تھیں آج شام کو ان کے ساتھ درزی کی طرف چلوں۔"

وہ اب بھی چڑیا کو دیکھ رہی تھی اور اس کے گرد پھدک پھدک کر چکر لگاتے چڑیا کے بچے کو۔

"تو وہ سحرش اور رخسانہ تائی کو ساتھ لے جائیں۔ ہر جگہ تمہیں کیوں گھسیٹتی پھرتی ہیں۔" بی بی اماں کے انداز میں کہتا وہ اسے کچھ ناراض سا لگ رہا تھا۔

"تم منع نہیں کر سکتیں انہیں۔"

"خیر آج تو میں نے منع کر دیا ہے لیکن ہمیشہ تو نہیں کر سکتی نا، تین تین شادیاں ہیں اور شادیوں کا کتنا کام ہوتا ہے۔"

"جب تمہاری شادی ہو گی نا تو کسی نے تمہاری مدد نہیں کروانی لکھ کر رکھ لو۔"

اسے بھی ان دنوں زمل کا ہر وقت اوپر موجود ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"لیکن خیر دیکھ لینا، میں بھی سارے کام مونا تائی اور رخسانہ تائی کے ذمے ڈال دوں گا کہ دلہن خود اپنی شادی کی تیاری کرتی اچھی تو نہیں لگتی۔ بس ایک بار میری جاب ہو جائے تو میں نے تمہارے امتحان کا بھی انتظار نہیں کرنا۔"

"اور جاب کب ملے گی زین؟" اس نے اب بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"پتا نہیں ..... مل چکی ہوتی اگر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد آہستگی سے کہا جیسے اپنے آپ سے کہتا ہو۔

"لوگ اتنے دھوکے باز کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے منافق اور فریبی۔"

"تمہیں کس نے دھوکا دیا ہے زین!" زمل نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"پتا نہیں دھوکا یا سازش ..... یا" اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی ہلکورے لے رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے زین!" زمل بے چین ہوئی۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے ملی۔ تمہیں یاد ہے جب

میں اسلام آباد سے واپس آیا تو تمہیں بتایا تھا کہ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے۔ اور پہلی بار مجھے لگا ہے کہ یہاں فیصلے میرٹ پر ہوتے ہوں گے لیکن میرا یقین اور میری امید ٹوٹ گئی۔ مجھے اپائنٹمنٹ لیٹر نہیں ملا تو میں نے سوچا کہ شاید ابھی تقرریاں نہیں ہوئیں۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے مجھے پتا چلا کہ تقرریاں تو کب کی ہو گئیں اور لاہور برانچ کا افتتاح بھی ہو گیا، بہت افسوس ہوا مجھے۔

پہلے بھی کئی بار انٹرویو دیا لیکن سلیکٹ نہ ہونے پر کبھی افسوس نہیں ہوا کیونکہ مجھے پتا ہوتا تھا کہ یہ انٹرویو محض فارملیٹی ہے۔ فیصلے تو پہلے ہی ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس بار مجھے لوگ مختلف لگے تھے۔ تو مجھے یقین تھا کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گا اس لیے کئی دن تک دکھی رہا اور اسی وجہ سے دو اور کمپنیوں میں جہاں سے انٹرویو لیٹر آئے ہوئے تھے انٹرویو دینے گیا ہی نہیں۔

کل شام میں مرسل کے ساتھ کافی پینے گیا تھا۔ وہ زبردستی لے گیا تھا مجھے۔ دراصل وہاں اسے کسی سے ملنا تھا۔ اس کے بھائی کے جاننے والے تھے اور اس نے ان سے اپنی فلاحی تنظیم کے لیے کچھ فنڈز کی درخواست کی تھی۔ وہ اس سے مل کر پہلے اس کی تنظیم اور اس کے مقاصد وغیرہ کے متعلق جاننا چاہتے تھے اور پتا ہے، زمل وہ شخص کون تھا ان افراد میں سے ایک شخص، جنہوں نے اسلام آباد میں میرا انٹرویو لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کمپنی میں کام کر رہا ہوں اور اس کمپنی نے کیا پیکیج دیا ہے۔ تو میں نے بتایا کہ میں کہیں کام نہیں کر رہا ہوں۔ ان کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ابھی تک میں نے کہیں اپلائی نہیں کیا تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوا دیا تھا۔ سی وی میں دیے گئے ایڈریس پر لیکن مجھے وہ لیٹر نہیں ملا۔"

"تم نے اپنا فون نمبر نہیں لکھا تھا۔ اور سیل فون کا کیا گیا ہے تم نے۔" زمل نے پوچھا۔

"لکھا تو تھا لیکن ہمارا ان دنوں فون خراب تھا اور سیل فون ٹوٹ گیا ہے۔ اور ظاہر ہے انہوں نے لیٹر بھجوا دیا تھا تو پھر فون پتا نہیں انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔ خیر ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ شاید اس وقت میرا رزق ان کی کمپنی میں نہیں لکھا ہوا تھا لیکن جب بھی کوئی ویکنسی ہوئی وہ مجھے انفارم کر دیں گے۔ انہوں نے نمبر لے لیا تھا۔ کوئی ویکنسی ہو نہ ہو میرا ٹوٹا ہوا اعتماد ضرور بحال ہوا ہے کہ ہر جگہ سفارش نہیں چلتی، کہیں میرٹ پر بھی فیصلے ہوتے ہیں۔"

پچھلے دس پندرہ دنوں سے جو مایوسی اس پر طاری تھی، اس وقت زمل کو اس کی آنکھوں میں وہ مایوسی نظر نہیں آئی تھی۔

"تم نے شیخو بابا سے پوچھا۔ کیا خبر وہ بھول گئے ہوں تمہیں دینا، آج کل تو اوپر والوں کے کاموں میں مگن چکر بنے ہوئے ہیں۔"

زمل کو خیال آیا تھا کیا خبر شیخو بابا آزین کو لیٹر دینا بھول گئے ہوں۔

"ہاں پوچھا تھا کہہ رہے تھے۔ چودہ پندرہ دن پہلے پوسٹ مین آیا تو تھا وہ ماہ وش بی بی کے کپڑے لینے درزی کے پاس جا رہے تھے تو مرتضیٰ جو اس وقت کہیں باہر جا رہے تھے انہوں نے پوسٹ مین سے ڈاک لی تھی اور میں ابھی اوپر مرتضیٰ سے پوچھنے گیا تھا تو اس نے کہا کہ ہاں اس روز انہوں نے پوسٹ مین سے ڈاک وصول کی تھی اس میں میرا کوئی لیٹر نہیں تھا بلکہ تایا جان کے کچھ کاروباری دوستوں کے خط اور بینک اکاؤنٹ کی اسٹیٹ میٹ تھی لیکن پتا نہیں کیوں زمل مجھے لگا کہ مرتضیٰ نے جو لیٹر وصول کیا تھا وہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ہی ہوگا۔ اور اس نے مجھے نہیں دیا۔"

آزین کی نظریں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"لیکن مرتضیٰ بھلا ایسا کیوں کرے گا زین؟" زمل حیران ہوئی تھی۔

"ہاں بھلا وہ ایسا کیوں کرے گا۔" آزین نے اس کی بات دہرائی تھی۔

"ہاں وہ تو خود تمہاری جاب کے لیے پریشان رہتا ہے کئی بار اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ تمہاری جاب کے لیے کوشش کر رہا ہے۔"

"اچھا!" آزین کا اچھا کافی لمبا تھا۔

"کیا میری جاب کے لیے اس کی پریشانی

حیران کن نہیں ہے، جبکہ نہ میں اس کی ذمہ داری ہوں نہ وہ میرے اخراجات ادا کرتا ہے۔"

"وہ ہمارا کزن ہے، زین تو اس لیے۔" زمل کی نظریں غیر ارادی طور پر ٹیرس کی طرف اٹھی تھیں۔ جہاں مرتضیٰ کھڑا تھا جو فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"ہاں کزن ہے لیکن اپنی جاب سے زیادہ اسے میری جاب کی فکر ہے تو پھر مجھے بھی اس کی جاب کی فکر کرنی چاہیے ہے نا۔"

ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آزین کے لبوں پر آ کر معدوم ہوگئی۔

"لیکن تمہیں پتا ہے زین! وہ جاب نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا بزنس کرنا چاہتا ہے لیکن تایا جان چاہتے ہیں کہ وہ شاہ رخ بھائی کی طرح، ان کے ساتھ کام کرے تاکہ ان کے بعد شاہ رخ بھائی اور مرتضیٰ ان کا بزنس سنبھالیں۔"

"اور یہ سب وہ تم سے ڈسکس کرتا ہے جبکہ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اس کی آنکھوں سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"نہیں مجھ سے تو نہیں۔" زمل نے فوراً وضاحت کی۔ "موناتائی بتا رہی تھیں۔"

"دراصل وہ چاہتی ہیں کہ مہرین کے ایگزام کے بعد وہ مہرین اور مرتضیٰ کی شادی کر دیں لیکن تایا جان کہتے ہیں کہ جب تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا، وہ اس کی شادی نہیں کریں گے۔ فیکٹری ان کے ساتھ جائے یا جو کرنا چاہتا ہے کرے بھلے جاب ہی کر لے لیکن عملی زندگی میں آئے تب۔"

"ہوں؟" آزین اب گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا۔

"تو اگر مجھے جاب نہ ملی تو کیا دادا جان تمہاری رخصتی بھی نہیں کریں گے۔"

"میرا بھلا یہاں کیا ذکر۔" اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی۔

"تمہارا ذکر کیوں نہیں۔" دو سیڑھیاں اتر کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ "بھئی آخر دادا جان کو بھی تو خیال آ سکتا ہے کہ لڑکا پہلے کوئی کام شام کرے پھر رخصتی کریں گے انہوں نے ایسی کوئی شرط رکھ دی تو میں غریب تو مارا جاؤں گا نا۔"

آزین کا موڈ ایک دم بدلا تھا۔ لہجے سے ایک خوش گوار سا احساس جھلکتا تھا۔

"نہیں تو دادا جان اس طرح کی کوئی شرط نہیں لگانے والے۔ بھلے تمہیں جاب ملے یا نہ ملے۔" زمل کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"انہوں نے سوچ رکھا ہے کہ جیسے ہی میرا امتحان ہوتا ہے وہ۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور نگاہیں جھکا لیں۔ رخساروں پر ہلکی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"ہاں ہاں بولو نا۔ رک کیوں گئی ہو۔ وہ کیا کریں گے تمہارے امتحان کے بعد۔"

لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ لیے وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا اسے زمل کی یہ حیا اٹریکٹ کرتی تھی۔

"دراصل ابا کی اس حالت کی وجہ سے دادا جان مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس روز ظفر چاچو سے کہہ رہے تھے کہ وہ پاکستان آنے کا پروگرام بنائیں، تاکہ وہ میرے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔" وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"میری زندگی کے بہت سارے کام ابا کے بغیر ہوئے ہیں تو شادی بھی ہو سکتی ہے۔" ظفر یاب کے ذکر پر وہ یوں ہی رنج ہو جاتا تھا۔ وہ میں دادا جان سے کہتا ہوں فوراً ہی تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ میں حاضر ہوں دل و جان سے ابا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ دادا جان میرے امتحان سے پہلے نہیں کرنے والے میری رخصتی۔"

اس نے ذرا گی ذرا رخ موڑ کر آزین کی طرف دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔

"تو مطلب ابھی چھ سات ماہ مزید انتظار۔ خیر

کرلیں گے انتظار۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ویسے زمل! میں سوچ رہا ہوں مجھے جو بھی جاب ملے مجھے کرلینی چاہیے بھلے وہ میری ڈگری سے متعلق نہ بھی ہو اور بھلے سیلری کم بھی ہو۔ تاکہ کوئی یہ تو نہ کہہ سکے کہ لڑکا جاب لیس ہے۔ ویلا نکما۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ کرلوں کوئی جاب۔"

"کرلو..... اچھا ہے فارغ رہ کر بوریت نہیں ہوگی اور کچھ Experience (تجربہ) بھی ہوجائے گا۔"

زمل نے بس یوں ہی اس کی تائید کی تھی۔ لیکن اس کا موڈ یکدم بدلا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو تم فارغ رہ رہ کر بوریت سی ہونے لگتی ہے، وہی ایک جیسے شب و روز کوئی تبدیلی نہیں۔ کبھی کبھی تو دل اس زندگی سے اکتانے سا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے آنکھیں موند کر پرسکون نیند سو جاؤں۔"

وہ مایوس اور اداس سا نظر آنے لگا تھا۔ آج کل وہ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پل پل اس کا موڈ بدلتا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو زین!" زمل نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"یہ ہر چند دن بعد تمہیں مایوسی اور قنوطیت کا دورہ کیوں پڑتا ہے۔ زندگی بہت خوب صورت ہے زین۔ میں دادا جان بی بی اماں کیا ہم میں سے کوئی بھی تمہیں زندگی کی خوب صورتی کا احساس نہیں دلاتا۔ کیا ہمارا ہونا تمہارے لیے زندہ رہنے کا جواز نہیں ہوسکتا زین!"

"ایسا نہیں زمل!" اس نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔

"باخدا ایسا نہیں ہے۔ میری تو زندگی کا جواز ہی تم لوگ ہو۔ بس پتا نہیں کیوں کبھی کبھی دل بیزار ہو جاتا ہے۔ اتنا کہ زندگی بری لگنے لگتی ہے کہ یار کیا ہے یہ زندگی۔"

"میرا خیال ہے ابا کے ساتھ تم بھی ڈاکٹر ارسلان سے سیشن لینا شروع کردو۔"

زمل کو اس کا مایوسی سے ایسی باتیں کرنا بہت برا لگتا تھا سو وہ ابھی تک ناراض سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"اچھا مشورہ ہے۔ لیکن اس مایوسی اور قنوطیت سے جان چھڑانے کا ایک اور حل بھی ہوسکتا ہے۔"

"کیا؟" زمل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ ہی کہ دادا جان سے کہوں چھوڑیں امتحان وغیرہ کو میری امانت میرے حوالے کریں اور بس پھر ہم دونوں کچھ دنوں کے لیے کہیں دور نکل جائیں سرسبز پہاڑوں کے دامن میں بہتے آبشاروں کے پاس ہر غم و فکر سے آزاد میں اور تم۔" "کیا آج کل کوئی ناول پڑھ رہے ہو زین!"

زمل بے اختیار ہنس پڑی۔ اور داہنے رخسار میں بھنور سا پڑا تھا۔

"نہیں!" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا کہ کسی بہت اپنے کے ساتھ کسی پرسکون جگہ پر کچھ دن گزاریں۔"

"تم مانو یا نہ مانو..... ضرور تم کوئی ناول پڑھ رہے ہو یا پھر سحرش کی ڈائری تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے۔" وہ پھر ہنسی۔

"تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے زمل!" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا اور پھر وہ رخ موڑ کر تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

"سنو، تم میرا ساتھ دو گی نا زمل! اگر میں دادا جان سے کہوں کہ تمہارے امتحان سے پہلے ہی تمہاری رخصتی کردیں۔ تم اعتراض تو نہیں کرو گی نا۔ منع تو نہیں کرو گی زمل۔"

"نہیں ..... لیکن تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے زین۔ صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔" زمل نے اپنی حیرانی چھپا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں کبھی کبھی مجھے وہم سا ستانے لگتا ہے۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں کہ کہیں تمہیں کھو نہ دوں۔ مجھ میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے زنل۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، زنل میں تمہیں کھو کر جی نہیں پاؤں گا۔" وہ بے حد دل گرفتہ سا لگ رہا تھا۔

"تم خوامخواہ قنوطی ہو رہے ہو زین۔ بھلا مجھے تم سے کون چھین سکتا ہے۔ ہمارا نکاح ہو چکا ہے اور۔"

"اماں کو بھی تو کسی نے چھین لیا تھا! ہم سے، حالانکہ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا اور بی بی اماں کہتی ہیں انہیں ابا سے بے حد محبت تھی۔" اس نے زنل کی بات کاٹی۔

"اور ہمارا تو صرف نکاح ہی ہوا ہے نا...... اور شاید کوئی بھی بندھن اتنا مضبوط نہیں ہوتا جو ٹوٹ نہ سکے۔ کیا پتا کبھی تم بھی۔"

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں زین، اگر تم دادا جان سے کہو گے کہ کل ہی رخصتی کر دیں تو کل ہی سہی۔" زنل کو لگا تھا جیسے وہ اس طرح اپنے جذبے کا اظہار کر کے اسے اس قنوطیت سے نکال سکتی ہے۔

"زنل!" کتنی دیر تک وہ جیسے بول ہی نہ سکا اور مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔ اور جب بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"تھینک یو زنل۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی میں اتنا بے یقین ہو جاتا ہوں۔ خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں کسی روز تم بھی اماں کی طرح مجھے چھوڑ کر چلی نہ جاؤ۔ مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا زنل۔ پلیز کبھی نہیں۔"

وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ زنل کی سیاہ آنکھوں میں نمی پھیل گئی، اس نے اپنا ہاتھ زین کے ہاتھ پر رکھ کر یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی آخری سانس تک۔ اور آزین نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے، وہ جیسے بے خود سے بیٹھے بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو ہمیشہ ساتھ رہنے کا یقین دلا رہے تھے۔

اور اوپر میمونہ بیگم کے کمرے سے نکل کر مرتضیٰ کو بلانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف جاتی ہوئی سحرش نے رک کر، ٹیرس کی ریلنگ کے نزدیک پڑی آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے نیم دراز مرتضیٰ کو دیکھا اور اس کی طرف چلی آئی۔

"آپ یہاں ہیں مرتضیٰ بھائی! میں آپ کو ہی بلانے جا رہی تھی اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"کیوں خیریت؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں وہ انویٹیشن کارڈز کے متعلق بات کرنی تھی انہوں نے کہ آپ نے کوئی ڈیزائن پسند کیا ہے تو چھپنے کے لیے دے دیں۔ اور بھی کوئی کام ہو گا شاید آپ پوچھ لیں خود جا کر۔ میں تو ذرا مہرین کی طرف جا رہی ہوں۔"

واپس پلٹتے ہوئے عادتاً اس نے نیچے جھانکا اور ٹھٹک گئی۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے آزین اور زنل......

"واؤ!" اس نے سیٹی کے سے انداز میں ہونٹ گول کیے۔

پہلی بار اس نے انہیں یوں اس طرح بیٹھے دیکھا تھا...... اور عین اسی وقت اٹھتے ہوئے مرتضیٰ نے بھی ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر انہیں دیکھا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اور ایک عجیب سے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شاید حسد، جلن اور تیزی سے میمونہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سحرش نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں اور آنکھوں میں بل کھاتے غصے کو، گہری نظر سے دیکھا اور مہرین کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے واپس میمونہ بیگم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ جہاں مرتضیٰ ارباب کچھ اکڑے اکڑے سے کرسی پر بیٹھے تھے اور میمونہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

"آخر کارڈ کب چھپ کر آئیں گے مرتضیٰ!"

"چھپ جائیں گے۔ آپ کو اتنی جلدی کیا

pklibrary.com

ہے۔" مرتضیٰ کہہ رہا تھا وہ خاموشی سے میمونہ بیگم کے پاس آ کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"جلدی تو ہے نا مرتضیٰ دوسرے شہروں میں رہنے والے عزیزوں کو تو پہلے ہی بھجوانے ہوں گے نا۔ اب پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ نائی گھر گھر جا کر دعوت دیں۔ کارڈ ڈاک میں، بھجوائیں گے اور فون کر دیں گے۔" میمونہ بیگم اکثر یہی بات کرتی تھیں۔

"چھپ کر آ جائیں گے دو تین روز میں۔" مرتضیٰ بیزار سا ہو رہا تھا۔

"اور آج ذرا وقت نکال کر شاہ رخ کے ساتھ چلے جاؤ اور اس کی پسند کے کپڑے خرید دو۔"

میمونہ نے شاہ رخ کے کپڑے خریدنے کا کام مرتضیٰ کے لیے ہی رکھ چھوڑا تھا۔

"میرا جانا کیا ضروری ہے۔ شاہ رخ سے کہیں اپنے لیے خود ہی شاپنگ کر لے۔ جو کچھ اور لینا ہے اس کی لسٹ بنا کر دے دیں اسے۔ کوئی غیر تو نہیں ہے کزن ہے وہ ہمارا۔"

سحرش کو مرتضیٰ کا موڈ بے حد خراب لگا تھا اور وہ اس خراب موڈ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، اسے لگتا تھا کہ اس کے اندازے مرتضیٰ کے متعلق غلط نہیں ہیں اور یہ کوئی اچھی بات ہرگز نہیں تھی۔

"کزن تو ہے بیٹا! پر اب وہ تمہارا ہونے والا بہنوئی بھی ہے۔ اور کیا اچھا لگے گا کہ اس سے کہوں کہ ہماری طرف سے اپنی شادی کی شاپنگ خود ہی کر لو۔"

میمونہ بیگم کو مرتضیٰ کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"آج شام چلے جاؤ یا کل دن کو چلے جانا کل یوں بھی چھٹی ہے شاہ رخ کو فیکٹری نہیں جانا ہوگا۔ اس سے ہی طے کر لو۔ اس نے عقیل کے لیے بھی شاپنگ کرنی ہوگی خود ہی کیونکہ عقیل تو پارات سے دو تین دن پہلے ہی آئے گا۔" اس بار مرتضیٰ نے سر ہلا دیا۔

"مونا اماں!" سحرش نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

"مہرو کے لیے بھی تو جوڑا لینا ہوگا نا آپ نے۔ اس کے بھائی اور بہن کی شادی ہے تو سسرال سے جوڑا جانا تو بنتا ہے نا یاد ہے بڑے ماموں کے بیٹے کی جب شادی ہوئی تھی تو فروا آپا کے سسرال سے جوڑا آیا تھا۔ معاد دوسرے سامان کے۔"

"ہاں میری تو مت ہی ماری گئی ہے ان شادی کے کاموں میں الجھ کر شکر ہے تم نے یاد دلایا۔"

میمونہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور مرتضیٰ نے تیز برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم یہ اپنے مفت مشورے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔"

"ہاں تو کیا غلط کہہ دیا اس نے۔ تمہیں کیا پتا رسم ورواج کا۔" میمونہ بیگم نے مرتضیٰ کو گھورا اور پھر سحرش کی طرف دیکھا۔

"ایسا کرنا سحری! آج تم کسی وقت بلال اور مہرو کو لے کر اس کی پسند کا جوڑا اور دوسری چیزیں لے آنا۔ وقت سے پہلے ہر چیز تیار ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ وقت پر بھگدڑ مچ جاتی ہے کہ یہ نہیں تو وہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے اماں! آج کھانے کے بعد لے آئیں گے جا کر۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں اماں، باوش کی مایوں پر مہرین کو انگوٹھی پہنا کر باقاعدہ منگنی کا اعلان بھی کر دیں۔ ویسے میں تو سب کو بتا ہے لیکن باہر بھی دوسرے لوگوں کا پتا چل جائے آج کل مائیں اپنے بیٹوں کے لیے ڈاکٹر لڑکیوں کے رشتے ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اس روز میری دوست بھی پوچھ رہی تھی کہ تمہاری کزن مہرین کی کہیں بات چیت طے تو نہیں ہو چکی۔"

مہرین نے کن انکھیوں سے مرتضیٰ کی طرف دیکھا جو دانت پیستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو بتا دینا تھا نا اپنی دوست کو کہ آ جائے اپنے بھائی کا رشتہ لے کر۔"

"اے ہے مرتضیٰ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے جو منہ میں آتا ہے اول فول بولتے چلے جاتے ہو۔ بچپن سے تمہارا اور مہرو کا رشتہ طے ہے۔"

میمونہ بیگم کو برا لگا تھا۔

''میں بچپن کے رشتوں کو نہیں مانتا اور نہیں کرنی مجھے اس سے شادی۔''

''ہیں یہ کیا بک رہا ہے مرتضیٰ!'' میمونہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے بھائی۔ شادی تو آپ کی مہرین سے ہی ہوگی۔'' سحرش نے اسے تپایا اور وہ تپ گیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہ نہ بھولیے گا کہ ماہا آپ کی بہن کی شادی مہرین کے بھائی سے ہو رہی ہے۔'' اس نے جتایا تو وہ تنتناتا ہوا باہر نکل گیا۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہا تھا سحری۔'' میمونہ بوکھلا گئی تھیں۔

''کچھ نہیں مونا اماں۔ ایسے دورے کبھی کبھی لڑکوں کو پڑتے رہتے ہیں۔'' اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''آپ ابا سے بات کر کے مہرین اور مرتضیٰ بھائی کی منگنی اناؤنس کر دیں۔''

اور انہوں نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ایسی ہی تھی اپنے رشتوں کے ساتھ بے حد مخلص اور جب سے اس نے مرتضیٰ کی نظروں کی چوری پکڑی تھی تب سے ہی وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح مرتضیٰ کو احساس دلا دے کہ اس کی منزل کیا ہے۔ اور یہ اس کا راستہ نہیں ہے۔ جس پر چلنے کو وہ بے تاب ہو رہا ہے۔

''ٹو ٹینشن ڈیر مونا جی!'' وہ مسکرائی اور میمونہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا انہیں اپنی اس آخری اولاد کے بے دھڑک اور بہت بولنے سے اکثر شکایت رہتی تھی لیکن کئی بار اس کا یوں بولنا ان کے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا تھا۔

''او کے۔ آج ابا سے ضرور بات کر لیجیے گا۔'' وہ ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

مرتضیٰ باہر کہیں نہیں تھا وہ مسکراتے ہوئے ٹیرس کی طرف بڑھی۔ وہ دونوں ابھی تک وہاں ہی بیٹھے تھے۔ زمل نگاہیں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور آزین اپنا دایاں گھٹنا مسلسل ہلاتے ہوئے پاؤں ہولے ہولے زمین پر مار رہا تھا۔

بہت سارے خاموش لمحے ان کے درمیان سے گزر گئے تھے۔ ان کو کبھی کسی اظہار کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک مضبوط بندھن میں بندھے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہیں لیکن پچھلے چند ماہ سے پتا نہیں کیوں آزین کو ایسا لگنے لگا تھا کہ اسے زمل کو بتاتے رہنا چاہیے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ کتنی محبت کرتا ہے وہ اس سے اور اپنی پوری زندگی اس کے سنگ گزارنا چاہتا ہے۔ اور آج زمل نے اسے معتبر کر دیا تھا۔

''تھینک یو ملی، اینڈ سوری کہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔ تم آرام سے اپنا امتحان دو میں تو بس یونہی کبھی کبھی۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں یوں ہی کبھی کبھی تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔''

وہ ہولے سے ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اسے آزین کی بے یقینی سے خوف آتا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ بدگمان نہ ہو جائے کہ ابھی تو وہ صبوحی چچی کے چلے جانے کے دکھ اور حیرت سے نہیں نکلا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو تم!'' اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو نظریں سامنے ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے اپنی طرف دیکھتی سحرش پر پڑیں تو وہ بے اختیار مسکرایا۔

''لو جی مس جاسوس صاحبہ اپنی ڈیوٹی دینے آ گئی ہیں۔''

زمل نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو وہ بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرائی۔ اور دل ہی دل میں کہا۔ ''پیارے لوگو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آج میں نے تمہارے لیے بارش آنے سے پہلے ہی بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔'' اپنی ڈائری میں لکھا ہوا ایک جملہ یاد آنے پر اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی بارشیں اتنی طوفانی ہوتی ہیں کہ مضبوط بند بھی توڑ دیتی ہیں اور یہ تو....."

تب ہی اس کی نظر کچن سے باہر آتی بی بی اماں پر پڑی تو وہ مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اس وقت اس کا موڈ بی بی اماں کی طنزیہ نظروں کا سامنا کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔

بی بی اماں آزین اور زمل کو سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر ادھر ہی چلی آئیں۔

"زین بیٹا! صبح تم کہہ رہے تھے آج عصر کے بعد تمہارے دوستوں نے آنا ہے میٹنگ کے لیے میں نے ساجدہ سے کہہ دیا تھا کہ گیسٹ روم کی صفائی اور ڈسٹنگ کر دے۔ اور تم بتاؤ اگر دیر سے جائیں گے وہ لوگ تو کھانا تیار کرنا ہے۔"

"ارے نہیں بی بی اماں! آپ جو چائے وغیرہ بھجواتی ہیں اس پر بھی وہ شرمندہ ہوتے رہتے ہیں۔"

آزین اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لو بھلا اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ گھر آئے مہمانوں کو چائے بھی نہ پوچھ سکیں۔"

بی بی اماں برا مان گئی تھیں۔

"وہ مہمان کہاں ہیں بی بی اماں۔ اپنے کام سے آتے ہیں۔ خیر آپ صرف چائے بھجوا دیا کریں ساتھ میں اور کچھ نہیں۔"

"دیکھ لیں گے میاں۔ کتنے بجے آئیں گے۔"

بی بی اماں اپنی مرضی کی مالک تھیں۔

"عصر کے بعد آنے کو کہا تھا۔ لنچ میں کیا کھلا رہی ہیں آپ۔ اگر کوئی میری پسند کی شے نہ ہو تو کھانا کھا کر ایک دوست کی طرف جاؤں گا۔ ورنہ اس کے ساتھ ہی نکالوں گا۔ لیکن عصر سے پہلے آجاؤں گا۔"

آزین نے ایک دوست سے شیخو بابا کی جاب کے لیے بات کی تھی اس سے ہی ملنے جانا تھا اور اس نے کہا تھا کہ جلدی آجانا کھانا ساتھ ہی کھالیں گے، لیکن آزین کھانا گھر میں ہی کھانا پسند کرتا تھا۔

"مٹن قورمہ اور ساتھ میں بھنڈی کی بھجیا ہے۔"

بی بی اماں آزین اور زمل کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے خود سے بھی فرمائش نہیں کی تھی بی بی اماں جو پکاتی تھیں کھا لیتے تھے لیکن بی بی اماں خود ہی سب کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔

"گڈ۔" آزین خوش ہوا تھا۔

"آپ ذرا کھانا ظہر کی نماز کے فوراً بعد لگوا دیجیے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں نے ویسے ہی ساجدہ سے کہا تھا ایک بجے تک آجائے۔"

دن میں روٹیاں ساجدہ بناتی تھی رات کو زمل پکا لیتی تھی "اور ہاں۔" انہیں یاد آیا۔

"یہ شیخو ابھی تک بازار سے نہیں آیا میں نے چینی کے لیے کہا تھا کہ لے آئے۔"

"شیخو بابا چینی لے آئے تھے۔ ساجدہ نے کچن میں رکھ دی تھی۔ جب آپ چاشت کی نماز پڑھ رہی تھیں تب شیخو بابا آگئے تھے اور اب وہ ابا کے پاس ہیں۔ کوئی اور کام بھی تھا کیا ان سے۔" زمل نے بتایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں تمہارے ابا بہت خوش ہوتے ہیں شیخو کی باتیں سن کر، پتا نہیں وہ کیا ہولے ہولے بولتا رہتا ہے اور وہ سن کر خوش ہوتے رہتے ہیں لیکن اوپر والوں کے بکھیڑے ہی ختم نہیں ہوتے کہ بے چارہ سکون سے زیبی کے پاس بیٹھ سکے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی تار پر سے دھلی ہوئی صافیاں اتارنے لگیں۔ تب ہی شیخو بابا شاہ زیب کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ اور وہاں سے ہی آزین کو آواز دی۔

"زین بھائی! زین بھائی جلدی آئیں پتا نہیں شاہ زیب صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔"

اور فوراً ہی واپس کمرے میں چلے گئے۔

آزین اور زمل نے تقریباً دوڑتے ہوئے صحن عبور کیا۔ کھلے دروازے سے شاہ زیب کے رونے کی آواز برآمدے تک آرہی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک

لگائے زمین پر بیٹھے تھے اور رو رہے تھے۔ شیخو بابا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔

"شاہ بابا، پلیز شاہ بابا کیا ہو گیا ہے آپ کو اس طرح مت روئیں۔ مت روئیں شاہ بابا، میرا دل پھٹ جائے گا۔" زمل نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے سنا تھا۔

"ابا..... ابا کیا ہوا ہے آپ کو؟" آزین اور وہ ایک ساتھ ہی ان کی طرف بڑھے تھے۔

"چاچو!" آزین نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ شیخو بابا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"چاچو، پلیز کچھ تو بولیں کیا ہوا ہے۔ کوئی درد ہے کہیں کوئی اور تکلیف۔" لیکن وہ اسی طرح روئے چلے جا رہے تھے اور ہولے ہولے ان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"ابا..... ابا۔" زمل نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ میری طرف دیکھیں ابا۔ میں آپ کی بیٹی زمل۔"

انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ تھوڑا سا بلند کیا۔ ہونٹ کھلے اور پھر بند ہو گئے۔

"ہاں..... ہاں ابا، بولیں نا کیا ہوا ہے آپ کو۔ کیوں اس طرح رو رہے ہیں؟"

زمل کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

ان کے لب کپکپائے اور ہاتھ نیچے گر گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں سر ڈھلک گیا۔

"زین ابا!" زمل کی چیخ نکلی تھی۔

"حوصلہ میری بچی کچھ نہیں ہوگا میرے زہبی کو۔" بی بی اماں نے جوان کے پیچھے ہی بوکھلائی ہوئی سی آئی تھیں۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور پھر آزین کی طرف دیکھا۔

"زین بیٹا زہبی شاید نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ پہلے انہیں بیڈ پر لٹاؤ اور پھر ڈاکٹر کو فون کرو۔"

بی بی اماں بزرگ تھیں اور حوصلے والی بھی۔

"جی بی بی اماں۔"

آزین جوان کا سر کندھے سے ٹکائے ابھی تک انہیں خود سے لپٹائے بیٹھا تھا۔ چونکا اور انہیں دونوں بازوؤں میں اٹھا کر شیخو کی مدد سے بیڈ پر لٹایا۔ اور خود تیزی سے باہر نکل گیا زمل اٹھ کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ان کی نبض چیک کی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔ پیشانی پر بکھرے لائٹ براؤن سلکی بالوں کو پیچھے کیا۔ آنسو تیزی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"ابا..... ابا پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔ اماں کے بعد آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ پلیز ابا۔"

بی بی اماں بیڈ کی دوسری سمت بیٹھ کر مسلسل دعا کرتے ہوئے پھونک رہی تھی۔ شیخو بابا کچھ دیر بے بس سے کھڑے رہے۔ پھر پائنتی بیٹھ کر ان کے پاؤں کے تلوے سہلانے لگے۔ بی بی اماں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا اور خود بھی ان کی ہتھیلی کو اپنے دوپٹے کے پلو سے سہلانے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی آزین ڈاکٹر ارسلان کو فون کر کے اور جہاں زیب بیگ کو بتا کر آ گیا۔

"ڈاکٹر ارسلان کلینک کے لیے نکل ہی رہے تھے آ رہے ہیں۔ اب ادھر سے ہوتے ہوئے جائیں گے۔"

وہ بھی بیڈ کی پائنتی کے دوسری طرف بیٹھ گیا تو جہاں زیب بیگ کمرے میں داخل ہوئے۔ شیخو بابا کھڑے ہو گئے۔ زمل اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

"دادا جان ابا..... ابا ٹھیک ہو جائیں گے نا۔"

"ان شاء اللہ ہمارا زہبی ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کا بازو تھپتھپا کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئے جھک کر شاہ زیب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"میرے بچے، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ، کیوں امتحان لے رہے ہو ہمارا۔" آنسو ان کی بوڑھی

آنکھوں میں مچل رہے تھے۔

"زیبی، میرے لاڈلے کون سا دکھ دل میں چھپائے سب سے خود سے خفا ہو گئے ہو۔"

بی بی اماں بیڈ سے اٹھ کر پیچھے کھڑی ہو گئی تھیں اور زل کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ادھر آ کر بیٹھ جائے۔ زل نے دیکھا، شیخو بابا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے ان کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ شاید وہ بھی بی بی اماں کی طرح دل ہی دل میں کچھ پڑھ کر دعا کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ لحہ لحہ بعد شاید بے قرار ہو کر آنکھوں کے کونوں میں آ جانے والے آنسو کو ہتھیلی سے پونچھتے تھے۔

وہ لحہ بھر کو حیران ہوئی اور پھر بیڈ پر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ بوسہ دیا۔ اور آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔ وہ بے سدھ پڑے تھے۔ لانبی پلکوں والی خوب صورت آنکھیں بند تھیں۔ "دعا کرو بیٹا، اپنے ابا کی صحت زندگی کے لیے۔"

بی بی اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

کمرے میں موجود پانچوں نفوس مسلسل دعا کر رہے تھے۔ وہ کبھی نبض پر ہاتھ رکھتی کبھی سینے پر سر رکھ کر دھڑکن محسوس کرتی کبھی ہاتھ سہلانے لگتی۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔

"ڈاکٹر ارسلان ابھی تک نہیں آئے زین۔" بھیگی پلکیں اوپر اٹھیں۔ آزین نے دل پر کچھ ہوا!

"آتے ہوں گے زل۔ دس پندرہ منٹ تک آنے کو کہا تھا انہوں نے نزدیک ہی تو ہے ان کا گھر۔"

آزین نے نظروں ہی نظروں میں اسے تسلی دی۔ تب ہی باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

"ڈاکٹر صاحب آ گئے۔" شیخو بابا کے ساتھ آزین بھی باہر چلا گیا تو وہ بی بی اماں کے ساتھ کچن میں ہی آ کر بیٹھ گئی۔ اور کچن ٹیبل پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"نہ رو میری بچی، اللہ ہمارے زیبی کو صحت و زندگی دے گا۔ اتنی زیادہ دوائیں اور اس کے ساتھ خوراک کے چڑیا جیسی کمزوری ہو گئی ہے اسے۔"

بی بی اماں نے اس کا سر تھپتھپایا اور فریج سے جوس نکالنے لگیں۔ لیکن وہ یونہی بازو ٹیبل پر رکھے ان میں سر چھپائے ہولے ہولے روتی رہی۔ بی بی اماں کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہیں، پھر گلاس میں جوس ڈال کر گلاس ٹرے میں رکھا اور باہر نکل گئیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ بی بی اماں واپس نہیں آئی تھیں۔ اور وہ یوں ہی اسی انداز میں بیٹھی رہی، جب آزین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی اور سر اٹھا کر آزین کی طرف دیکھتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

"ابا کیسے ہیں۔ ہوش آ گیا انہیں۔ کیا کہا ہے ڈاکٹر نے۔"

"ٹھیک ہیں اب...... اور ڈاکٹر ارسلان نے کہا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ماضی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ شاید کوئی تکلیف دہ یاد تھی جس نے انہیں اس طرح رلا دیا اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خوش آئند بات ہے ایسے فیز اب آتے رہیں گے۔ کبھی کوئی خوش گوار یاد ذہن کے دروازے پر دستک دے گی اور کبھی کوئی دکھ اچانک یاد آئے گا اور ایک روز آئے گا جب وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر ارسلان بہت مطمئن تھے زل!"

"میں ابا کو دیکھ آؤں۔" زل اٹھی تو آزین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر ارسلان نے انہیں سکون کے لیے انجکشن لگایا ہے اور وہ سو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب تین چار گھنٹے سکون سے سوتے رہیں گے اور جب تک وہ خود نہ اٹھیں انہیں نہ اٹھایا جائے۔ اور پتا ہے جب ڈاکٹر ارسلان انہیں انجکشن لگا رہے تھے تو انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جا رہے تھے کہ ابا جان وہ چلی گئی۔ ناراض ہو کر چھوڑ گئی۔ وہ یقیناً مریم چچی کی بات کر رہے تھے۔ دادا جان صحیح کہتے ہیں کہ انہوں نے مریم چچی کا دکھ دل سے لگا لیا ہے۔"

''اور اب ان کے پاس کون ہے؟'' زمل نے پوچھا۔

''ابھی تو شیخو بابا ہیں لیکن میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اگر جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ چاچو تو چند گھنٹے سوتے رہیں گے۔ میں ذرا دادا جان کے پاس جا رہا ہوں۔ ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ ان کا بی پی تھوڑا لو ہو رہا تھا۔ بی بی اماں ان کے لیے یخنی بنا کر لے گئی ہیں۔'' آزین نے بتایا۔

''میں ایک نظر ابا کو دیکھ کر دادا جان کے پاس آ رہی ہوں۔''

زمل اٹھ کھڑی ہوئی تو آزین سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے سنک کے نل سے پانی لے کر منہ پر چند چھینٹے مارے اور دوپٹے کے پلو سے چہرہ اچھی طرح پونچھ کر شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو شیخو بابا بیڈ کے نزدیک کرسی بچھائے شاہ زیب کے بازو پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنے پر کھڑے ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح نگاہیں جھکائے۔ اس نے بیڈ کے قریب آ کر دیکھا۔ وہ بہت پرسکون اور گہری نیند سو رہے تھے۔

''آپ ابا کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ شیخو بابا، بہت شکریہ۔ آپ کو کہیں جانا ہو تو چلے جائیں۔ میں انہیں دیکھتی رہوں گی۔ ابھی میں ذرا دادا جان کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ شیخو بابا کی بہت ممنون تھی۔

''جی ابھی کچھ دیر میں ادھر ہی بیٹھوں گا۔'' شیخو بابا کی نظریں اپنے پیروں پر تھیں۔

''آپ بڑے صاحب کو حوصلہ دیں۔ بہت گھبرا گئے تھے وہ شاہ بابا کی حالت دیکھ کر۔''

''شاہ بابا۔'' وہ جاتے جاتے مڑی۔

''آپ ابا کو شاہ بابا کہتے ہیں۔''

''ہاں وہ.....'' شیخو بابا ذرا سا گھبرائے کہ غیر اختیاری طور پر لبوں سے نکل گیا تھا۔ ''شاہ زیب صاحب کہتے ہیں۔ میں انہیں شاہ زیب صاحب نہ کہا کروں۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تو وہ اس لیے۔''

زمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کا دل چاہے اور جیسے ابا خوش ہوں میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

وہ جہاں زیب بیگ کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ کراؤن سے، ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور آزین کہہ رہا تھا۔

''دادا جان اگر آپ ہی حوصلہ ہار جائیں گے تو میں اور زمل کیا کریں گے۔''

''کیا کروں زین، گیارہ سال ہو گئے زیب کو اس حالت میں دیکھتے ہوئے۔ یہ کیسا امتحان ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔'' وہ بے بسی سے آزین کو دیکھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر ارسلان بہت پرامید ہیں دادا جان! ان شاء اللہ۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ خاموشی سے آ کر دادا جان کے بیڈ پر بیٹھ گئی انہوں نے ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹی!''

''دادا جان!'' اس نے ان کے پیر ہاتھ رکھا۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ ''ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ ایسا خیال نہیں رکھتے نا۔''

''کچھ نہیں ہوا مجھے، عمر کا تقاضا ہے ذرا سی پریشانی سے دل گھبرا جاتا ہے۔'' وہ مسکرائے اور زین کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں نے اپنے لیے شادی کی شاپنگ ابھی تک نہیں کی۔ اس روز بھی میں نے تمہیں کہا تھا کہ کسی روز اسے ساتھ لے جاؤ اور ہر فنکشن کے حساب سے خریداری کر لو۔ بی بی اماں اور شیخو بابا کے لیے بھی شاپنگ کر لینا۔ خود سے تو اس نے ابھی تک کچھ نہیں لیا۔''

''جی دادا جان کل کا پروگرام رکھ لیتا ہوں۔ آج شام کو تو ارسل وغیرہ کی میٹنگ ہے۔ وہی ''نورے والا'' گاؤں میں کلینک اور دستکاری سکول کھولنے کے سلسلے میں۔'' آزین نے بتایا۔

"ٹھیک ہے پھر کل یاد سے چلے جانا۔ اختر بانو کا بھی فون آیا تھا کہ وہ شادی سے ہفتہ بھر پہلے ہی آجائے گی امان کے ساتھ۔ ثوبان وغیرہ بارات سے ایک دن پہلے آئیں گے۔"

"سچ دادا جان، پھپھو کتنے عرصہ بعد آئیں گی۔" زمل خوش ہوگئی۔

"ہاں اور ظفریاب بھی پروگرام بنا رہے ہیں آنے کا۔ جب سے گیا ہے ایک بار آیا ہے اور اب بھی سات سال ہوگئے ہیں پتا نہیں کیسے اجنبی ملک میں دل لگالیا ہے اس نے۔" وہ افسردہ ہوگئے تھے۔

"شکر کریں اب بھی خیال آ گیا آنے کا۔ مرتضیٰ بتا رہا تھا ارباب تایا نے بہت اصرار کیا ہے ان کے آنے کے لیے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"باپ ہے وہ تمہارا زین! بہت محبت کرتا ہے وہ تم سے۔" جہاں زیب بیگ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"تم اتنے خفا کیوں ہو اس سے بچے۔ شادی کر کے کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔ سب نے ہی اس کی تنہائی دیکھ کر اسے شادی کے لیے مجبور کیا تھا۔"

وہ خاموش ہی رہا۔ جہاں زیب بیگ کے سامنے وہ کم ہی باپ کے خلاف بولتا تھا لیکن بی بی اماں اور زمل کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔

"اپنا دل صاف کرلو بچے۔"

"جی دادا جان میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا اس لیے کچھ دیر کے لیے سونا چاہتا ہوں۔"

"ہاں جاؤ آرام کرو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

جہاں زیب بیگ کی نظروں میں اس کے لیے محبت اور شفقت تھی۔

"زمل، مجھے کھانے کے لیے مت جگانا۔ اگر میں سو گیا تو۔" اس نے جاتے جاتے زمل کی طرف دیکھا۔

"لیکن تمہیں تو کھانا کھا کر اپنے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔"

"ہاں لیکن اب نہیں جا رہا فون کر کے بتا دوں گا اسے۔"

اس کا موڈ یوں ہی لمحوں میں بدلتا تھا۔ زمل نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ماں باپ کا ذکر اسے ہمیشہ ہی ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ اور اب بھی ظفریاب کے ذکر نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر لیٹا تو کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔ ظفریاب نے شادی کی یہ ان کا حق تھا لیکن شادی کے بعد اسے چھوڑ کر باہر چلے جانا اور ماما کے جانے کے بعد اسے نظر انداز کر دینا آج بھی اسے اذیت دیتا تھا۔

کافی دیر بعد اسے نیند آئی تھی اس لیے عصر سے ذرا پہلے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر آیا کہ کمرے میں گھٹن اور حبس ہو رہی تھی۔ پنکھا بند تھا شاید بجلی نہیں تھی۔ بی بی اماں باہر تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں دستی پنکھا تھا۔

"جاگ گئے ہو زین بیٹا! کھانا گرم کروں۔"

"نہیں۔" وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "شیخو بتا رہا تھا کہ ٹرانسفارمر جل گیا ہے یا خراب ہوگیا ہے۔ تین چار گھنٹے لگیں گے ٹھیک ہونے میں۔"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پنکھا اس کی طرف بڑھایا۔

"گیسٹ روم میں تو بہت حبس ہوگا اس موسم میں، کہو تو یہاں صحن میں تمہارے دوستوں کے لیے کرسیاں لگوادوں۔ آنے ہی والے ہوں گے وہ لوگ۔"

"دادا جان سے پوچھ لیں اگر وہ اجازت دیں تو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"دادا جان اور چاچو ٹھیک ہیں۔"

"ہاں!" بی بی اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ عصر کی نماز مسجد میں ہی پڑھ کر آؤں گا اب۔"

وہ بی بی اماں کو بتا کر باہر نکل گیا اور بی بی اماں دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی

ہوئیں تاکہ جہاں زیب بیگ سے صحن میں آ زین کے دوستوں کے لیے بیٹھنے کی اجازت لے سکیں۔

☆☆☆

آج بڑے دنوں بعد حویلی میں رونق سی لگی تھی۔ ریحان اور نعمان بھی کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ مہران اور زمان بھی آئے ہوئے تھے۔ مہران تو فوراً ہی بیوی بچوں کو لے کر واپس کراچی چلے گئے تھے کہ چھٹیاں، ختم ہونے والی تھیں اور وہ کب سے کراچی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا میٹرک میں تھا جب کہ دونوں چھوٹی بیٹیاں بالترتیب ساتویں اور آٹھویں میں تھیں۔ مہران چھٹیوں میں ہمیشہ انہیں کراچی بلا لیتے تھے لیکن اس بار پہلے تو وہ جاپان گئے ہوئے تھے۔ پھر کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ وہ نہ خود آ سکے نہ بلا سکے۔ زمان کا ارادہ البتہ ہفتہ بھر ٹھہرنے کا تھا۔

اختر بانو بہت خوش تھیں۔ اتنے دنوں بعد بیٹوں سے ملی تھیں لیکن ان کا رویہ ہمیشہ کی طرح تھا روکھا روکھا اور کسی قدر اجنبیت لیے ہوئے۔ گو وہ اس کی عادی تھیں لیکن ہر بار نئے سرے سے تکلیف ہوتی تھی پھر بھی خوشی خوشی انہوں نے اپنی نگرانی میں ان کی پسند کا کھانا بنوایا تھا۔ انہوں نے بھاگی کی مدد سے کھانا لگوایا اور خود کھیر فرج میں رکھنے چلیں گئی۔

نعمان اور ریحان کو بادام کی کھیر بہت پسند تھی اور وہ فرمائش کر کے اپنی پھوپھی سلطانہ سے بنوایا کرتے تھے۔ اختر بانو نے اس سے ہی باداموں کی کھیر بنانی سیکھی تھی۔ جب وہ کھیر کے باؤل فرج میں رکھوا کر واپس آئیں تو سب ہی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔

"ارے بھابی، آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ یہاں آنتیں بھوک سے قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔" زمان شاہ نے ہمیشہ ہی ان کا احترام کیا تھا۔

"آپ شروع کر دیتے زمان بھائی!" وہ شرمندہ ہوئیں۔

"مجھے خیال آیا تھا کہ کھیر کے دو باؤل کاؤنٹر پر ہی رہ گئے تھے تو میں وہ فرج میں رکھنے گئی تھی۔"

وہ امان کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"اوہ بادام کی کھیر!" نعمان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"ہاں بادام کی کھیر۔" وہ مسکرائیں۔

"لیکن وہ اتنی جلدی ٹھنڈی تو نہیں ہوگی اور ڈنر شاید۔ ہم گھر پر نہ کریں۔ مطلب میں اور ریحان۔"

"میں نے دو باؤل صبح کھیر بنتے ہی رکھ دیئے تھے۔ اب تک خوب ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔"

وہ نعمان کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس نے تشکر نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا اور پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے جبکہ ثوبان شاہ کھانا کھاتے ہوئے، زمان شاہ اور نعمان سے کراچی کے معاملات پر باتیں کر رہے تھے۔ اختر بانو گاہے گاہے نظر اٹھا کر ریحان اور نومان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھیں جبکہ امان ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کچھ ان کی پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ثوبان شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے اختر کب جانا ہے لاہور۔"

"جی..... وہ ابا جان تو کہہ رہے تھے کہ دس بارہ دن پہلے آ جانا۔ لیکن میں سوچ رہی ہوں ہفتہ بھر پہلے چلی جاؤں۔"

سوالیہ نظریں ثوبان شاہ کی طرف اٹھیں۔

"چچا جان صحیح کہہ رہے ہیں۔ دس بارہ دن پہلے ہی چلی جاؤ۔ دو تین دن پہلے میری ان سے بات ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی کہا تھا انہوں نے یوں بھی اتنے عرصہ بعد جا رہی ہو تو۔"

بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے پانی کا گلاس اپنی طرف کھسکایا اور دو گھونٹ بھر کر رکھ دیا۔

"بلکہ میرا خیال ہے تم اور مانی۔ ریحان اور نعمان کے ساتھ ہی کراچی چلے جاؤ۔ کچھ دن وہاں رہ کر شاپنگ کر لینا۔ اپنے اور مانی کے لیے بھی اور

وہاں بھی سب کے لیے جو گفٹ لے کر جانے ہیں۔ وہ بھی لے لینا اور جن کی شادی ہے ان بچوں کے لیے گولڈ کی کوئی چیز لے لینا۔ اور پھر وہاں سے ہی بائے ایر چلے جانا تم لوگ۔ میں تمہاری اور مانی کی سیٹ بک کروا کے لاہور اطلاع کر دوں گا آزین آجائے گا ایئر پورٹ پر۔"

"جی!" اختر بانو نے ان کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح ان کے کسی معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ من بھیگنے لگا تھا۔

"اور آپ!" شاید ثوبان شاہ نہ آئیں دل میں خیال آیا تھا۔ "میں ریحان اور نعمان بارات سے ایک دن پہلے آجائیں گے۔"

انہوں نے اختر بانو کی آنکھوں کی حیرت کو محسوس کیا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

"میں اور نومی..... کیا مطلب ہے بابا ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔" ریحان حیران ہوا تھا۔

"تمہارے ماموں زاد بھائی اور بہنوں کی شادی ہے۔ شادی میں شرکت کرنا۔" اب ثوبان شاہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"لیکن بابا! مجھے نہیں یاد کہ اپنے ہوش میں ہم کبھی وہاں مطلب لاہور گئے ہوں۔ ہمیں تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے ننھیال میں کون کون ہے۔" اور ریحان کی بات سن کر اختر بانو کو لگا جیسے دل میں کسی نے نشتر چبھویا ہو۔ وہ جب بھی میکے جاتی تھیں دادی اور اماں جان بچوں کو روک لیتی تھیں۔ ان کے پاس کئی بہانے ہوتے تھے۔

"ہم اتنے دن بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتے اور بچے بھی تو ہم سے ملے ہوئے ہیں۔"

"بچوں کی وجہ سے پابند ہو جاؤ گی۔ میکے جا رہی ہو تو خوب انجوائے کرنا وہاں۔ اور سب سے بڑھ کر پانی بدلے گا تو بچے بیمار ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔" ایک دو بار اس نے ثوبان سے شکایت کی تو وہ ہنس پڑے تھے۔

"شکر کرو یار بچوں کا جھنجھٹ نہیں ہو گا وہاں اپنی بھابیوں اور بھائیوں کے ساتھ سکون سے وقت گزارنا۔"

اور انہیں عادت نہیں تھی ثوبان شاہ سے بحث کرنے کی سو بھاری دل کے ساتھ اکیلی ہی چلی جاتیں اور لاہور میں سب ہی خفا ہوتے کہ وہ بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائی۔ مریم اور صبوحی بھابی تو بہت ناراض ہوتی تھیں جب سے وہ بیاہ کر آئی تھیں۔

"تو یار! اب جا رہے ہو نا تو اپنے سارے کزنز سے مل لینا۔ اور اس کے بعد رابطہ رکھنا۔ آتے جاتے رہنا۔"

ثوبان شاہ کا لہجہ خوش گوار تھا یا اختر بانو کو لگا تھا۔ ریحان خاموش ہو گیا تھا۔ نعمان اور ریحان دونوں ہی ثوبان شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے اور کسی بھی معاملے میں بحث نہیں کرتے تھے، جبکہ شایان ہمیشہ اپنی ہی منواتا تھا اور امان بہر حال انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ضد اور ہٹ دھرمی اس کی فطرت میں نہیں تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے نا؟" اسے خاموش دیکھ کر ثوبان شاہ نے کہا۔

"جی بابا۔" ریحان نے نومان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"دو تین دن کی تو بات ہے یار، پنجاب کی شادی انجوائے کریں گے۔ مجھے یقین ہے تم بور نہیں ہو گے وہاں۔"

"ٹھیک ہے بابا! آپ بتا دیجئے گا کہ کب جانا ہے۔"

اب نعمان نے جواب دیا تھا۔ اور پھر اختر بانو کی طرف دیکھا۔

"کھیر منگوا لیں اب۔ تقریباً سب ہی کھانا کھا چکے ہیں۔" اور اختر بانو نے جو نم آنکھوں کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں چونک کر بھاگی کو آواز دے کر کھیر لانے کو کہا۔

"بڑی امی اور مانی کے ساتھ میری بھی سیٹ بک کروا دیجیے گا، بابا میں بھی لاہور جاؤں گا۔"

شایان نے جو اس دوران خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔

"تم..... تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟" ثمرہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"وہی جو سب کریں گے یعنی شادی میں شرکت۔" لبوں پر شریری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"تمہارا کیا رشتہ ہے بھلا جو تم شادی میں جانے کے لیے بے چین ہو رہے ہو اور وہ بھی ہفتہ بھر پہلے۔" اس کی بات سن کر ثمرہ کو بے حد غصہ آ رہا تھا اور اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔

"رشتہ..... ہاں رشتہ تو ہے۔" اس نے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ "میرے بھائیوں کے کزن ہیں تو کچھ تھوڑا بہت رشتہ تو میرا بھی بنتا ہے..... اور جہاں تک ہفتہ بھر پہلے جانے کی بات ہے تو میں نے ابھی تک لاہور نہیں دیکھا تو پہلے جا کر ذرا گھوموں پھروں گا۔ مجھے بہت شوق تھا لاہور، اسلام آباد جانے کا تو اب موقع مل رہا ہے تو اسی بہانے لاہور کی سیر ہو جائے گی۔"

"اگر جانا ہی ہے تو اپنے بھائیوں اور بابا کے ساتھ چلے جانا۔" ثمرہ نے جیسے بادل ناخواستہ کہا تھا۔

"نہیں مجھے بڑی امی اور امان کے ساتھ ہی جانا ہے۔ شادی میں تو مجھے لاہور دیکھنے کا وقت نہیں ملے گا۔"

وہ جب دل میں کوئی بات ٹھان لیتا تھا تو پھر اس پر قائم رہتا تھا۔ اور اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے ضرور ملے گا جس کی خوب صورت ہنسی نے کئی دن تک اسے ڈسٹرب رکھا تھا، اس نے تو ٹھیک سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور وہ اچھی طرح اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ "تیرا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں" کا قائل تھا اگر کوئی لڑکی کتنی بھی خوب صورت کیوں نہ ہوتی لیکن اسے گفتگو کا قرینہ نہ آتا یا آواز بھدی ہوتو وہ جلد ہی اس سے بیزار ہو جاتا تھا۔

"کھیر بہت مزے کی ہے اماں!" نعمان نے تعریف کی تو اختر بانو خوش ہو گئی تھیں۔

"او کے مجھے اور زمان کو ذرا کام سے جانا ہے۔" ثوبان شاہ کھڑے ہو گئے تھے۔ اٹھتے اٹھتے ان کی نظریں اختر بانو پر پڑیں۔ جن کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو سے چمک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی اختر بانو کو گزرے سالوں میں بہت کم یوں خوش ہوتے دیکھا تھا۔

"کھیر واقعی بہت مزے کی تھی۔" اور اختر بانو کی نظریں بے اختیار ان کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ پلکیں ہولے ہولے لرزنے لگیں۔ اتنے سالوں بعد، عمر کے اس حصے میں بھی ثوبان شاہ کے گہری نظروں سے دیکھنے پر ان کی پلکیں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر ہلکی سرخی سی بکھر گئی تھی اور کئی سالوں بعد ثوبان شاہ نے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھا۔ گہری نظریں اختر بانو کے چہرے پر ٹکی تھیں، ثمرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تو بابا! میری سیٹ بک کروا کے مجھے ایک دن پہلے بتا دیجیے گا۔ میں کراچی چلا جاؤں گا۔" شایان بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں..... ٹھیک ہے۔" ثوبان شاہ نے چونکتے ہوئے نظریں اختر بانو کے چہرے سے ہٹائیں۔

"میں سیٹ بک کروا دوں گا تم اپنی بڑی امی اور امان کے ساتھ چلے جانا۔"

ثمرہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا، جب کہ اختر بانو ایک خوش گوار سی حیرت میں گھری بیٹھی تھیں۔ آنکھوں میں نمی سی تھی۔ امان نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اختر بانو نے پلکیں جھپک کر اپنی آنکھوں میں پھیلی نمی کو جھاڑا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"تو یہ طے ہوا کہ میں آپ کے ساتھ ہی لاہور جاؤں گا۔" شایان کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا

"آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا کوئی۔"

"نہیں!" اختر بانو نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔ خوشی ہوگی بلکہ۔ تمہاری وجہ سے مانی کا دل بھی لگا رہے گا۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ یہ وہاں بور ہی نہ ہو جائے۔ پہلی دفعہ اپنے ہوش میں جا رہا ہے۔ بہت چھوٹا سا تھا جب میرے ساتھ گیا تھا۔"

"نہیں خیر، میں بور تو ہرگز نہ ہوتا آزبن سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے۔ اور زمل سے بھی لیکن اچھا ہے شانی بھی ہوگا تو زیادہ انجوائے کریں گے۔" امان شانی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"شیور!" شایان نے کرسی کی پشت سے بازو ہٹائے اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ثمرہ کے پھولے ہوئے چہرے پر، ایک نظر ڈال کر زیر لب مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زمان شاہ اور ثمینہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا، جو شادی کے کافی عرصہ بعد پیدا ہوا تھا اور ایبٹ آباد لبرن ہال میں پڑھ رہا تھا۔ ثمرہ کے اندر ابال اٹھ رہے تھے وہ بار بار ثوبان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ نظریں ملیں تو وہ، نظروں ہی نظروں میں انہیں پیغام دے کہ وہ ہرگز شایان کو لاہور جانے کی اجازت نہ دیں لیکن وہ ایک بار پھر اختر بانو کی طرف دیکھنے لگے تھے، جن کی آنکھوں میں چمک سی تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔

کتنے سالوں بعد انہوں نے اس کی آنکھوں میں یہ چمک دیکھی تھی ورنہ مدت ہوئی ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی رہنے لگی تھیں اور ہونٹ جیسے مسکرانا بھول گئے تھے۔

شادی کے ابتدائی سالوں میں اس کی آنکھیں یوں ہی دمکتی رہتی تھیں اور ہونٹوں پر ہر وقت مدھم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی ہنسی چھیننے میں ان کا بھی قصور تھا اور جب انہیں اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا تھا۔ اختر بانو کے معاملے میں ان سے بے حد کوتاہی ہوئی تھی۔ گزرا ہوا وقت تو واپس نہیں آ سکتا تھا لیکن انہوں نے دل میں عہد کیا تھا کہ جو دکھ انہوں نے اپنی ذات سے اختر بانو کو پہنچایا تھا اس کی تلافی کی کوشش، ضرور کریں گے۔

ثمرہ نے جز بز ہوتے ہوئے انہیں دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کرسی کو پیچھے دھکیلا۔ ثوبان شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"صبح جو بریف کیس آپ کو دیا تھا وہ نکال کر رکھیں اور دو دن پہلے جو پیپرز سیف میں رکھوائے تھے وہ بھی نکال دیجئے گا۔ میں آ رہا ہوں۔"

انہیں سائیں مراد شاہ کے گوٹھ جانا تھا۔ کراچی میں ان کا ایک پلاٹ تھا جس کے سلسلے میں بات چیت چل رہی تھی۔ وہ ان کی مہربان مل کے نزدیک تھا اس لیے زمان شاہ اسے خریدنا چاہ رہے تھے۔

ثمرہ پاؤں پٹخنے کے انداز میں تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تو انہوں نے امان سے کہا کہ وہ اگرم سے گاڑی نکالنے کا کہے۔ امان سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اختر بانو یوں ہی سر شار سی بیٹھی تھیں۔

اتنے سارے دن وہ ان کے سامنے ہوگا وہ جی بھر کر اسے دیکھیں گی ان سے باتیں کریں گی۔ اس کے شوق اس کی دلچسپیاں کسی کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھیں۔ اس کی پسند ناپسند کا انہیں علم نہ تھا اتنے سارے دن اکٹھے رہیں گے تو وہ سب پوچھیں گی۔ یہاں تو وہ اس ڈر سے اس کی طرف دیکھتی تک نہ تھیں کہ ثمرہ کو برا لگے گا کہ ثوبان شاہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ شایان کو پیار کرنے اور گود میں لینے کی کوشش نہ کیا کرے، ثمرہ کو برا لگتا ہے اور جب وہ بڑا ہوا تھا تو اس سے بلاوجہ کوئی بات کرنے سے بھی منع کر دیا تھا کہ خوامخواہ ثمرہ بدگمان ہوتی ہے۔

بیتی ہوئی یادوں نے پھر آنکھیں نم کر دی تھیں۔ انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کی نمی صاف کر کے وہ

بھاگی کی طرف دیکھنے لگیں جو ٹیبل صاف کر رہی تھی۔
"بھاگی! ماسی تاج سے کہو ایک کپ قہوہ بنا کر مجھے کمرے میں دے جائے۔" ثوبان شاہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئے تھے۔
"وہ، میں ابھی بنوا کر بھجواتی ہوں۔" اختر بانو بوکھلا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ ثوبان شاہ کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد وہ ایک کپ قہوے کا پیتے تھے۔
"نہیں ماسی تاج بنالے گی تم آرام کرو۔ صبح سے مصروف ہو۔ مت تھکایا کرو خود کو اتنا۔ ملازم ہیں۔ برسوں سے کام کر رہے ہیں جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"
ایک گہری نظر ان پر ڈال کر وہ واپس اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ جہاں ثمرہ بے چینی سے چکر لگاتے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ "آپ منع نہیں کر سکتے تھے شانی کو لاہور جانے سے۔"
ان کے اندر قدم رکھتے ہی وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھی۔ "بھلا اسے کیا ضرورت ہے شادی میں جانے کی اور کیا رشتہ ہے اس کا جو وہ۔"
"رشتہ تو ہے، یہ الگ بات کہ اسے معلوم نہ ہو۔" ثوبان شاہ بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔
وہ لمحہ بھر کے لیے جیسے حیران ہوئی تھی، پھر ہولے سے سر جھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔
"جو بھی ہے پلیز اسے منع کر دیں کہ وہ وہاں مت جائے۔"
"کیا وہ میرے منع کرنے سے رک جائے گا ثمرہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ جو دل میں ٹھان لے وہی کرتا ہے۔"
انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے پیپرز اٹھا لیے اور انہیں دیکھنے لگے۔
"لیکن اگر وہاں کسی نے ذکر کر دیا بتا دیا اسے کہ وہ۔"
اس کی آنکھوں میں خوف سا تھا۔
"اختر بانو اتنی کم ظرف نہیں ہے ثمرہ! اور نہ اس کے والد اور باقی فیملی ایسی ہے۔ اور شایان کے متعلق صرف اس کے والد اور والدہ کو ہی پتا ہے۔ باقی سب کو اختر کے صرف تین بچوں کا پتا ہے کہ امان کے وقت اس کی پیدائش کے متعلق لاہور میں نہیں بتایا گیا تھا اور اس کے لیے خود، اختر بانو نے ہی منع کیا تھا البتہ اس کی والدہ کو علم تھا لیکن وہ نہیں آئی تھیں مانی کی پیدائش پر۔ جہاں تک میرا خیال ہے اختر بانو کو اماں جان نے یا دادی جان نے ہی منع کیا ہوگا وہاں بتانے سے۔"
اپنی طرف سے اسے تسلی دے کر وہ پھر ہاتھ میں پکڑے پیپرز کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔
"پھر بھی میرا دل بہت ڈرتا ہے۔ میں شانی سے بہت محبت کرتی ہوں وہ میرا بیٹا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ مجھ سے کسی بھی طرح دور ہو۔"
ان کے لہجے سے اب بھی خوف جھلکتا تھا۔
"کاش ہم نے شانی سے یہ نہ چھپایا ہوتا۔ میں بھی اس وقت آپ کی اور دادی جان کی باتوں میں آ گیا۔ ورنہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شانی کو آپ نے پالا تھا۔ اختر بانو نے اسے آپ کو دے دیا تھا تو وہ آپ کا ہی بیٹا ہوتا۔ لیکن یہ صورت حال نہ ہوتی کہ آپ بلاوجہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہیں کہ کہیں، شایان کو علم نہ ہو جائے بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ اختر بانو بہت اعلا ظرف ہے۔ میرے بابا جان نے اسے یوں ہی تو دادا جان کی مخالفت کے باوجود منتخب نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اگر آپ بے اعتبار ہو رہی ہیں تو ساتھ چلی جائیں۔ انوائیٹڈ تو آپ بھی ہیں نا۔"
ثوبان شاہ کی نظروں میں تاسف تھا۔
"لیکن میں بھلا کس رشتے سے جاؤں۔ اور پھر بھلا مناسب لگتا ہے میرا وہاں جانا۔" وہ سٹپٹائی۔
"اچھا ٹھیک ہے شانی چلا جائے لیکن اتنے دن پہلے تو نہ جائے۔ آپ کے اور نومی وغیرہ کے ساتھ چلا جائے۔ اتنا تو آپ اسے کہہ سکتے ہیں۔"
"ہاں کہہ سکتا ہوں۔"

وہ اس وقت ثمرہ سے بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جانتے تھے کہ شایان کی عادت ہے اپنی بات منوانے کی جس طرح ثمرہ نے اس کی تربیت کی تھی۔ اس سے وہ ضدی اور خودسر ہوگیا تھا۔ ثمرہ کے بے جا لاڈ پیار نے کسی حد تک اسے بگاڑ دیا تھا۔ ماموں زاد بھائیوں اور ماموؤں کی محبت نے اس کے اندر چند ایسی عادات پیدا کردی تھیں، جنہیں ثوبان شاہ پسند نہیں کرتے تھے۔

شروع میں انہوں نے ثمرہ کو منع کیا تھا کہ وہ حیدرآباد کے بجائے شایان کو یہاں ہی تعلیم دلوائے یا پھر کراچی بھجوادے۔ لیکن ثمرہ کو دادی اور اماں جان کی تائید حاصل تھی سو وہ خاموش ہو گئے تھے تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی زیادہ تر وقت وہ حیدرآباد میں ہی گزارتا تھا کہ خود اب اس کا دل حویلی میں نہیں لگتا تھا۔ ثوبان شاہ چاہتے تھے کہ وہ کراچی یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے اور وہیں رہ کر مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے لیکن پچھلے سال، گریجویشن کرنے کے بعد اس نے پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

"کیا کرنا ہے میں نے پڑھ کر بڑے ماموں جلد ہی ایک فیکٹری لگانے والے ہیں۔ سب پیپر ورک مکمل ہو چکا ہے۔ اور انہوں نے مجھے اور ہاری کو اپنے ساتھ ہی کام کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جلد ہی وہ آپ سے اس سلسلے میں بات کریں گے۔"

ثوبان شاہ خاموش ہو گئے تھے وہ اولاد پر جبر کر کے زور زبردستی سے اپنے فیصلے صادر کرنے کے قائل نہیں تھے گو ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بچوں میں سے کوئی ایک سول سروس میں جائے اور اس کے لیے انہوں نے بچپن سے ہی شایان کے لیے سوچ رکھا تھا پر اب اس کی مرضی نہیں تھی تو انہوں نے مجبور نہیں کیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے ثمرہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

"بھاگی ہوگی۔ قہوے کے لیے کہا تھا میں نے۔"

ثمرہ نے دروازہ کھولا اور بھاگی نے کافی ٹیبل پر ٹرے رکھی۔ "چھوٹے صاحب آپ کا سٹنگ میں انتظار کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے انہیں کہو قہوہ پی کر آرہا ہوں۔"

بھاگی سر خم کرتی ہوئی چلی گئی تو ثمرہ نے کپ اٹھا کر انہیں دیا۔ قہوہ پی کر انہوں نے پیپرز بریف کیس میں رکھے اور کھڑے ہو گئے۔

"آپ شانی کو سمجھائیں گے نا کہ اس کا بھلا کیا رشتہ ہے لاہور والوں سے، جو وہ اتنے دن پہلے جائے بس آپ لوگوں کے ساتھ چلا جائے۔"

ثمرہ نے جھجکتے ہوئے یاددہانی کروائی تو انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"رشتہ تو خیر وہی ہے جو مانی کا ہے لیکن میں سمجھاؤں گا۔"

اگرچہ جانتے تھے کہ شایان اپنی ہی کرے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ امان اور اختر بانو کے ساتھ ہی لاہور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ گو ثمرہ نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ نہ جائے۔ حتیٰ کہ چپکے چپکے چھوٹے بھائی کو دبئی وغیرہ جانے کے لیے تیار کر لیا تھا کہ وہ ان ہی تاریخوں میں وہاں کی سیر کا پروگرام بنالیں اور شایان کو بھی ساتھ لے جائیں، بلکہ اسے یورپ کی سیاحت کا بھی لالچ دیں کہ جانتی تھی شایان کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن وہ بھی شایان ثوبان شاہ تھا۔

اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابھی تو میں لاہور جا رہا ہوں پھر آ کر پروگرام بناتے ہیں۔ ثمرہ دل مسوس کر رہ گئی تھی جب کہ اختر بانو اتنی خوش تھیں جیسے انہیں کوئی ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ ایئرپورٹ پر جاتے، جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے سیٹ پر بیٹھتے گو اس کی شایان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی پھر بھی خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی وہ بار بار شایان کی طرف دیکھتیں تو آنکھیں دمک اٹھتیں۔

ایئرپورٹ پر ابا اور آزین دونوں ہی اسے لینے آئے ہوئے تھے، شاید جہاں زیب بیگ سے گھر میں انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا سو وہ آزین کے ساتھ

ہی چلے آئے تھے۔ آزین مرسل کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ شادی کی وجہ سے ارباب تایا اور اورنگ زیب تایا دونوں کی گاڑیاں فارغ نہ تھیں۔

"ابا! یہ شایان ہے۔"

ان سے ملنے کے بعد اختر بانو نے لرزتی آواز میں تعارف کروایا تھا۔

"شایان۔"

ایک لمحہ کے لیے، جہاں زیب بیگ کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔ اور جتنی ہی دیر تک اپنے بازوؤں میں لیے رہے۔ اور پھر اسے الگ کرتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔

"تمہاری مرحومہ ماں صحیح کہتی تھی کہ شانی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ..... امان کی نانی جان۔"

شایان کی آنکھوں میں حیرت تھی اور یہ حیرت امان اور آزین کی آنکھوں میں بھی تھی کہ اختر بانو کے سوتیلے بیٹے سے، جہاں زیب بیگ کا اس طرح وارفتگی سے ملنا۔ کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"ہاں..... مانی کی نانی جان۔"

انہوں نے سٹپٹا کر اختر بانو کی طرف دیکھا اور خود کو سنبھالا "دراصل جب تم پیدا ہوئے تھے تو وہ اختر بانو کے پاس ہی گئی ہوئی تھیں۔ ان دنوں اختر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ہفتہ بھر رہی تھیں وہ اس کے پاس تو واپس آ کر بتایا تھا تمہارے متعلق۔"

اختر بانو نے اطمینان کی سانس لی اور شایان مسکرایا۔ تاہم دل میں تھوڑا حیران ضرور تھا کہ ثمرہ نے اسے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہاں، کوئی بھی اس سے مل کر خوش نہیں ہوگا کہ وہ اختر بانو کی سوکن کا بیٹا ہے اور اگر ان کا رویہ اچھا نہ ہوا تو ان کے گھر میں ٹھہرنے کے بجائے ہوٹل میں چلے جانا۔ یا پھر واپس آ جانا کوئی ضرورت نہیں پھر شادی میں شرکت کرنے کی۔ لیکن جس طرح جہاں زیب بیگ اسے والہانہ انداز میں ملے تھے اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ جہاں زیب بیگ کا دل کدورت سے خالی، صاف شفاف ہے اور وہ ایک محبت کرنے والے انسان ہیں لیکن باقی سب نے بھی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ بلکہ ممنونیت اور شکریے کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ شادی میں شرکت کے لیے آیا ہے۔

"تو میری پیاری امی جان آپ کے سارے اندیشے غلط تھے۔ یہ لوگ تو بہت محبت کرنے والے اور مخلص لوگ ہیں۔"

اگلے دن وہ ثمرہ کو فون کر کے بتا رہا تھا۔

"تو اب آپ چین سے میٹھی نیند سوئیے گا، مجھے پتا ہے کہ فکر سے آپ کو ٹھیک سے نیند نہیں آ رہی ہوگی۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بات نے ثمرہ کو اور بے چین کر دیا تھا اور جب تک وہ واپس نہ آ جاتا اسے بے چین ہی رہنا تھا۔ لیکن وہ بے حد خوش تھا۔ امان کے ماموں اور کزنز سب نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور بہت محبت اور پیار سے ملے تھے۔ سب نے مصروفیت کے باوجود امان کو اور اسے کمپنی دینے کی کوشش کی تھی۔

خاص طور پر آزین نے تین دنوں میں لاہور کی بہت ساری قابل ذکر جگہیں دکھا دی تھیں۔

اختر بانو نے جب بتایا تھا کہ شایان کو لاہور دیکھنے کا شوق تھا، اسی لیے وہ ان کے ساتھ آیا ہے تو آزین نے اسے لاہور کی سیر کروانے کی ذمہ داری لے لی تھی۔ اس نے مرسل سے اس کی گاڑی مانگ لی تھی۔ اور ناشتے کے بعد امان اور شایان کو ساتھ لے کر وہ گھر سے نکل جاتا تھا۔ اکثر وہ مرسل کو بھی لے لیتا تھا۔

ہر شہر کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے اور لاہور شہر کے رنگ شایان کو بہت بھائے تھے۔ موروں والی اس حویلی اور اس کے مکینوں نے بھی اپنے اپنے انداز میں اسے متاثر کیا تھا۔ یہاں زندگی حویلی کی زندگی

سے بہت مختلف تھی۔ اور یہاں رہنے والوں کے رویے حیدرآباد میں رہنے والوں سے مختلف تھے۔

یہ سادہ اور مخلص لوگ تھے ان میں غرور نہیں تھا شیخو بابا، ساجدہ، بی بی اماں سب کے ساتھ ان کا رویہ بہت نرم اور ہمدردانہ تھا۔ بی بی اماں کو تو پہلے وہ ان کی کوئی عزیز ہی سمجھا تھا۔ وہ استحقاق سے بات کرتی تھیں۔ آزین، نزل حتی کہ جہاں زیب بیگ کو بھی ان کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ ہر معاملے میں ان کی رائے لی جاتی تھی۔

ان کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ نوکروں سے ایک فاصلہ رکھا جاتا تھا۔ ہاں حیدرآباد میں، کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ مالکوں کے معاملات میں بولے لیکن یہاں تو باقاعدہ مشورے مانگے جارہے تھے۔ رائے لی جارہی تھی۔ بھلے وہ شیخو بابا ہوں یا ساجدہ بی بی اماں کو تو خیر سب ہی بزرگ کا درجہ دیتے تھے۔ لیکن وہاں اس کے ننھیال میں بڑے ماموں ہوں یا چھوٹے، خالہ ہوں یا ممانی سب کی گردنوں میں ہی کلف لگا ہوا تھا۔ اپنے سے کمتر کو وہ بہت حقارت سے دیکھتے تھے۔ لیکن یہاں اس نے دیکھا تھا کہ سب کو ہی عزت دی جاتی تھی۔ اس مختلف ماحول نے اسے اٹریکٹ کیا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر وہ جہاں زیب بیگ اور اختر بانو کی محبت سے متاثر ہوا تھا۔ جس طرح ثمرہ نے اسے ڈرا رکھا تھا ایسا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ کراچی سے آنے کے دو دن بعد ہی اسے فلو ہو گیا تھا اور ہلکی سی حرارت بھی۔ اختر بانو نے جس طرح اس کا خیال رکھا تھا۔ اس سے وہ بے حد حیران ہوا تھا۔ کبھی قہوہ بنا کر لا رہی ہیں کبھی سوپ، کبھی گرم پانی میں شہد ملا کر۔ یہ ہی نہیں رات گئے تک اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی کبھی سر دبانے لگتیں کبھی بازو۔

ثمرہ نے بھی اسے اختر بانو کے قریب ہونے ہی نہیں دیا تھا، وہ تو امان سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھا حیدرآباد سے آتا بھی تو بہت کم ہی امان سے بات ہو پاتی تھی۔ ایک تو اس کی اپنی دلچسپیاں تھیں پھر ثمرہ بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ لیکن یہاں آکر دو تین دنوں میں ہی ہر وقت کے ساتھ نے بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

ان دونوں کے رہنے کا انتظام آذین کے کمرے میں ہی کیا گیا تھا جو کافی کشادہ تھا۔ جہاں زیب بیگ نے بھی دو تین بار آکر اس کا حال پوچھا تھا۔ وہ محبت جو اختر بانو اور جہاں زیب بیگ کی آنکھوں سے اس کے لیے چھلکتی تھی اس نے اسے حیران ہی نہیں کیا بلکہ ان کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ جس طرح دو دن اختر بانو نے اس کا خیال رکھا تھا ایسا خیال تو کبھی ثمرہ نے بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ اختر بانو کا ممنون تھا اور اپنے گزشتہ رویے پر دل ہی دل میں شرمندہ بھی۔

اختر بانو کا دل تو بہت خوب صورت تھا اور وہ ثمرہ کے کہنے میں آکر خوامخواہ ہی دل میں اس کے لیے بغض رکھے ہوئے تھا۔ وہ دو دنوں بعد ٹھیک ہو گیا تھا اور ان دو دنوں میں اختر بانو نے اس سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اس کے شوق، اس کی دلچسپیاں، اس کی پسند ناپسند، اس کے نظریات کے متعلق باتیں کرتے ہوئے وہ بہت محبت اور شفقت سے اسے تکتی تھیں جیسے وہ اس کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں جیسے وہ نزل کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔

ان مصروف سے شب و روز میں برائے راست اس کی نزل سے بہت کم گفتگو ہوئی تھی لیکن وہ اسے اوپر نیچے آتے جاتے سب کا خیال رکھتے دلچسپی سے دیکھتا رہتا تھا۔ نیچے تو صرف وہ ہی لوگ تھے لیکن اوپر مرتضیٰ کی ایک خالہ اور کچھ کزنز وغیرہ بھی ان کے بعد آئے تھے۔ وہ جیسے مکھن چکر بنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ بھی دو تین بار آذین کے کمرے میں کھڑے کھڑے اس کا حال دریافت کرنے آئی تھی۔

"دو دن بعد مایوں کا فنکشن ہے اور آپ کو اس سے پہلے ٹھیک ہونا ہے۔ اس لیے میں نے بی بی اماں سے کہا ہے وہ رات کو آپ کے لیے جوشاندہ بنا دیں گی۔"

اس وقت وہ نیم دراز تھا اور اختر بانو سے باتیں کر رہا تھا، جب وہ اختر بانو کو بلانے آئی تھی۔

''جوشاندہ!'' اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''جی..... جوشاندہ۔'' وہ بے اختیار ہنسی تھی۔ وہی نغمگی بکھیرتی ہنسی، جسے سن کر وہ یہاں آنے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ نگاہوں نے بے اختیار اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔ جواب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی بلکہ اختر بانو کو مونا تائی کا پیغام دے رہی تھی۔

''جوشاندہ ضرور پی لیجیے گا شایان بھائی! کہیں زین کی طرح گرامت دیکھنے گا۔''

وہ سادگی سے کہتی، مسکرا کر ایک نظر اس پر ڈالتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں میں کچھ خاص نہیں تھا نہ وہ اس سے متاثر نظر آ رہی تھی۔ صاف شفاف بے ریا آنکھیں۔ وہ لڑکیوں کی اپنی طرف اٹھتی جن نظروں کا عادی تھا۔ زل کی نظروں میں ایسا کچھ نہ تھا کہ اسے لگتا کہ زل شاہ زیب، شایان شاہ کی وجاہت سے متاثر ہو گئی ہے۔

''تو؟'' اختر بانو کے جانے کے بعد اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا۔ ''زل شاہ زیب ان ساری لڑکیوں سے مختلف ہے جن سے وہ اب تک ملا اور جن سے دوستی کی لیکن رضی کہتا تھا ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں، مختلف دکھنے والی لڑکیاں بھی جھوٹی سچی تعریف اور محبت کے چند لفظ سن کر ڈھیر ہو جاتی ہیں۔''

شادی والے گھر اسے زل کو متاثر کرنے کا موقع ملنا مشکل تھا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ دو دن سے باہر نہیں جا سکا تھا اور آذین نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو دنوں میں وہ اسے لاہور کی کچھ مزید جگہیں دکھا دے گا۔ اور پھر شادی کے ہنگامے میں تو زل سے بات کرنے کا کہاں موقع ملے گا۔ تو مجھے چاہیے کہ میں بھی امان کے ساتھ پنجاب یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لوں تو ملاقات کے مواقع نکل ہی آئیں گے۔

یوں بھی بابا میری پڑھائی چھوڑ دینے سے خوش نہ تھے۔ سو وہ تو اس بات پر ہی خوش ہو جائیں گے کہ میں ماسٹر کر رہا ہوں بھلے نہیں سے بھی کر لوں۔ ہاں امی ضرور اعتراض کریں گی لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ مان ہی جائیں گی آخر کار..... تو یہ طے ہوا کہ مجھے مانی کے ساتھ ہی لاہور آنا ہے۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے زل شاہ زیب سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کا چہرہ بہت روشن اور ملیح تھا۔ اس کی گھور سیاہ آنکھیں سحر طاری کرتی تھیں۔ اس کا سراپا اس کی قامت بہت دلربا تھی۔ وہ باوقار بھی تھی اور دلکش بھی لیکن وہ گل رعنا نہیں تھی اور اس کی محبت کی حق دار صرف گل رعنا تھی۔ جو سچ میں ہی گل رعنا تھی۔ اس کی خالہ زاد اور منگیتر بچپن میں ہی ثمرہ نے اسے باور کروا دیا تھا کہ بھلے وہ سینکڑوں لڑکیوں سے دوستیاں کرتا پھرے لیکن شادی اس کی گل رعنا سے ہی ہونی ہے۔

اور اسے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ گل رعنا تو سچ میں چاہے جانے کے قابل تھی۔ اتنی حسین، اتنی خوب صورت کہ جب نگاہیں ایک بار اس کی طرف اٹھتیں تو جھکنا بھول جاتیں۔ وہ آج تک جتنی بھی لڑکیوں سے ملا تھا کوئی بھی اس جیسی حسین نہ تھی۔ وہ تو جیسے کوئی اپسرا تھی جو آسمانوں سے اس کے لیے اتری تھی۔

یہ احساس اسے ہمیشہ آسودہ رکھتا تھا کہ اس کی ہونے والی شریک زندگی دنیا کی شاید سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔ تو پھر صرف زل شاہ زیب کی ہنسی سن کر وہ یہاں تک کیوں چلا آیا تھا۔ کیوں اسے کھوجنا چاہتا تھا اور اب کیوں اس کے لیے صرف اسے جاننے کے لیے، وہ یہاں ایڈمیشن لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھائی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا اور بقول رضی کے ہمارے لیے اتنی پڑھائی کافی ہے۔ ہم نے کون سا نوکریاں کرنی ہیں۔ اپنا بزنس، اپنی زمینیں۔

وہ خود بھی اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ یہ

اس کے مزاج کا عجیب رنگ تھا۔ لڑکیوں سے دوستیاں کرنا، انہیں اپنا اسیر کر لینا اور جب وہ اس کی محبت میں پاگل ہونے لگیں تو راستہ بدل لینا۔ شاید کسی کو اسیر کر کے اس کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ بے شمار لڑکیوں سے اس نے رانگ نمبر پر دوستی کی تھی ایک لڑکی تو مظفر آباد سے حیدر آباد چلی آئی تھی اس سے ملنے کسی سہیلی کی شادی پر جانے کا بہانہ کر کے۔ شکر تھا کہ وہ پیچھے دروازے بند کر کے نہیں آئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے واپس بھیجا تھا۔ نہ جانے اب تک کتنی ہتھیلیوں پر انتظار کے دیے چھوڑ آیا تھا۔ لیکن ان دوستیوں اور تعلق میں وہ کبھی حد سے نہیں گزرا تھا۔ ورنہ رضی وغیرہ تو حد سے گزرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

شاید یہ ثوبان شاہ اور اختر بانو کے خون کا اثر تھا کہ اس نے جو حد مقرر کر رکھی تھی اس کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اپنی شخصیت میں موجود اس برائی کا اسے کوئی احساس نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکی اس کے متوجہ کرنے پر بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو اسے ضد ہو جاتی تھی اور وہ اسے تسخیر کر کے ہی چھوڑتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچپن میں جب اسے کوئی کھلونا یا کوئی چیز پسند نہ آجاتی، جب تک اسے حاصل نہ کر لیتا ہنگامہ کیے رکھتا۔ اور زل شاہ زیب کی آنکھوں میں بھی وہ اپنے لیے وہ ہی جذبہ دیکھنا چاہتا تھا جو اس کی انا کو تسکین دیتا تھا اور اس کے لیے وہ جو فیصلہ کر چکا تھا، اس پر مطمئن تھا سو وہ زل سے توجہ ہٹا کر اگلے دو دن آزین وغیرہ کے ساتھ گھومتا رہا۔

مایوں کا فنکشن پڑوس میں ملک صاحب کی حویلی میں تھا۔ جس کا صحن بہت کشادہ تھا۔ آزین اور امان ناشتے کے بعد ہی بلال اور مرتضیٰ کے ساتھ وہاں انتظامات کروانے چلے گئے تھے۔ اماں نے اسے بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ لیکن وہ طبیعت کی خرابی کا کہہ کر کمرے میں ہی لیٹا رہا تھا۔ دن کو کھانے کے لیے بھی نہیں گیا تو اختر بانو نے ساجدہ کے ہاتھ کھانا کمرے میں ہی بھجوا دیا تھا۔ اور خود بھی ساجدہ کے پیچھے ہی کمرے میں آگئی تھیں، آپ نے خوامخواہ تکلف کیا بڑی امی۔ مجھے بھوک نہیں تھی ورنہ میں آجاتا کھانا کھانے۔"

وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"تھوڑا سا کھالو۔ ناشتہ بھی تم نے برائے نام ہی کیا تھا۔ زین بتا رہا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تو کھانا کھا کر آرام کرنا۔ اگر زیادہ خراب ہو تو میں شیخو بابا کو کہتی ہوں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلے جاؤ۔" وہ تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ارے نہیں بڑی امی! ہلکا سا سر میں درد تھا اس لیے آزین کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کیا وہ لوگ گھر آگئے ہیں۔"

اس نے پوچھا تو اختر بانو نے اطمینان بھری سانس لی، ورنہ وہ تو اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر پریشان ہی ہو گئی تھی۔

آزین تو کھانا کھا کر بلال کے ساتھ پھول لینے چلا گیا ہے۔ اور امان ابا جان کے ساتھ ایئر پورٹ گیا ہوا ہے ظفر بھائی کو لینے۔" اس کی سوالیہ نظریں اختر بانو کی طرف اٹھیں تو اس نے وضاحت کی۔

"ظفر یاب بھائی۔ زین کے ابا۔ ہیں۔ ان کی فلائٹ تین بجے پہنچے گی یہاں۔"

وہ بتا کر چلی گئیں تو وہ کھانا کھا کر سو گیا وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ساجدہ برتن اٹھا کر لے گئی کب آزین اور امان آئے اور تیار ہو کر چلے گئے۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا اور مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اتنی دیر سویا رہا اور کسی نے مجھے جگایا ہی نہیں۔"

اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر پورا صحن جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ درختوں میں سے نیلی پیلی سرخ سبز روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ یہاں بھی لائٹنگ کروائی گئی تھی۔ برآمدے میں بیس پچیس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

صحن تو ملک صاحب کی حویلی میں تھا۔ یہاں شاید پہلے آجانے والے مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

"پتا نہیں سب لوگ کہاں ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔ تب ہی کچن سے بی بی اماں اور اختر بانو باہر نکلیں۔ اور اختر بانو اسے دروازے میں کھڑے دیکھ کر اس کی طرف چلی آئیں۔

"طبیعت کیسی ہے بیٹا۔ میں دوبار تمہیں دیکھنے آئی تھی گہری نیند میں تھے، جگایا نہیں کہ پتا نہیں طبیعت کیسی ہے تمہاری۔"

"میں ٹھیک ہوں بڑی امی! وہ رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ اس لیے سویا تو پھر آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

اس نے اختر بانو سے بات کرتے ہوئے کچن کی طرف دیکھا، جہاں سے کوئی لڑکی نکل کر جہاں زیب کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ زل تو نہیں تھی پھر پتا نہیں کون تھی۔ شاید سحرش یا کوئی اور۔

"تمہارے لیے چائے بھجواؤں۔" اختر بانو نے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

"تو پھر فریش ہو جاؤ۔ باتھ لینا ہے تو لے لو اور میں نے آج کے فنکشن کے لیے تمہارے اور امان کے لیے شلوار قمیص کا سوٹ منگوایا تھا ساجدہ نے استری کر کے ہینگ کر دیا ہے۔"

"لیکن بڑی امی، میرے پاس کپڑے تھے۔ شلوار قمیص کے سوٹ بھی تھے وہ ہچکچایا تھا۔

"تو کیا ہوا؟" اختر بانو مسکرائیں۔ "زین لینے جا رہا تھا اپنے لیے تو میں نے مانی سے کہہ دیا کہ وہ اپنے اور تمہارے لیے بھی لے لے۔ سب لڑکے شلوار قمیص ہی پہن رہے ہیں۔ زین نے کہا تھا تم تیار ہو کر ادھر ہی آجانا۔ یہ ایک گھر چھوڑ کر دوسرا گھر ہے۔ آٹھ بجے کا وقت دے رکھا ہے سب کو۔"

وہ اختر بانو کا شکریہ ادا کر کے تیار ہونے کے لیے کمرے میں چلا گیا اور جب تیار ہو کر باہر نکلا تو صحن میں اب بھی کوئی نہیں تھا البتہ اوپر سے باتوں ہلکے شور اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے صحن میں قدم رکھا تب ہی اس کی نظریں سامنے سیڑھیوں کی طرف اٹھیں۔ زل گرین اور یلو کے امتزاج والے ڈریس میں ملبوس، ایک ہاتھ میں دوپٹا سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں ایک کین کی باسکٹ اٹھائے نیچے آ رہی تھی۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ زل نے صحن میں قدم رکھتے ہوئے نظریں اٹھائیں تو وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"زل!" اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا۔

"جی آپ گئے نہیں سب کے ساتھ۔" اس کا خیال تھا کہ سب لڑکے چلے گئے ہوں گے۔

"نہیں...... اب جا رہا ہوں۔"

اب وہ باسکٹ میں موجود سبز اور پیلے رنگ کی چوڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ چوڑیاں۔"

"یہ مہمان لڑکیوں کو پہنائیں گے۔ اور گجرے بھی۔"

وہ مسکرائی اس کے خوب صورت ہونٹوں اور دانتوں نے جیسے شعاعیں سی بکھیر دی تھیں۔

"زل، آپ بہت مختلف اور بہت پیاری ہیں۔"

وہ کم از کم آج کے دن یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن بے اختیاریوں سے نکل گیا تھا۔ زل نے کچھ حیران اور پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ تب ہی صحن کا دروازہ کھول کر مرتضیٰ نے اندر قدم رکھا۔ سیڑھیوں کے پاس کھڑی زل اور والہانہ نظروں سے اسے تکتا شایان شاہ۔

مرتضیٰ ارباب نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں......

"چار دن اپنی پھپھو کے گھر کیا رہ کر آئی ہے یہ زل شاہ زیب کہ ان کے سوتیلے بیٹے سے پینگیں بڑھائیں۔"

"اب میں دیکھوں گا کہ تم......" دل ہی دل میں کہتا اور دانت پیستا ہوا وہ وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

pklibrary.com

عارفہ فضل شاہ

مُحبت کا سنہری آنچل

"میری کہانی میں دادی ہیں۔ جن کے چار پوتے ہیں۔ بڑا پوتا جتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ ہے اتنا ہی اکھڑ اور سنجیدہ مزاج، چھوٹے تینوں شرارتی اور......"

حبیبہ سانس لینے کو رکی۔

"ہاں جی چھوٹے تینوں شرارتی اور چلبلے ہوں گے۔ بڑے بھائی کی آمد پر بدحواسی میں غلطی کر کے ڈانٹ سنیں گے۔ دادی جہاں دیدہ ہونے کے باوجود مظلوم ہیروئن کو چھڑے چھانٹ، چار چار جوان لڑکوں والے گھر میں پناہ دیں گی اور وہ سادہ لوح حسینہ سب سے اکھڑ اور بڑے پوتے کو بھا جائے گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

سویرا نے اس کی بات کاٹ کر چند جملوں میں اس کی کہانی کا اختتام تک سنا دیا۔ حبیبہ تو حیرت سے منہ کھولے بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

"حد ہے بھئی سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ میں بھی بے وقوف ہوں جو نئے سرے سے تمہیں کہانی سنانے بیٹھ جاتی ہوں۔"

حبیبہ جو خود کو چوٹی کی مصنفہ تصور کیے بیٹھی تھی۔ بری طرح چڑ گئی۔

"ارے ارے بہنا! ناراض کیوں ہوتی ہو۔

pklibrary.com

ایک اور کہانی لکھو مانیوں کے رحم و کرم پر رہنے والی ہیروئن ہر وقت کچن میں رہنے والی اس کی اماں جان ،بالآخر کامیاب ہو کر سارے خاندان کو حیرت میں مبتلا کر کے ماں کا فخر بن جانے والی لڑکی۔"

یہ مشورہ عمیر کی طرف سے آیا تھا۔ حبیبہ کو پتا تھا۔ وہ اس کی رجیکٹ ہونے والی کہانی کا حوالہ دے رہا ہے ۔لہذا وہ غصے سے واک آؤٹ کر گئی۔

"پتا نہیں کون سے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ جو حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہمت بڑھاتے ہیں اور بالآخر ان کی کہنیں کامیاب ہو کر اپنے انٹرویو میں ان کی مکمل سپورٹ کا حوالہ دیتی ہیں۔ ان دونوں کو تو مذاق اڑانے اور غیر سنجیدہ رہنے سے فرصت نہیں۔"

عمیر اور سویرا کی باتوں پہ جلتے کڑھتے حبیبہ نے مسودے اور پین سنبھالے اور کچن کی راہ لی۔

چاول دم پر رکھے ہوئے تھے۔ سلاد بنایا۔ کباب فرائی کیے اور امی کے لیے پرہیزی کھانا بنانے لگی۔ ان کی شوگر ان دنوں کافی ہائی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اتوار کے دن معمول سے ہٹ کر گہما گہمی تھی۔ ابو ٹاک شو دیکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ بآواز بلند تبصرے بھی جاری تھے۔ عمر اور سویرا نے کینو کھانے اور ایک دوسرے کو ہرانے کے لیے رفتار پکڑی ہوئی تھی۔ ٹوکری میں چھلکوں کا بڑھتا ڈھیر دونوں کی تیز رفتاری کی داد دے رہا تھا۔ امی پنسری کاٹتے ہوئے دونوں کی نوک جھونک پہ مسکرا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ابو کے تبصروں پہ بھی پوری توجہ دے رہی تھیں۔

حبیبہ نے گھر بھر کی صفائی کے بعد کچن سنبھالا ہوا تھا۔ ان دنوں لکھنے پر توجہ کم تھی۔ اس وقت بھی کپڑا بچھائے اپنی تمیض کی کٹنگ میں مصروف تھی۔ سویرا اور عمیر نے کینو ختم کیے تو سویرا نے حبیبہ کے پاس نشست سنبھال لی۔ عمیر بھی قریبی صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔

"بھئی! ایک بات تو ماننی پڑے گی۔ حبیبہ آپی بھلے ناکام مصنفہ ہیں لیکن کسی بھی ناول کی ہیروئن والی تمام خصوصیات ان میں موجود ہیں۔ سلائی کڑھائی، سینے پرونے، کھانے پکانے سے لے کر گھر کو چمکانے کے ہر ہنر سے واقف۔"

سویرا نے اپنے تئیں تعریف کی تھی مگر اس پوری تعریف میں، ناکام مصنفہ کا لفظ ہی حبیبہ کو قابل گرفت لگا۔

"ظاہری بات ہے۔ تم جیسی ناکارہ اور پھوہڑ بہن کے ہوتے ہوئے مجھے ہی کام کرنا پڑتا ہے تو سلیقہ تو خود بخود آ جائے گا۔"

منہ بنا کر اسے جواب دیتی حبیبہ اب کپڑے سنبھال رہی تھی۔ البتہ عمیر نے اس متنازعہ موضوع پر بولنے سے گریز ہی کیا۔ آج کا دن وہ غیر جانب دار رہ کر گزارنے والا تھا۔ اس کی وجہ اس کا ذاتی مفاد تھا۔

حبیبہ آپی نے اس کی پسند کا لنچ تیار کرنا تھا اور سویرا نے، پریکٹیکل نوٹ بک مکمل کرنے میں مدد کرنی تھی لہذا دونوں کے ساتھ معاملات خراب کرنے کا نقصان ناقابل برداشت تھا۔

☆☆☆

"آپی، آپی، دیکھیں تو میں کیا لایا ہوں۔" عمیر نے لاؤنج کے باہر سے ہی آوازیں دینا شروع کر دیں۔

حبیبہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں پسندیدہ شمارہ دیکھ کر خوش ہو گئی۔ فوراً خطوط کا صفحہ کھولا تو تیسرے ہی نمبر پر اس کا خط جگمگا رہا تھا۔ اپنے نام کو دیکھ کر اس نے تمام پرانی باتیں بھلا کر، خط سنانے کے لیے عمیر اور سویرا کو گھیر لیا۔ وہ دونوں بھی شرافت سے سننے لگے۔

خط کے جواب میں حبیبہ کو دعائیں دی گئی تھیں تبصرے پہ پسندیدگی کا اظہار تھا لیکن اس کی تحریروں کے لیے معذرت کر لی گئی تھی۔ کیونکہ موضوع پرانا اور ربط کی کمی تھی۔

عمیر اور سویرا نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکراہٹ دبا لی۔

☆☆☆

شرارتیں اور مذاق اپنی جگہ! وہ اپنی آپی کے جذبات اور تحریروں کے معاملے میں سنجیدگی اور محنت کو جانتے تھے لہذا اسے تسلیاں دینے لگے۔

"کوئی بات نہیں آپی..... بڑی بڑی رائٹرز کی بھی کئی تحریریں مسترد ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ لکھنا چھوڑ دیں۔ آپ محنت جاری رکھیں۔ مجھے یقین ہے ایک دن، آپ کا نام بھی ان ستاروں

میں جگمگائے گی۔"

سویرا کی تسلی نے حبیبہ کے دل پہ پھوار برسائی تو وہ دھیما سا مسکرادی۔

"بالکل یہی بات ہے۔ خیر مجھے تو پتا تھا تحریر ریجیکٹ ہوگی۔ وہی گھسا پٹا موضوع۔ ہیروئن کی محبت میں جان دینا، غریب کزن اور اس کے مقابلے میں امریکہ پلٹ کزن کی انٹری۔ اب ظاہری بات ہے ہیروئن معاشی حالات سدھارنے کے لیے امریکہ پلٹ کا ہی سہارا لے گی ہماری حکومت کی طرح۔ بھلا اس میں کیا نیا پن تھا آپی۔ آپ کچھ اور لکھیں۔ دیکھیں میں آپ کے لیے رجسٹر، پین اور بسکٹ لے آیا ہوں۔"

عمیر نے تحریر کے بچے ادھیڑے اور ساتھ ہی اپنی لائی ہوئی چیزیں پیش کردیں۔ حبیبہ نے مسکرا کر شاپر لیا اور نئے عزم سے لکھنا جاری رکھنے کا ارادہ کر کے اٹھ گئی۔ دونوں نے شکر کا سانس لیا کہ اداسی کے بادل جلد ہی چھٹ گئے تھے۔

☆☆☆

صابر حسین کا چھوٹا سا آشیانہ حبیبہ، سویرا اور عمیر کے دم سے آباد تھا۔ صابر حسین نام کی طرح ہی صبر شکر کرنے والے انسان تھے۔ بیوی سکھ، دکھ کی ساتھی اور محبت کرنے والی تھی تو تینوں بچے با ادب، فرماں بردار اور نیک، زندگی سے اور کیا چاہ کی جاسکتی ہے۔ سرکاری نوکری تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ زندگی خوشی اور اطمینان سے گزر رہی تھی۔

حبیبہ بی اے کا امتحان دے کر فارغ تھی جبکہ سویرا اور عمیر بالترتیب انٹر اور میٹرک میں تھے۔ حبیبہ کو شروع سے ہی ادب سے لگاؤ تھا۔ پڑھتے پڑھتے نجانے کب اس کے دل میں امنگ جاگی کہ وہ بھی لکھے۔ اس کی تحریروں پہ بھی تبصرے کیے جائیں۔ اس کا نام بھی اس کے پسندیدہ شماروں کی زینت بنے۔ لہٰذا ان دنوں وہ اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جتی ہوئی تھی۔

اب تک کوشش ثمر بار تو نہ ہوئی مگر وہ پھر بھی ناامید نہیں تھی۔ کبھی کہانی کی بنت ٹھیک نہ ہوتی تو کبھی موضوع پہ گرفت کمزور۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اچھی مصنفات کو پڑھ پڑھ کر وہ بھی اپنی خامیوں کو دور کرلے گی۔

لہٰذا جب تحریر ریجیکٹ ہوئی تو اس نے ان دنوں زیادہ پڑھنے پر توجہ مرکوز کردی۔ کچھ شمارے عمیر سے منگوائے، کچھ ناول اور افسانوں کے مجموعے سویرا کالج لائبریری سے لے آئی۔ گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

زندگی رواں دواں تھی کہ حماد نام کا کھٹکتا پتھر تلاطم بپا کرگیا۔ ہاں جی..... رشتہ آیا تو منظور کرلیا گیا۔

حبیبہ نے بھی خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا۔ ایم اے پرائیویٹ کرنے کا ارادہ تھا لہٰذا کوئی رکاوٹ بھی نہ اعتراض کی گنجائش، سویرا اور عمیر پہلے فنکشن کی وجہ سے پرجوش تھے تو اماں، ابا مناسب عمر میں اچھا رشتہ مل جانے پہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار۔

حبیبہ گھر والوں کی خوشی میں خوش اور رب کے فیصلے پہ راضی۔

☆☆☆

منگنی کے ہنگامے سرد ہوئے تو حبیبہ نے کاغذ قلم سے کافی دنوں بعد دوبارہ تعلق استوار کیا۔ کچھ موضوعات پہ تحریریں لکھیں اور عمیر کو پوسٹ کروانے کا کہہ کر مطمئن ہوگئی۔

"اوہو۔ آپی..... دنیا ویسے ہی اپنے حالات کی وجہ سے پریشان ہے اوپر سے آپ نے بھی روتی بلکتی پریشان حال لڑکی کی کہانی لکھ ڈالی۔ بے چاری ماں باپ کے حادثے میں چلے جانے کے باعث ظالم، چچا چچی کے رحم و کرم پہ ہے جو اس کے باپ کی جائداد ہڑپ بھی کرگئے اور ڈکار بھی نہ لیا۔ بھئی حیرت ہے ماموں، نانا، نانی کی غیرت نہیں جاگ رہی کہ بچی کی خبر لے لیتے۔"

عمیر کا بابا آواز بلند تبصرہ جاری تھا۔ حبیبہ کو افسوس ہوا کہ اس نے تحریر لفافے میں بند کرنے کے بجائے تحریر اور لفافہ عمیر کو دے کر کیوں اعتماد کرلیا کہ وہ بند کر کے خاموشی سے پوسٹ کرآئے گا۔

اس نے لپک کر اس سے لینے کی کوشش کی مگر اب وہ دوسری تحریر کھولے بیٹھا تھا۔

"لو جی یہ تحریر تو کسی ڈرامے سے ملتی جلتی لگ رہی ہے۔ معمولی سی ناچاقی پہ ہیروئن صاحبہ شوہر سے ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی ہیں۔ محترمہ کو چاہیے تھا میکے جاتیں مگر نہ جی۔ قریبی ہوسٹل میں پناہ گزیں

ہیں۔ شوہر پورے شہر میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ ملنے کے بعد شکر کا سانس لیا اور منا کر واپس لے آیا۔

اللہ کا واسطہ ہے آپی! نادان لڑکیوں کو گمراہ نہ کریں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گھر سے جانے والوں کو نہ معاشرہ قبول کرتا ہے نہ شوہر۔ یہ صرف ڈراموں، کہانیوں میں ہی ہوتا ہے کہ پلٹنے پر پھولوں کے ہار پہنائے جائیں۔ ارے لوگ جینا دوبھر کر دیں گے۔ طعنے طنز، الفاظ کے تیر، منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ پلیز لڑکیوں کو سمجھا دیں کہ گھر جنت ہے باہر کی دنیا بھیڑیا۔"

عمیر کے الفاظ حبیبہ کے دل پہ اثر کر رہے تھے واقعی تصویر کا یہ پہلو تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ حبیبہ نے فخر سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ جو اتنی سی عمر میں سمجھ دار اور حقیقت کا درست تجزیہ کر رہا تھا۔ بظاہر چلبلا اور کھلنڈرا نظر آتا عمیر دنیا کو اتنے اچھے سے جانتا تھا۔ حبیبہ کو خوشی ہوئی۔

خیر اس نے خاموشی سے اپنی تحریریں عمیر سے واپس لے کر ان میں مناسب تبدیلیوں کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

"کوشش سے کامیابی ممکن ....." بات سچ ثابت ہوئی اور حبیبہ کا افسانہ چھپ گیا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حبیبہ بار بار اپنے نام پہ انگلی پھیر رہی تھی تو سویرا پرجوش۔ عمیر بھی بہن کی خوشی اور کامیابی پہ نازاں تھا۔ ایما نے دعائیں دیں اور امی نے بھی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

حبیبہ خوش قسمت تھی کہ پڑھنے لکھنے، شماروں اور ڈائجسٹوں پہ پابندی نہیں تھی اماں ابا جانتے تھے کہ ڈیجیٹل دور میں صاف ستھرا ادب اور یہ شمارے نہ صرف بچیوں کو سلیقہ سکھا رہے تھے بلکہ زندگی گزارنے کا صحیح ڈھنگ بھی دے رہے تھے۔

رات سونے لیٹی تو خیال کی رو بھٹک کر حماد کی طرف چلی گئی۔ اس کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ نندیں اور ساس چکر لگاتی رہتی تھیں۔ خوش مزاج اور شفیق لوگ تھے۔ متوسط طبقے سے تعلق تھا۔ دولت کی ریل پیل نہیں تھی تو حالات تنگ بھی نہیں تھے لیکن پتا نہیں اس کو لکھنے کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ کیا پتا ڈائجسٹ ان کی نظر میں فضول اور لکھنا وقت کا ضیاع ہو تو پھر.....؟؟؟

بڑا سا سوالیہ نشان حبیبہ کے سامنے کھڑا تھا۔ ظاہری بات ہے وہ گھر کے سکون کی خاطر لکھنا چھوڑ دے گی۔ یہ سوچ کر اس نے مطمئن ہونا چاہا لیکن لکھنے کا شوق اور پڑھنے کی چاہ دل میں ڈوبتی ابھرتی رہے گی۔ نم آنکھوں سے حبیبہ نے سوچا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ خوشی کے لمحات خوب خوب منائے اور پھر رخصتی کا دن آن پہنچا۔ ہر وقت شرارتی موڈ میں رہنے والے عمیر اور سویرا نے پیاری آپی کی رخصتی کے وقت لپٹ لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔

حبیبہ نے چڑیا کی مانند اڑان بھری اور نئے آشیانے میں پناہ لی۔ دل، ماں باپ اور بہن بھائی کی جدائی پہ آزردہ تھا تو ذہن مستقبل کے خدشات اور خواہشات سے بوجھل۔

حماد اچھا اور بہترین شوہر ثابت ہوا۔ خیال رکھتا، احترام کرتا اور محبت کرتا تھا۔ سسرال روایتی نہیں تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ مخلص اور بے ریا۔ دعوتیں نپٹا کر گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ ڈال لیا مگر سویرا کے لاکھ کہنے پر بھی، حبیبہ نے کاغذ قلم سے رشتہ استوار نہ کیا۔

حبیبہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی اور فارغ وقت میں ساس، نندوں کے ساتھ باتیں کر لیتی۔ میکے کا چکر لگا لیتی یا حماد کے ساتھ گھوم آتی مگر نہ ڈائجسٹوں کی فرمائش کی اور نہ ہی لکھنے کا ارادہ کیا۔

عمیر شمارے لاتا بھی تو امی کے گھر رکھے رہ جاتے۔ سب کو میکے میں یہ ہی لگتا کہ وہ سسرال میں خوش اور مگن اس لیے نہیں لکھنا چاہتی مگر حقیقت یہ تھی کہ حبیبہ کو خدشہ تھا کہ حماد، منع کر دے گا یا سسرال والے برا مانیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ وہ ہی خاموش رہے تاکہ نہ دکھ ہو نہ دل برا ہو۔

☆☆☆

وہ بھی معمول کی طرح شروع ہونے والا ایک

دن تھا، حبیبہ نے گھر کے کام نمٹائے اور اپنے کمرے میں آرام کرنے آ گئی۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں ابھی وقت باقی تھا لہٰذا کچھ دیر لیٹنے کا سوچا۔

رات کو امی کے گھر سے لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ لہٰذا اب نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ ابھی غنودگی میں ہی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔ حبیبہ کو یقین تھا کہ حماد کی ہی کال ہو گی۔ عموماً وہ آفس جا کر وقفے وقفے سے کال کرتا رہتا تھا۔ بغیر دیکھے موبائل کان سے لگایا اور اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مدیرہ کی کال تھی، جو اس کی لمبی غیر حاضری کی وجہ پوچھ رہی تھیں اور مزید لکھنے کی فرمائش بھی کی۔

حبیبہ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ نئی رائٹر ہونے کے باوجود اس کی کمی محسوس کی جائے گی اور عزت دی جائے گی۔ ثابت ہو گیا تھا کہ اس کے پسندیدہ ڈائجسٹ سے منسلک لوگ محبت کرنے والے تھے اور تمام رائٹرز کو اہمیت دیتے تھے۔

شادی کا بتایا تو مدیرہ نے مبارک باد دے کر اپنی فرمائش کو دہرایا اور کچھ دیر بات چیت کے بعد کال بند کر دی۔ حبیبہ نے سویرا اور عمیر کو واٹس گروپ میں میسج کر کے بتایا تو دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور تو اور شام کو دونوں ہی مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ حاضر ہو گئے۔

حبیبہ کو لگا کہ سسرال والوں کو عجیب لگے گا کہ اتنی چھوٹی سی کال کے لیے مٹھائی مگر سب نے ہی سویرا اور عمیر کی بات سن کر خوشی کا اظہار کیا۔ سسرال میں شوبز میں کوئی نہیں تھا لیکن سب کو ہی خوش گوار حیرت ہوئی کہ حبیبہ لکھتی بھی ہے۔

عمیر شروع ہوا تو، الف سے ے تک ساری رام کتھا حماد کو سنا دی۔

"جی تو حماد بھائی! یہ تھی ہماری پیاری بہن کی ان تھک محنت، کوشش اور جدوجہد، خون پسینہ بہا کر ان کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔"

سب ہی عمیر کے الفاظ کے چناؤ اور انداز سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بلاشبہ وہ خوب صورت دن اور یادگار شام ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

ویک اینڈ پر، حماد سوداسلف لے کر آیا تو ایک پیکٹ حبیبہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس میں کاغذ کے پلندے، ہائی لائٹر، ملفافے اور رائٹنگ پیڈ تھا۔ حبیبہ کو یقین ہی نہیں آیا۔

"مجھے شغف نہیں ہے لیکن تم لکھو گی تو میں ضرور پڑھوں گا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا کہ تم مصنفہ ہو۔"

حماد نے کہا تو حبیبہ مسکرا دی۔

"حماد! مجھے لگتا تھا آپ یہ سب پسند نہیں کریں گے اور میں بڑی مصنفہ بھی نہیں ہوں۔ زیادہ نہیں لکھ پاتی میں۔"

اس کے معصومیت سے کہنے پر حماد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"محبت سے بڑھ کر کون سا موضوع ہو گا۔ میں محبت کروں گا۔ تم لکھنا۔ محبت کرنے والے شائع کریں گے اور محبت کی قدر کرنے والے دل کی آنکھوں سے پڑھیں گے۔"

حماد نے محبت سے کہا تو حبیبہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ وقت نے ثابت کیا کہ وہ خوش نصیب تھی۔ اس کا جیون ساتھی اس کی خواہشات کا احترام کرنے والا بھی تھا۔

شام کو اس نے اتنے عرصے بعد قلم ہاتھ میں تھاما تو یوں لگا، الفاظ کب سے اس کے انتظار میں تھے۔ کچے بعد دیگرے کاغذات پر تتلیوں اور بھنوروں کی مانند اترتے چلے گئے۔ اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ کافی دیر تک متواتر اور تسلسل کے ساتھ لکھ کر اس نے اپنی تحریر حماد کو دکھائی تو اسے بھی اچھی لگی۔

"بیگم! انٹرویو دینا تو میرا ذکر ضرور کرنا۔ میری محبت نے ہی تو ہیرے کو تراش کر خوب صورت تر بنایا ہے۔" شرارت سے کہتے ہوئے حماد حبیبہ کی متوجہ ہوا۔ حبیبہ نے تحریر کے اوپر موجود نام پر انگلی رکھ دی۔

"حبیبہ صابر حماد" کا نام جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔

حماد کو خوشی ہوئی کہ اس نے پہلی دفعہ اپنے نام کے ساتھ حماد کا نام لکھا تھا اور حبیبہ خوش تھی کہ اس کی زندگی میں آنے والے دونوں مرد، اس کا باپ اور اس کا شوہر اس کے شوق میں رکاوٹ نہیں بنے تھے۔

حماد نماز کے لیے گیا تو حبیبہ نے سویرا اور عمیر کو کال ملائی۔ آج دیوان کے چلبلے تبصروں اور شرارتوں کو بہت مس کر رہی تھی۔

اندھیرا پھیل رہا تھا مگر حبیبہ کی آنکھوں کی روشنی اور چہرے کا اجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ شوہر کی محبت اور مان نے اس کے چہرے کی الوہی چمک میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

☆☆

لبنیٰ آصف

الفاظ اور جملے

"آپی! تنگ آ گئی ہوں۔ بچے بہت لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنا تو سیکھا ہی نہیں ہے۔ بس ہر بچہ اپنے آپ کو صحیح سمجھتا ہے۔ دماغ سن کر دیا ہے بچوں نے آپی، میں بتا رہی ہوں کسی دن میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

"چپ کر جاؤ اریبہ! منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالا کرو۔ بچوں کو تو بعد میں سمجھانے کی ضرورت ہے پہلے تم تو سمجھو۔"

"تو کیسے سمجھاؤں؟"

"سمجھاؤں؟ بچوں کو بعد میں سدھارنا پہلے اپنے آپ کو سدھارو۔ کیسے کیسے الفاظ بولتی ہو کبھی سوچا ہے کہ بچوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ پیار سے پوچھو۔ وجہ جانو، کیوں لڑ رہے ہیں۔ ماں ہو ماں بنو، بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی ہو۔ بچے لڑ رہے ہوتے ہیں اور تمہارے جملے ڈنڈا لے لو اور ایک دوسرے کا سر پھاڑ دو۔"

"آپی! آپ کو نہیں پتا؟ ایک پینسل بھی عمر اگر انابیہ کی لے لے تو بات، ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔ دل جلتا ہے تو منہ سے نکلتا ہے۔ بقر عید کی چھریاں نکال دیتی ہوں۔ کاٹ ڈالو ایک دوسرے کو۔"

"ذرا تحمل سے دونوں کی بات سنو پھر فیصلہ کرو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو بات بات پر غصہ کرتی ہو۔"

"کیا کروں آپی! کام کر کے اتنا تھک جاتی ہوں کہ ذرا سی بات برداشت کرنا مشکل ہے۔"

"خود تم میں برداشت نہیں۔ اور بچوں سے توقع ہے کہ وہ برداشت سے کام لیں، ایسے کون سے کام ہیں جنہیں کر کر کے تم ہلکان ہو گئی ہو۔ میاں اور بچے نہیں سنبھل رہے تم سے۔"

"آپی! صبح سے صفائی شروع کی ہوئی ہے۔ کھانا پکایا، اسی میں بھاگ بھاگ کر گیٹ کھولنا، ماسی، کچرے والا، دودھ والا، آپی گھن چکر بن جاتی ہوں۔"

"تو بی بی..... کس نے کہا ہے کہ گھر شیشہ کی طرح چمکاؤ۔"

"آپی! مجھے شوق ہے صاف ستھرا، سجا ہوا گھر ہو۔"

"بھاڑ میں گیا تمہارا شوق، سارا دن اپنا آپ جلاتی ہو۔ چیزیں جگہ پر ہوں، گھر صاف ہو چمکن چمک رہا ہو۔ بھئی گھر ہے انسان رہتے ہیں۔ چیزیں آگے پیچھے ہو جاتی ہیں مگر تم یہ جگہ پر رکھو، وہ اٹھاؤ۔"

"کیا کروں آپی! نیچر ہی ایسی ہے۔"

"نیچر اچھی کہی! یہی انرجی دوسرے کاموں میں لگاؤ۔ بچوں کو وقت دو ان کی سنو۔ کام کر کر کے تھک جاتی ہو اور پھر میاں اور بچوں پر چیختی ہو۔ بدلو اپنے آپ کو اریبہ، مت کیا کرو! فالتو کے کام۔"

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔ "سب بہرے ہو گیا! بس ماں ہی کھولے دروازہ۔"

"اتنے بڑے جملے کے بجائے۔ بچوں کو آواز دے کر بس یہ کہہ دیتیں کہ دروازہ کھول دو۔" آپی نے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"اریبہ! ذرا آہستہ بولا کرو، باہر تک آواز آ رہی ہے۔" ارسلان نے دروازے سے اندر داخل ہوتے اریبہ سے کہا۔

"ارے! آپی آئی ہیں السلام علیکم آپی۔"

"وعلیکم السلام! ارسلان کیسے ہو.....؟"

"ٹھیک ہوں آپی! آپ نے بہت دن کے بعد چکر لگایا۔"

"ہاں! ہم تو پھر بھی آ گئے تم تو قریب ہو کر بھی چکر نہ لگانا۔"

"آپی میں نے کہا تھا اریبہ سے دو تین بار مگر اریبہ کے کام اتنے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔"

"ہاں! ملک کی وزیر اعظم ہیں نا تمہاری بیگم، ملک کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں کر لیں شکایتیں بس آپ کی ہی کمی تھی۔"

"شکایتیں نہیں کر رہا بتا رہا ہوں کہ تم کام بہت کرتی ہو تھک جاتی ہو۔"

pklibrary.com

''اور خود تو آپ مل کر پانی نہیں پیتے یہ نہیں کہ میری کچھ مدد ہی کروادیں۔''

''ہاں ہاں! تمہارے ساتھ گھر کی صفائی کا کام سنبھالے، گھر کے مسالے پسوائے۔ رول سموسے بنوائے۔ تو خوش ہوگی تم۔''

''آپی! سب کچھ بازار میں ملتا ہے۔ سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں مگر اریبہ کو اپنے ہاتھ کا ہی پسند آتا ہے۔''

''جو کام سب سے ضروری ہے۔ وہ ہوتا نہیں تمہاری بیگم سے۔ بس فالتو کے کام کروالو۔''

☆☆☆

اریبہ چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات لیے چلی آرہی تھی۔ ارسلان مدد کے لیے اٹھا۔

''سب کچھ گھر کا بنا پرفیکٹ۔ مگر کہیں کہیں اگر کچھ چیزیں پرفیکٹ نہ بھی ہوں تو کام چل جاتا ہے۔''

ارسلان نے بچوں کو بھی آواز دے کر چائے پینے کے لیے بلالیا۔ بچے اپنے انداز میں بس بول کر کھا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اریبہ کی روک ٹوک۔

''عنایا بیٹا! مما کی ہیلپ کیا کرو۔''

''بابا! میں کوشش تو کرتی ہوں لیکن مما کو میرے ہاتھ کا کیا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا۔ کل بھی رات کا کھانا ٹیبل پر لگایا تو مما نے بہت ڈانٹا کہ پلیٹیں بیچ میں ہونی چاہیے۔ گلاس سائیڈ میں۔ ہاٹ پاٹ بھی غلط رکھ دیا تھا۔ بچے سب ساتھ رکھ دیے۔ چھوٹے بڑے چمچ الگ کر کے رکھنے تھے۔ سالن کی ڈش رکھتے ہوئے تھوڑا سا گر گیا۔ مما مجھ سے ناراض ہوگئیں میں نے صاف بھی کر دیا تھا۔''

''تو آنکھیں کھول کر کام کیا کرو۔ بس دوڑ دوڑ کر سامان رکھے جارہی تھیں دل سے کام کروگی تو تعریف ہوگی۔'' عنایا خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔

ارسلان بہت گہری نظروں سے اریبہ کو دیکھنے لگا۔

''آپی! یہ ایسے ہی کرتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے وہ اپنی جگہ ہوٹل ہے کہ چمچے، پلیٹ سب سیٹ ہو ورنہ ہوٹل کا نام خراب ہو جائے گا۔ باپ، بھائی اور ماں کے لیے بچی نے ٹیبل سیٹ کی ہی۔ گھر ہے بھئی! دھیرے سے مسکراتے ہوئے سمجھاؤ گی تو سیکھے گی۔ اتنی تنقید کروگی تو پھر ایسے ہی کرتی رہنا کام بچے، بچوں کی طرح ہی کریں گے کام۔ بچوں کے کام اور بڑوں کے کیے کام میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔''

''آپی! میں بھی سکھانے کے لیے ہی بولتی ہوں۔''

''مگر تمہارا طریقہ کار بہت غلط ہے۔''

''اچھا آپی! ناراض تو نہ ہوں کروں گی کوشش۔''

''بس اتنا کام کرو جتنی ہمت ہے۔ سارا ٹائم یہ فضول کی صفائیوں اور سیٹنگ میں نہ لگاؤ۔ بچوں اور میاں کے پاس بیٹھو ان کی بھی سنو۔''

''جی آپی! کوشش کروں گی۔''

پھر باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا عشاء کی اذان ہونے لگی۔

ارسلان آپی سے کہنے لگا کہ آپی اتنے دن بعد آئی ہیں کھانا کھا کر جایے گا۔ اریبہ بھی کچن سے نکل آئی۔

''آپی رک جائیں ناں گھر کے مسالے سے وائٹ کڑاہی پکائی ہے۔''

''نہیں اریبہ، اب جاؤں گی۔''

''اتنے میں بچوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ اریبہ کے جملے نے ارسلان اور آپی کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''بیٹا، تلواریں دوں۔ شہید کردو ایک دوسرے کو۔''

''ارسلان! بند کر لو دروازہ کچھ نہیں ہو سکتا تمہاری بیگم کا۔''

☆☆

نعیمہ ناز سلطان

حبس کے موسم

مکمل ناول

چھوٹے سے دو گھٹے ہوئے تنگ و تاریک کمرے جن میں ہوا و روشنی کی آمد برائے نام ہی تھی۔ دم گھونٹ دینے والا حبس ہو یا پسینے میں نہا جانے والی گرمی۔ سرما کی کپکپا دینے والی راتوں میں یخ فرش پر پاؤں رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔

سارہ کے لیے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

''بھابھی۔''

''ارے سارہ۔ آؤ..... آجاؤ۔''

وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھیں۔ ان کا چہرہ جو کبھی بے حد حسین اور خوب صورت تھا مگر اب بہت مرجھایا ہوا تھا۔ زردی نے کملائے ہوئے چہرے کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ کبھی وہ بڑی تر و تازہ شاخ گلاب کی مانند تھیں۔ مگر گزرے ماہ و سال اور حالات نے ان کی ساری تازگی و شادابی نچوڑ لی تھی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' سارہ نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' بھابھی کے چہرے پہ بے بس مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔''

سارہ بڑی عجلت میں تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ اگر بڑی اماں کو بھنک بھی پڑ جاتی تو اس کی خیر نہیں تھی۔ اور بڑی اماں ناراض ہوتیں تو سلمان کی خفگی لازمی تھی جسے وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ جس انسان کے ساتھ اس کا مستقبل وابستہ تھا، جس کے ساتھ دل کے تار جڑے تھے اس کی ناراضی کیا معمولی سی خفگی بھی نہیں سہہ سکتی تھی، جلدی سے انہیں خدا حافظ کہہ کر وہ اس پورشن سے باہر آئی۔ جہاں بڑا سا صاف ستھرا موزائیک والا فرش تھا۔ قطار سے گملے رکھے تھے۔ رنگ برنگے پھول اور خوب صورت بیلیں اپنی بہار دکھلا رہی تھیں۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی ہزار گز پہ محیط بہت ہی شان دار اور کشادہ بنگلہ، پر آسائش اور آرائش سے مزین، سارہ بھابھی کے مختصر گھٹے ہوئے حبس زدہ پورشن سے بالکل مختلف یہ ایک جنت تھی اور وہ ایک جہنم۔

''اللہ توبہ، بے چاری گل بھابھی اپنے بچوں کے ساتھ نہ جانے کیسے رہتی ہیں وہاں؟ کوئی سہولت نہیں نہ ہی کوئی آسائش، بس ذلت اور پریشانی، محرومی اور مسائل اللہ رحم کرے ان پر۔''

سارہ کا دل ترحم اور افسوس سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ نیچے آگئی جہاں سب کی محفل جمی تھی۔ چمکتے دمکتے چہرے زرق برق نئے نئے ملبوسات، بے فکر قہقہے، گپ شپ میں روانی اور تسلسل۔ سارہ ان کے درمیان بیٹھی اور ذرا دیر میں وہ بھول بھی گئی کہ کچھ دیر پہلے وہ اوپر کیا دیکھ کر آئی تھی اور کس طرح کڑھ رہی تھی اور عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتی، گل بھابھی کا حال اور حالات دیکھ کر افسوس کرتی دل دکھی ہو جاتا اور پھر کچھ وقت کے بعد سب کچھ فراموش کر کے وہ اپنی دلچسپیوں میں کھو جاتی۔ اور دل چسپیاں کوئی عام بھی تو نہیں تھیں۔

یہ خوابوں کا گھر اس کی ہونے والی سسرال تھا۔ بڑے شوق اور چاہت کے ساتھ انہوں نے سارہ کا انتخاب کیا تھا اور یہ سارہ کی خوش نصیبی تھی کہ جہاں

سلمان اس پر جان چھڑکتا تھا وہاں بڑی امی بھی اس کی گرویدہ تھیں۔ آج گھر میں درس قرآن تھا، انہوں نے خاص طور پہ سارہ کو بھی انوائیٹ کیا تھا کہ وہ اپنا پورشن دیکھ لے جو خاص طور پہ اس کے اور سلمان کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ سب کچھ مکمل تھا۔ نیا نویلا پورشن تمام تر آرائش و زیبائش کے ساتھ تیار تھا۔ شادی کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ اگلے ماہ وہ دلہن بن کر اس گھر میں آنے والی تھی۔ اپنا نیا پورشن ساز و سامان، سجاوٹ، بناوٹ اس سے جڑے خوشیوں اور خوابوں کا عکس اور تصور، سارہ کا دل تاروں بھرا آسمان بن گیا تھا، چمکتا دمکتا، روشنیوں سے اجالوں سے بھرا۔

سب کچھ کتنا خوب صورت ہے اور زندگی کتنی حسین ہے۔ سارہ نے اپنی جگمگاتی آنکھوں سے اپنے چاروں اطراف دیکھا اور اس لمحے وہ بالکل فراموش کر گئی کہ اس بڑے سے بنگلے کے ایک مختصر سے حصے میں ایک عورت، اپنے چار بچوں کے ساتھ بہت ہی سخت اور مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ اوروں کی طرح وہ بھی گل بھا بھی کو بھول کر اپنی خوشیوں میں مگن تھی۔

☆☆☆

بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ سارہ اور سلمان کا بیاہ ہوا تھا۔ وہ یوں بھی بہت پیاری سی تھی، ایک سادگی اور معصومیت تھی جس نے اسے بہت پرکشش بنا دیا تھا۔ دلہنا پے کا روپ ٹوٹ کر آیا تھا۔ شادی کے بعد نو بیاہتا جوڑا ماہ عسال پر چلا گیا۔ چند ہفتوں بعد واپسی ہوئی تو مانو ان تمام مقامات کی چاندنی، تازگی اور خوشبو وہ دونوں اپنے اندر سمولائے تھے۔ سارہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی کا فوارہ بات بے بات چھوٹ جاتا۔ گھر بھر میں اس کی قلقل کرتی ہنسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے وجود کی خوشبو اور چہرے کی چاندنی کی طرح۔

Pklibrary.com

وہ ناشتہ کر رہی تھی جب اسے اچانک کچھ یاد آیا۔

"افوہ..... یہ تو میں بھول ہی گئی پتا نہیں کیسے بالکل ہی دماغ سے نکل گیا۔" سارہ نے تاسف سے آنکھیں بند کیں۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ارادہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ناشتہ کر کے وہ اپنے بیڈ روم میں گئی۔ تحائف سے بھرا ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے لے کر وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گئی اور گل بھابھی کے پورشن میں پہنچی۔

کمرے کی خستہ حالی اور بے سروسامانی پہلے جیسی ہی تھی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ گل بھابھی مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ سارہ کو دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"تمہارے آنے سے بہت خوشی ہوتی ہے مجھے، باقی تو سب نے ہی میل ملاپ بہت ہی کم کر دیا ہے۔ بھولے بھٹکے کوئی آجائے تو..... تمہارا شکریہ کہ تم باقاعدگی سے حال احوال پوچھ لیتی ہو۔" گل بھابھی کے خوب صورت چہرے پہ افسردگی تھی ان کی آواز بھی رنجیدہ تھی اور الفاظ بھی۔

"شرمندہ نہ کریں بھابھی، بس یہ بتائیں میرے لائق کوئی خدمت؟"

"تم سمیت کوئی کچھ نہیں کر سکتا سارا، اپنی جنگ خود اکیلے ہی لڑنی ہے۔ بس تم آجاتی ہو، ہنس بول لیتی ہو اچھی طرح سے یہی کافی ہے۔" گل بھابھی نے ماحول کی افسردگی اور اداسی کو شاید خود بھی محسوس کر لیا تھا اس لیے یکا یک مسکرا کر انہوں نے موضوع بدل دیا۔

"تم سناؤ، ہنی مون کیسا رہا، کہاں کہاں، کیا کیا دیکھا؟"

"بہت مزا آیا۔" سارہ شرما کر مسکرا دی پھر دھیرے دھیرے اپنی سیر و تفریح کا احوال بتاتی رہی۔ اپنے موبائل سے اپنی اور سلمان کی بہت ساری تصاویر بھی دکھائیں۔

"اب میں چلوں گی بھابھی۔"

تھوڑی دیر بعد سارہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باتوں باتوں میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ یہ حصہ اور یہ فیملی ممنوعہ تھے جن سے ملنا جلنا تائی امی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو شکر ہے کہ تائی امی ابھی سو رہی تھیں۔ بہت عمر سے انہیں شب بیداری کی شکایت تھی۔ تمام رات ہو جاتی تھی انہیں جاگتے ہوئے، لاکھ کوششوں کے باوجود بھی رات میں نیند نہ آتی، خود کو ٹرنکولائزر کا عادی نہیں بنانا چاہتی تھیں اس لیے نیند کی گولیوں سے اجتناب برتا ہوا تھا۔ لہٰذا اب ان کا معمول تھا کہ وہ رات کا بیشتر حصہ جاگتی رہتیں اور جب نیند آتی تو دن چڑھے تک سوتی رہتیں۔ سارہ کو اس وقت ان کے سونے کا یقین تھا۔ اسی لیے اس نے گل بھابھی کے پاس جانے کی ہمت کر لی تھی وگرنہ ایسی جرات نہ کرتی۔

نئی نویلی دلہن تھی نئے نئے سنہرے دن تھے۔ گھر میں کام کاج کے لیے ملازمائیں موجود تھیں۔ سارہ کی تمام دن کی مصروفیات میں گھر کا کوئی کام یا ذمے داری نہیں تھی وہ بس تیار ہو کر بیٹھ جاتی، نک سک سے درست آراستہ و پیراستہ، شام میں سلمان آتا تو دونوں گھومنے پھرنے نکل جاتے، رات گئے کھا پی کر واپس آتے اور اگلے روز پھر وہی روٹین۔

"بات سنیں؟"

"جی حکم۔" سلمان دل و جان سے اس کی طرف متوجہ تھا۔

"بور ہو گئی ہوں میں اس روٹین سے۔" سارہ نے منہ بسورا۔

"کون سی روٹین سے؟ اتنی رومانٹک، اتنی حسین لائف سے کون بور ہوتا ہے؟" سلمان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ لائف میں کچھ اور ہے ہی نہیں، سوائے اچھے اچھے کپڑے، جیولری، میک اور سیلفیز کے، تھک گئی ہوں ان سب سے۔"

سارہ ذرا مختلف مزاج و انداز کی تھی، ان سب چیزوں سے بور ہو رہی تھی جنہیں بہت سے افراد نے خصوصاً سوشل میڈیا پر زندگی اور موت کا معاملہ و مسئلہ بنایا ہوا ہے۔

"مجھ پر حکومت کر رہی ہو، کرتی رہو میری جان، بلیومی بالکل بوریت نہیں ہوگی۔"

"میں سنجیدہ ہوں کوئی اچھی اور سیریس قسم کی تھاٹ فل ویڈیو بنانی ہے مجھے، میرے فالوورز بھی شکایت کر رہے ہیں کہ کوئی اچھی سی نئی ویڈیو بناؤں، کسی سوشل ایشو پہ، جیسا کہ ہمیشہ بناتی ہوں، بس میں یہی سوچ رہی تھی کہ روٹین سیٹ ہو جائے پھر کام کروں گی۔ مگر اب یوں خالی بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا۔"

"تمہیں جو کرنا ہے کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے بھی یہاں کون سے اعتراض کرنے والا، امی کو ویسے بھی تمہاری کسی ایکٹیویٹی پہ کوئی اعتراض نہیں۔"

سلمان کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ سارہ صرف شکل کی پیاری نہیں تھی بلکہ بہت پیاری عادتوں کی مالک بھی تھی۔ سلمان اس پر فدا تھا شادی کے اولین دن تھے۔ والہانہ پن اور فریفتگی کا خمار شب و روز میں پھیلا ہوا تھا۔ سسرال میں کوئی ایسی روایتی الجھنیں اور پریشانیاں نہیں تھیں۔ سارہ خود کو بہت خوش نصیب خیال کرتی تھی، اللہ کا بہت شکر ادا کرتی تھی۔

"تو آج سے اپنا کام شروع۔"

سارہ نے موبائل پہ سرچ کرتے ہوئے خود کو مخاطب کیا۔ تین برس پہلے اس نے اپنا یوٹیوب چینل شروع کیا تھا۔ سماجی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی، مختلف موضوعات پر اس کی وڈیوز دھیرے دھیرے مقبول ہوتی چلی گئیں اور آج اس کے کثیر تعداد میں فالوورز تھے وہ سادہ سے انداز میں اپنی بات کہتی تھی۔ نہ بھاری بھرکم الفاظ نہ موٹی موٹی اصطلاحات، نہ جذباتیت، نہ گھن گرج اور مبالغہ

پہلے پہل اس نے یونہی شوقیہ اسے شروع کیا تھا۔ مگر جب فالوورز کی تعداد بڑھنے لگی تو اس نے سنجیدگی سے زیادہ محنت شروع کر دی۔

کام مکمل کر کے وہ اٹھی تو ایک زوردار انگڑائی لی اور کرسی پر دوبارہ بیٹھ کر پشت سے ٹیک لی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا۔

کتنا سکون مل رہا ہے۔ آنکھیں موندے موندے اس نے سوچا۔

"بیگم صاحبہ، کھانا لگا دوں؟" ملازمہ نے کمرے میں اسٹری دی۔

"آں..... بھوک نہیں ہے ابھی۔" سارہ نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مجھے جب بھوک ہوگی میں کھا لوں گی۔ تم جاؤ۔"

"جی۔"

ملازمہ چلی گئی اور سارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے درست کیں جو یوں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں پہ برش پھیرا۔ لپ اسٹک فریش کی اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ تائی امی ایک رشتے دار کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ سارہ نے موقع غنیمت جانا اور گل بھابھی کے پاس اوپر چلی گئی۔ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو بہلا رہی تھیں۔ سارہ کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ ان کے ملاقاتی یوں بھی برائے نام ہی تھے۔ سارہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی ان کے پاس آ ہی جاتی تھی حال احوال پوچھنے کے لیے، یہ اور بات کہ یہ کام وہ تائی امی اور سلمان سے چھپ کر کرتی تھی اور اس کی دو ہی وجوہات تھیں۔

اس کے دل میں لوگوں کے لیے عمومی طور پر ہمدردی اور محبت کے جذبات تھے۔ اور اسے گل بھابھی سے قدرتی طور پر لگاؤ تھا۔ اسے ترس آتا تھا گل بھابھی اور ان کے بچوں کی حالت زار دیکھ کر اور اندر ہی اندر کہیں ندامت اور شرمندگی تھی جو یہاں

ے آتی تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی ان کی مدد کے لیے، ان کا حق دلانے کے لیے، سوائے لفظوں سے، اپنی آمد سے انہیں کچھ دیر کی خوشی دے دیتی۔

"کیا ہوا ہماری پرنسز کیوں رو رہی ہے۔" سارہ نے گول مٹول پیاری سی حوریہ کو اپنی گود میں بٹھایا۔

"کچھ نہیں بس یونہی، بچوں کی ضدیں تو تمہیں معلوم ہے کسی بھی بات پر سوئی اٹک جاتی ہے۔ چلو حوریہ، تم اپنے کھلونوں سے کھیلو۔"

گل بھابھی نے زبردستی مسکراتے ہوئے، حوریہ کو منظر سے غائب کر دینا چاہا مگر سارہ نے اسے گود میں بٹھائے رکھا۔

"پرنسز خود بتائیں گی کیا بات ہے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔"

"مما نے پرامس کیا تھا کہ میری ہیپی برتھ ڈے پر کیک بھی لائیں گی اور گفٹ بھی مگر ابھی تک نہیں لائیں۔" حوریہ نے منہ بسورا۔

"ارے آج تمہاری برتھ ڈے ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا چلو پھر کیک اور گفٹ دونوں پکے۔" سارہ نے اس کے پھولے پھولے گالوں پہ پیار کیا۔

"سچ؟" حوریہ کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بالکل پکا والا پرامس۔" سارہ نے اس کے گدگدی کی۔ وہ ہنس پڑی۔

"کب آئے گا کیک؟" حوریہ کا اشتیاق اس کے سوال سے بھی چھلک رہا تھا اور چہرے سے بھی۔

"کیک آجائے گا تم آپی کو تنگ نہ کرو۔" گل بھابھی نے اسے گھر کا۔

"بھابھی میں ابھی آتی ہوں۔ آپ حوریہ کو تیار کر دیں۔" سارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں سارہ تم ان معاملات میں نہ پڑو تمہاری ساس صاحبہ کو علم ہو گیا تو مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔" گل بھابھی اس کا ارادہ بھانپ کر گھبرا سی گئیں مگر ان کے الفاظ اور لہجے میں تلخی تھی۔

"انہیں پتا نہیں چلے گا۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

میں بس یوں ہی یوں آئی۔ سارہ نے ان کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ بس اپنی کہی اور یہ جا وہ جا۔

گھر کے قریب ہی بڑی مارکیٹ تھی۔ ذرا آگے ایک مارٹ بھی تھا۔ سارہ نے کیک، موم بتی، غبارے، ربن اور اسپرے وغیرہ خریدے، حوریہ کے لیے تحفہ لیا۔ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی کیک کے ساتھ ہی بیکری سے خریدا اور تھیلوں سے لدی پھندی گھر واپس پہنچی، سامان گل بھابھی کے حوالے کیا، وہ بڑی شدومد سے انکار کر رہی تھیں مگر سارہ کے خلوص اور محبت کے آگے جیسے بے بس سی ہو گئیں۔

"اتنا مت کرو سارہ، ہم عادی نہیں رہے۔ اب ان سب کے۔" وہ آہستہ سے بولیں۔

"اتنی مایوسی کی باتیں نہ کریں بھابھی، ان شاء اللہ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سارہ نے انہیں تسلی دی اور اپنی لائی ہوئی اشیاء سے وہ کمرہ سجانے لگی جس کے در و دیوار سے بوسیدگی، شکستگی اور مفلسی چھلک رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے وہاں گزار کر وہ نیچے واپس آئی۔ حوریہ کی ہنسی اور آنکھوں کی چمک اس کے ہمراہ تھی۔ مگر بات اتنی چھوٹی نہیں تھی کہ چھپ جاتی، نہ ہی اتنی معمولی کہ تائی امی نظر انداز کر دیتیں۔ گھر واپس آنے کے دس منٹ بعد ہی انہیں رپورٹ مل گئی اور پھر وہی ہوا جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ فوراً سے پیشتر سارہ کی طلبی ہو گئی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی اوپر جا کر اس ڈائن سے ملنے کی، تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس گھر کے ہر فرد کا وہاں جانا منع ہے۔ اس ناگن سے ملنا منع ہے۔ میرا بس چلے تو ابھی اسی لمحے گھر سے باہر پھینک دوں ان سب کو۔"

تائی امی نے سارہ سے کچھ بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی وہ غصے میں پاگل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بے نقط جو سنانا شروع کیا تو ایک لمحہ کو سارہ بھی چکرا گئی۔ تائی امی اور گل بھابھی کے تعلقات کی خرابی کا اسے علم تھا مگر اتنی نفرت کا تصور بہر حال اس کے ذہن

pklibrary.com

''تائی امی! وہ بچی ہے بس اسی کی وجہ سے میں۔'' سارہ نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

''کوئی بچہ اور بچی نہیں وہاں، سب سنپولیے ہیں اس ناگن کے۔''

تائی امی کے ایک ایک لفظ اور وجود کے ایک ایک مسام سے شدید نفرت عیاں تھی۔ سارہ ان کا شدید رویہ دیکھ کر شاکڈ بھی تھی اور حیران بھی، تائی امی نے اس کی کوئی بھی وضاحت سننے کی زحمت نہیں کی بس انتہائی سختی سے اسے تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔

سارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ بڑی صلح جو اور شائستہ مزاج لڑکی تھی۔ تائی امی سے کسی قسم کی بدتمیزی اور زبان درازی تو نہیں کی مگر سوچنے پر ضرور مجبور تھی۔ گل بھابھی کی ناگفتہ حالت اور کسمپرسی پہلے دور سے دیکھتی تھی اب قریب سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے وہ سرسری سوچتی تھی اب گہرائی میں جا کر سوچ رہی تھی۔

سلمان نے بھی اسے سمجھایا تھا کہ وہ گل بھابھی سے دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ کیونکہ تائی امی کے لیے یہ ناقابل برداشت ہے کہ ان کی لاڈلی بہو۔ اس بہو سے تعلقات رکھے جس سے وہ نفرت کرتی ہیں۔ اگرچہ سلمان کا رویہ سخت نہیں تھا نہ الفاظ درشت تھے۔ مگر سارہ کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ بھی گل بھابھی کی مخالفت کرتے ہوئے ان سے ملنے کو منع کرے گا۔

''وہ بہت برے حال میں ہیں سلمان، مجھے تو اتنا اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اتنے برے حالات میں سروائیو کر رہی ہیں اور ان کے بچے؟ وہ آپ کا ہی خون ہیں۔ آپ کے سگے بھائی کی اولاد آپ کا دل کیسے گوارا کرتا ہے انہیں اتنی تکلیف اور مصیبت میں دیکھنا۔ آپ تائی امی کو سمجھانے کے بجائے مجھے سمجھا رہے ہیں۔''

سارہ دنگ رہ گئی تھی پھر جب بولی تو بولتی ہی چلی گئی تھی۔

''گل بھابھی کی جو بھی حالت ہے اور حالات ہیں۔ ان کی ذمے داری خود انہی پر عائد ہوتی ہے۔ وہ یہاں کمفرٹیبل نہیں ہیں تو یہاں سے چلی جائیں بلاوجہ خود بھی ہلکان ہو رہی ہیں اور بچوں کو بھی مصیبت میں ڈالا ہوا ہے۔''

''وہ کہاں جائیں گی؟ کہاں جا سکتی ہیں؟ کیا ٹھکانہ ہے ان کے پاس؟''

''ٹھکانے کا بندوبست ہم کر دیں گے وہ یہاں سے نکلنے پر راضی تو ہوں گھر بھی مل جائے گا اور اکاؤنٹ میں رقم بھی جمع ہو جائے گی گزر بسر کے لیے۔''

''سچ مچ کریں گے یہ سب یا زبانی جمع خرچ کر رہے ہیں؟'' سارہ نے بے یقینی سے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

''گارنٹی ہے میری طرف سے۔'' سلمان نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا ہو۔ سارہ خاموش ہو گئی مگر اندر ہی اندر کچھ جوڑ توڑ کر رہی تھی۔ بہت کچھ تھا جو اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔

☆☆☆

کاسنی، دھانی اور سبز رنگوں کے امتزاج کا جوڑا پہنے سارہ نے جیولری سیٹ نکالا اور پہننے لگی۔ قیمتی پتھروں اور گولڈ سے بنا یہ نیکلس اور اس کے ساتھ کے بندے، انگوٹھی کا یہ سیٹ تائی امی نے اسے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ سیٹ جتنا قیمتی تھا اتنا ہی خوب صورت بھی تھا۔ آج چھوٹے بھائی کی منگنی تھی۔ جہاں جانے کے لیے وہ تیار ہو رہی تھی۔

سلمان کے ہمراہ ہال میں پہنچی تو سب کی ستائشی نظریں اور کلمات نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی۔ شادی کے دو ماہ گزرنے کے بعد بھی تائی امی نے اسے شروع کی طرح بڑے لاڈ پیار اور گھریلو ذمے داریوں سے آزاد رکھا ہوا تھا۔ اور سلمان کی تو بات ہی کیا تھی اس نے تو سارہ کو ہتھیلی کا

پھلا بنایا ہوا تھا۔
سارہ کھلا ہوا گلاب بنی، بہنوں اور کزنز کے گروپ میں چہک رہی تھی۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اس کی خوش نصیبی میں کوئی دو رائے نہیں، مگر ماہم کی رائے ذرا سی مختلف تھی۔
"سارہ اس لیے لکی نہیں کہ اس کا شوہر بہت اچھا ہے بلکہ اس لیے لکی ہے کہ اس کی ساس بہت اچھی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر ساسیں وہ ہیں جو بہو کی جان عذاب کر دیں۔ بہو پہ جان چھڑکنے والی ساسیں گنتی کی ہوں گی اور سلمان بھائی کی امی ان میں سے ایک ہیں۔"
"وہ تو شروع سے ہی سارہ پہ صدقے واری تھیں۔ بیٹا الگ قربان۔" عائلہ نے ٹکڑا جوڑا۔
"سچ بتاؤ، کون سے وظیفے کیے تھے تم نے۔"
"میں نے کچھ نہیں کیا بے وقوف۔" سارہ کی ہنسی قل قل کرتی آس پاس پھیل گئی۔
"محبتیں بھی نصیب سے ملتی ہیں۔ تمہاری قسمت میں اللہ نے بہت چاہتیں اور عنایتیں رکھی ہیں۔"
"اللہ کا کرم ہے۔ میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔" سارہ کے لہجے میں عاجزی اور انکساری تھی۔ جو مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی تھی۔

☆☆☆

بدلتے موسم کے ساتھ گرمی، تپش اور حدت دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھیں، ہوا ذرا ذرا خنک ہو چلی تھی۔ سارہ لان میں تھی جہاں پیڑ، پھول پودے، گھاس سب کی ترنگ اور شگفتگی پہ اک ذرا خاموشی سی چھانے لگی تھی۔ جیسے بہت سے شریر بچے کھیلنے اچھلنے کودنے کے بعد بہت تھک کر چپ چاپ ایک طرف کو بیٹھ جائیں۔
سارہ نے ایک طائرانہ نگاہ سارے ماحول پہ ڈالی یہ کافی بڑا اور خوب صورت لان تھا۔ اس کے شمالی جانب ایک دیوار تھی جو بہت اونچی کر دی گئی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے وہ مختصر سا پورشن تھا جہاں گل بھابھی اور ان کے چار بچے نامساعد حالات میں روز و شب کی اذیت جھیل رہے تھے۔
بھابھی نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو بھی اتنی تکلیف میں کیوں ڈالا ہوا ہے؟ سارہ نے ان سے یہ سوال کیا تھا۔ تائی امی کی انتہائی سختی اور سرزنش کے باوجود بھی وہ خود کو وہاں جانے سے نہ روک پائی تھی۔ کبھی کبھی موقع غنیمت جان کر وہ گل بھابھی کے پاس پہنچ ہی جاتی تھی۔ اس نے گل بھابھی سے سوال کیا اور سلمان کی پیش کش کے متعلق بتایا تو ایک تلخ مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔
"میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"
"آپ اور بچے اتنی مشکل اور مصیبت میں یہاں رہتے ہیں۔ تائی امی کا آپ کو معلوم ہی ہے وہ آپ کے لیے نئی نئی مشکلات کھڑی کرتی رہتی ہیں برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ آپ ان سے ضد لگا کر نہ بیٹھیں بچوں کا تو سوچیں۔"
سارہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر گل بھابھی اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح ڈٹی ہوئی تھیں۔
"سارہ، میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔
"اپنا گھر؟" سارہ ہمیشہ کی طرح الجھ گئی۔ گل بھابھی کچھ کہتی تھیں، تائی امی اور ان کی پوری فیملی کا موقف الگ تھا بلکہ دعویٰ تھا جو مختلف تھا اور خاندان بھر میں تائی امی کی ہی تائید اور حمایت تھی۔
سارہ واپس نیچے آ گئی۔ کیونکہ وہ نہ تو زیادہ دیر وہاں بیٹھ سکتی تھی اور نہ ہی گھنٹوں ان کے ساتھ بحث کر سکتی تھی۔ محدود وقت گنے چنے لمحات میں جو ہو سکتا وہ کر دیتی جو بن پڑتا وہ کہہ دیتی اور ان کی سن لیتی اور فافٹ نیچے آ جاتی۔ یوں بھی وہ ٹھیک طرح سے نہ گل بھابھی کی بات سن سکی اور سمجھ سکی نہ ہی اپنی بات انہیں سمجھا سکی۔
لان میں بیٹھے بیٹھے کتنی دیر وہ اپنے خیالوں میں گم رہی۔ یہاں تک کہ ملازمہ بلانے آ گئی۔ تائی امی اسے بلا رہی تھیں۔

"جی امی۔" سارہ ان کے پاس چلی آئی۔

تائی امی بیڈ پہ بڑے ٹھسے سے گاؤ تکیہ لگائے بیٹھی تھیں۔ جو کہ ان کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ بہت گوری چٹی، فربہی مائل خاتون تھیں۔ براؤن آنکھوں اور مہندی لگے سرخ بالوں کے ساتھ ان کی شخصیت میں رعب کے ساتھ کچھ اور بھی تھا جو کسی کو بھی بآسانی ان کے قریب نہیں آنے دیتا تھا، ان سے بے تکلف نہیں ہونے دیتا تھا چاہے کوئی شناسا ہو یا غیر شناسا، ایک فاصلہ اور ایک غیر محسوس سا تکلف حائل رہتا تھا۔ چند ہی خوش نصیب تھے جو ان کے قریب تھے۔ سارہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ جو ان کے قریب بھی تھی اور انہیں عزیز بھی تھی۔

"ڈھلتی شام میں پیڑ پودوں کے قریب نہ بیٹھا کرو۔ احتیاط کرو دن قریب ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہ ہو اللہ پاک خیریت کے ساتھ فارغ کرے تمہیں۔" ان کے انداز میں لہجے کی مخصوص سختی کے ساتھ ساتھ ایک نرمی اور ملائمت بھی تھی جو سارہ کے لیے مخصوص تھی۔

"جی۔" اپنے بے ڈول سراپے کو سنبھالتے ہوئے وہ دوسرے تکیے پہ نیم دراز ہوگئی۔

"فریش جوس لے آؤ۔" تائی امی نے ملازمہ کو حکم دیا۔

"تم یہیں آرام کرو جب تک سلمان نہیں آجاتا۔ تنہائی میں زیادہ نہ رہا کرو۔ شیطانی اور ناپاک وجود، کب کہاں ہوتے ہیں ہمیں کیا معلوم۔ اکیلے دیکھ کر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔"

"جی۔" سارہ کو عجیب سی تھکن تھی جوان دنوں میں اور اس حالت میں ہو جاتی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آنے والے دنوں کو سوچ رہی تھی ڈاکٹر نے یکم نومبر کی تاریخ دی تھی۔ آج یکم اکتوبر تھی پورا ایک ماہ باقی تھا۔

"آٹھ ماہ گزر گئے، یہ ایک ماہ بھی گزر ہی جائے گا۔" طمانیت کی سانس لیتے ہوئے اس نے سوچا۔

ملازمہ جوس لے آئی تھی۔ سارہ اٹھ بیٹھی اور

گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ یوں تو پہلے ہی سے وہ اس گھر میں ایک شہزادی کی مانند رہ رہی تھی مگر جب سے خوش خبری ملی، سلمان اور تائی امی دونوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا۔

"اللہ اس خوش نصیبی کو سلامت رکھے۔" دن میں کتنی بار وہ یہی دعا کرتی تھی۔

☆☆☆

سات اکتوبر دو ہزار تیئس دنیا بھر کے میڈیا پر ایک ہی خبر تھی۔ حماس کا اسرائیل پر حملہ۔

میزائل، پیراشوٹس، موٹر سائیکلیں اور شوق شہادت لیے جذبہ جہاد سے سرشار جانباز، یہ تھے ہتھیار جو اپنے سے کئی گنا طاقت رکھنے والی ظالم اور قابض حکومت کے خلاف استعمال ہوئے تھے۔

پاکستان سمیت دنیا بھر کے خصوصاً مغربی میڈیا میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ تجزیہ نگار اور یوٹیوبز مائیک لے کر بیٹھ گئے۔ سارہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت سب سے پہلے تو گوگل سمیت کئی پلیٹ فارمز پہ سرچنگ کی، فلسطین کے مسئلے پہ عمومی معلومات تو تھیں مگر اس وقت کی صورت حال کے حوالے سے بہت سی انفارمیشن چاہیے تھی۔

غزہ پٹی کا نام کئی بار سنا اور پڑھا تھا مگر آج پہلی بار علم ہوا کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی اوپن ایئر جیل ہے۔ جہاں قریباً بائیس سے چوبیس لاکھ جیتے جاگتے نفوس غاصب اسرائیل کے قیدی ہیں۔ بحیرہ روم کے کنارے ایک تنگ سا ساحلی پٹی جس کا شمار دنیا کے سب سے گنجان آباد علاقے میں ہوتا ہے۔ سنہ دو ہزار چھ کے الیکشن میں یہاں سے حماس کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ فلسطین کے دوسرے حصے میں محمود عباس کی حکومت ہے۔

حماس کی عسکری جدوجہد اسرائیل کے خلاف، اس لیے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ مذاکرات کی لالی پاپ کے بعد بھی اسرائیل کا رویہ فلسطینیوں کے ساتھ بد سے بدترین ہوتا گیا اپنی ہی

سرزمین پر اجنبی، اپنے ہی گھر میں ظلم وستم کا شکار اپنے حق کا مطالبہ کرنا گناہ، مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا جرم، مسجد کی بے حرمتی پہ احتجاج بھی گوارا نہیں، تعلیم، صحت، روزگار، مذہب، ہر شعبے، ہر معاملے میں قدغن، بالکل ہی دیوار سے لگا دیا گیا۔

پھر کیا راستہ ہے ان کے پاس۔

مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی مرضی کی موت منتخب کی جائے۔

☆☆☆

زندگی کی سب سے مشکل مگر خوب صورت جنگ سے فتح یاب ہو کر وہ نڈھال اسپتال کے بیڈ پر لیٹی تھی۔ چہرے پہ نقاہت اور تکلیف کے آثار اس مسکراہٹ اور خوشی کے پیچھے چھپ گئے تھے جو ماں بن کر سارہ کے چہرے پہ آئی تھی۔ بیٹے کی پیدائش پر میکے، سسرال سب جگہ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خصوصاً بچے کے باپ اور دادی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

وہ گھر آئی تو گھر میں جشن کا سماں تھا۔ ایک ایک کونا سجا ہوا تھا۔ ایک ایک گوشہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ پھولوں، غباروں اور روشنیوں نے سارہ اور نئے مہمان کا استقبال کیا۔

ساتویں روز بے حد دھوم دھام سے عقیقہ ہوا۔ خاندان اور محلے سمیت دوست احباب، عزیز و اقارب سب جگہ مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اپنی خوشیوں میں وہ اتنی مگن تھی کہ کہیں اور توجہ اور دھیان تھا ہی نہیں۔ بس اپ ڈیٹس دیکھ لیں کوئی کمنٹ کر دیا۔

غزہ سے دل خراش خبریں اور دل دہلا دینے والی تصاویر، سوشل میڈیا پر پوسٹ ہو رہی تھیں۔ سارہ دیکھتی اور دوسرے دیکھنے والوں کی طرح اس کا بھی دل کڑھتا، دکھ ہوتا پوسٹ لگاتی شیئر کرتی۔ افسوس کا اظہار کرتی اور پھر سے اپنی دنیا اور خوشیوں میں مگن ہو جاتی۔ مگر نہیں ہفتہ دس دن گزر گئے تھے وہ مگن ہونے کی کوشش کرتی مگر کوئی نہ کوئی شے اندر ہی اندر چبھتی رہتی، بچے کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مگن۔ اس کی معصوم قلقاریوں پہ تو وہ فدا ہی تھی مگر اپنے بچے کا رونا بھی اسے بہت ہی پیارا لگتا تھا۔

''بہت ہی انوکھی ہو۔'' سلمان اس کی باتیں سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

''میرے بیٹے کا رونا کتنا حسین ہے۔'' بیوی کی تھکیں اتارا تار کر وہ ہنستا تو سارہ خفا ہو جاتی۔

''تمہیں اپنے بیٹے سے محبت نہیں ہے۔'' وہ بگڑ کر فوراً فتویٰ صادر کر دیتی۔

''بالکل محبت ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اس کے رونے پہ بھی قربان ہوتا رہوں۔''

''اچھا بس، مائیں ایسے ہی ہوتی ہیں۔''

''باپ بے چارے بھی اتنے برے نہیں ہوتے میڈم اور شوہر تو بہت ہی مسکین ہوتے ہیں بلکہ معصوم۔''

''جی ہاں، معصومیت تو چھلک چھلک کر باہر آ رہی ہے۔ دکھ رہی ہے مجھے۔'' سارہ کی ٹیڑھی آنکھوں سے وہ فوراً سیدھا ہو جاتا۔

☆☆☆

سوکھے، آوارہ پتے ہوا کے سنگی بیلی بنے، اس کی ہمراہی میں ادھر ادھر سیر کر رہے تھے۔ ہوا بے چاری بھی اداس تھی، خشک چرمرائے زرد پتے۔ دلوں کو غمگین کر دینے والی رہن چاروں طرف بکھیر رہے تھے اور ان اداس دھنوں میں بہت سی چیخیں گونج رہی تھیں۔ ان گنت نوحے، لاتعداد بین آنسو، آہ وزاری ان اداس ہواؤں میں شامل تھے۔

''طوفان الاقصیٰ'' کی اچانک آمد اور غیر متوقع تباہی نے اسرائیل کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس کا مشہور زمانہ دفاعی نظام ''آئرن ڈوم'' اس آندھی کے آگے ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ طوفان الاقصیٰ اپنے پیچھے اسرائیل کے لیے ہزیمت اور ناکامی کی داستان چھوڑ گیا۔

عیار اور بزدل قابض نے غزہ کے معصوم نہتے عوام پہ بارود برسانا شروع کر دیا۔ ان پر حماس کی حمایت کا الزام تھا۔ اپنی جھلاہٹ اور خفت مٹانے کے لیے وہ غزہ پر پل پڑا۔

رہائشی عمارتیں، مساجد، اسکول، اسپتال، بیکریاں، دکانیں سب کچھ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس ملبے تلے جیتے جاگتے انسان دفن ہو رہے تھے۔ اسپتال زخمیوں سے بھر رہے تھے۔ شہداء کی اجتماعی قبریں بنائی جا رہی تھیں۔ انفرادی قبروں کی جگہ نہیں تھی۔ شہداء میں اور زخمیوں میں ایک واضح اور بڑی تعداد بچوں اور خواتین کی تھی۔

اس جنگ کے دوران مغرب کا ایک نیا چہرہ سامنے آیا۔ انتہائی متعصب اور غیر منصفانہ تمام دنیا کو انسانی حقوق پر لیکچر دینے والے مہذب ممالک جنہوں نے، جانوروں کے حقوق اور تحفظ کے لیے بھی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بینائی رہی نہ سینے میں دل۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی سب ببانگ دہل غاصب قابض اور ظالم قاتل کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ جس نے غزہ کو بجلی، پانی، گیس، ایندھن ہر شے سے محروم کیا ہوا تھا وہاں قیامت کا سماں تھا۔ فلسطینیوں کی نسل کشی کی جا رہی تھی۔

مغرب کے علاوہ دنیا میں ایک طاقت اور بھی تھی جسے مسلم امہ کہا جاتا ہے۔ اس میں عرب ممالک بھی شامل ہیں اور غیر عرب ممالک سوائے ایک دو ممالک کے، باقی سب نے مذمت کے الفاظ سے ہی اپنے فرائض ادا کر دیے۔ عرب لیگ، او آئی سی سب کے اجلاس ہمیشہ کی طرح روایتی بے حسی اور بے بسی کے شاہکار تھے۔ اسرائیل کے خلاف مذمتی قرار دادیں پاس ہو گئیں۔ اٹھاون ممالک نے عالمی برادری سے مداخلت اور نومور کی اپیل کی (اور اس سے بڑا لطیفہ شاید ہی کوئی ہو کہ اٹھاون ممالک مل کر بھی خود ایک برادری نہیں ہو سکے) اختتام ان اجلاسوں کا وہی تھا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ نشستن، گفتن، برخاستن۔

اسکرین پہ ایک ایک کر کے حروف روشن ہوتے چلے گئے۔ کام مکمل کر کے سارہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ وہ آزردہ تھی۔

زندگی میں خوشیوں کی کمی نہ تھی۔ آس پاس مہربان چہرے، جان چھڑکنے والے رشتے، زندگی کو مزید مکمل اور خوب صورت بنانے کے لیے اولاد کی نعمت بھی تھی۔ وہ شکر گزار بندی تھی۔ ہر نعمت، ہر مسرت کے لیے شکر ادا کرتے اس کی زبان تھکتی نہ تھی۔ مگر ایک پرسکون اور خوش و خرم زندگی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بے حس تھی۔ بس اپنی خوشیوں میں مگن، باقی سب سے لاپرواہ، وہ ایسی نہیں تھی۔ سارہ کا دل بڑا احساس، بڑا ہمدرد تھا۔

وہ کل بھابھی کا حال دیکھتی تو بہت دکھ ہوتا تھا۔ ان کے حالات کا مکمل سدھار تو سارہ کے بس میں نہیں تھا، مگر پھر بھی ساس اور شوہر سے چھپ کر ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ گھڑی دو گھڑی ان کے پاس بیٹھ کر ان کی دل جوئی کرنے اور ہمت بندھانے کے جتن بھی کر لیتی۔ اور یہ تو اس کے قریب کے لوگ اور آس پاس کی صورت حال تھی۔ فلسطین اور غزہ یہاں سے ہزاروں میل دور تھا۔ روزانہ وہاں کی خبریں اور تصاویر دیکھ دیکھ کر وہ انتہائی کرب اور صدمے کی کیفیت میں تھی۔

کوئی کچھ کیوں نہیں کر رہا؟ کیا کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا؟ اس ظلم اور درندگی کے خلاف؟ کہاں ہیں مسلمان، کہاں ہے مسلم امہ، کہاں ہیں دنیا کے منصف؟ امن و سلامتی کے ٹھیکے دار انسانی حقوق کے چمپئن اور علم بردار، حقوق انسانی کی حفاظت کے رکھوالے، سب کیا کر رہے ہیں۔ دنیا کے نقشے پہ کھجور کی گٹھلی برابر ملک، تمام دنیا پر حاوی ہے، تمام عالمی ادارے اور قوانین اس کے جوتے کی نوک پر، حمایتی تو ظاہر ہے کہ ایک طرف مخالفین بھی زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ رہے۔ دنیا کا اخلاقیات کا معاشرت کا کوئی قانون ایسا ہے جو اسرائیل پہ لاگو ہوتا ہو؟

سارہ کے پاس بہت سے سوالات تھے۔ کچھ وہ جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے اور کچھ اس کے فالوورز بھی بھیجتے تھے۔ ان سوالات کے جوابات ہر ایک کے پاس تھے بھی اور نہیں بھی۔

☆☆☆

زرد پتوں کا فرش درختوں تلے بچھا ہوا تھا سوکھے پتے قدموں تلے چرمراتے، ایک آہ بھرتے اور خاموش ہو جاتے۔ ایسے ہی زرد خشک پتے اس بنگلے کے لان میں بھی درختوں کے نیچے بکھرے پڑے تھے۔ ان ٹنڈ منڈ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سارہ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ ننھا عمر اس کی گود میں تھا۔ اس کی مالش کر کے نہلایا جا چکا تھا اور اب دودھ پی کر سو رہا تھا۔

سارہ نے اس کے سوتے ہوئے چہرے پہ پیار کیا وہ ذرا کسمسایا۔ سارہ نے فوراً تھپکنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں اسے حوریہ کی آواز آئی۔

"سارہ آپی؟" حوریہ کی آواز میں تحیر کے ساتھ دبا دبا جوش بھی تھا۔ پتا نہیں وہ کب اس چھوٹے سے دروازے سے اندر آ گئی جو اکثر بند ہی رہتا تھا۔ اس کے پیچھے گل بھابھی کے پورشن کی سیڑھیاں تھیں۔ وہیں سے اندر باہر آنا جانا ہوتا تھا۔

"یہ آپ کا بے بی کتنا پیارا ہے۔" اشتیاق کے گہرے رنگ آنکھوں میں سجائے وہ ننھے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

"حوریہ فاسٹ آؤ۔" کچھ فاصلے پر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی گل بھابھی پریشانی کے عالم میں حوریہ کو بلا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پہ پریشانی کے آثار تھے اور حقیقت یہ بھی کہ حوریہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر، سارہ کے بھی اوسان خطاء ہو گئے تھے۔ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں وہ حوریہ کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی مما بلا رہی ہیں حوریہ، ابھی آپ جاؤ پھر بعد میں مما کے ساتھ آنا۔"

"نہیں مما نہیں لاتیں مجھے پتا ہے۔" حوریہ نے اپنا خوش نما سر ہلایا۔ اس کی پونی پنڈولم کی طرح دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔

"میں کہوں گی وہ بعد میں لے کر آئیں گی آپ کو، ابھی آپ مما کے ساتھ جائیں۔" سارہ کا اضطراب ہر گزرتے لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر تائی امی باہر آ جاتیں تو قیامت آ جاتی اور چند لمحوں کی بات تھی۔ قیامت آ ہی گئی۔

تائی امی باہر آئیں اور ایک نظر میں انہوں نے دور کھڑی گل بھابھی کو دیکھا جو حوریہ کو بلا رہی تھیں۔

تائی امی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ سارہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی، ان کی نگاہوں میں ایسی نفرت اور حقارت تھی کہ سارہ بھی گھبرا گئی۔

"حوریہ آپ جاؤ، آپ کی مما بلا رہی ہیں۔ وہ بمشکل بولی تھی۔ مگر اس کے بولتے بولتے تائی امی نے حوریہ کا بازو پکڑ کر اسے بے حد زور سے دور پھینکا تھا۔

حوریہ کے منہ سے بے ساختہ بہت بلند چیخ نکلی تھی۔ گل بھابھی دوڑ کر اپنی بیٹی کی طرف آئیں۔

"خبردار جو میری بچی کو ہاتھ لگایا۔" انہوں نے تڑپ کر حوریہ کو اٹھایا اور تائی امی کو وارن کیا۔

"اری جا اپنے شوہر کو کھانے والی ڈائن۔ اگر یہ سنپولیے مجھے دوبارہ اپنے گھر میں نظر آئے تو جان لے لوں گی۔" تائی امی غیض و غضب کا شکار اپنے آپے میں نہیں تھیں۔

گل بھابھی کے لبوں پہ ایک زہر خند مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میرا گھر؟" انہوں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"یہ میرا گھر ہے۔ میرے باپ کا گھر تھا۔ ان کے بعد میرا اور میرے بعد میری اولاد کا۔ تمہارے قبضہ جما لینے سے نہ یہ تمہارا ہو گا نہ تمہاری اولاد کا۔" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے تائی امی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"میں پہلے تھی کمزور، اب نہیں ہوں۔ اپنا حق لے کر رہوں گی۔ بہت جلد پتا چل جائے گا تمہیں۔" گل بھابھی نے روتی بلکتی حوریہ کو گود میں اٹھایا اور وہاں سے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

"تیری یہ مجال۔" تائی اماں ساری اخلاقیات،

پڑیں اور آن کی آن میں ان کے بال نوچ کھسوٹ کر انہیں نیچے گرادیا۔

سارہ نے بوکھلا کر انہیں روکا مگر وہ تو اپنے آپے میں نہیں تھیں، وہ بے دریغ گل بھابھی کو مار رہی تھیں۔ شور شرابا سن کر ملازمہ بھی آ گئی تھی۔ مگر فقط کھڑی ہو کر تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کی جرات نہیں تھی کہ وہ بڑی بیگم صاحبہ کے معاملے میں مداخلت کرتی وہ تو خیر ہوئی کہ سلمان گھر آ گیا تھا۔ اور اندر داخل ہوتے ہی لان میں موجود منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ مگر پھر جیسے تیسے اس نے ہی ماں کو قابو کیا اور انہیں اندر لے گیا۔

گل بھابھی کا برا حال تھا۔ ان کی چادر اتر گئی تھی۔ بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ کر خون رس رہا تھا۔ حور یہ الگ بلک بلک کر ہلکان ہوگئی تھی۔ سارہ نے ملازمہ کی مدد سے بمشکل گل بھابھی کو اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔ مگر وہ بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات فیصلہ کن تھے۔ بیٹی کو گود میں اٹھا کر وہ لنگڑاتی ہوئی چل پڑیں۔

سارہ حواس باختہ سی انہیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ مگر ان سے کچھ کہنے کی یا روکنے کی جرات نہ ہوئی۔ تائی امی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور جس پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا، ان کا اتنا غصہ اور جارحانہ بہیمانہ رویہ، سارہ کے تصور سے بھی باہر تھا۔ پھر گھر کی ملکیت کا دعویٰ؟

تائی امی بیانگ دہل اسے اپنا گھر قرار دیتی تھیں اور گل بھابھی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتی تھیں۔ سارہ کو نہ تو ٹھیک سے علم تھا نہ ہی سمجھ آتی تھی کہ کون صحیح ہے، کون غلط؟ اور سچ تو یہ تھا کہ اس نے یہ حقیقت کبھی سنجیدگی سے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ سچ کیا ہے؟ اس کے خیال میں تائی امی اتنی معتبر ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی عزت و احترام ہے جہاں جاتی ہیں ان کی آؤ بھگت کی جاتی ہے، ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اس قدر و منزلت کو دیکھ کر وہ کیا کوئی بھی نہیں سوچ لے رہی ہیں۔

سارہ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی جب سلمان تیزی سے کمرے میں داخل ہوا، اس کے چہرے پہ کچھ گھبراہٹ تھی اور کچھ پریشانی۔

"اللہ خیر کیا ہوا؟" سارہ ہڑبڑا گئی۔

"سارہ! میری بات غور سے سنو، گل بھابھی پولیس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ لوگ تم سے کچھ پوچھیں تو صاف انکار کر دینا۔ عابدہ (ملازمہ) کو بھی میں نے سمجھا دیا ہے۔ امی کا نام کسی طور اس معاملے میں نہیں آنا چاہیے ٹھیک ہے۔" تیزی سے بولتا ہوا سلمان بات مکمل کر کے فوراً ہی واپس پلٹا۔

"مگر..... سلمان۔" سارہ بے یقینی سے اس کے پیچھے لپکی۔

"میں جھوٹ کیسے بولوں؟"

"مختصر سی بات کرنی ہے یار، کہہ دینا، میں سو رہی تھی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" سلمان عجلت میں تھا۔

"مگر....."

"بچی مت بنو سارہ، اپنے گھر اور فیملی کو سپورٹ کرنا، پروٹیکٹ کرنا، ہم دونوں کا فرض ہے۔" سلمان جس تیزی کے ساتھ آیا تھا اسی پھرتی کے ساتھ نکل گیا۔

بہت کوشش کی سارہ نے کہ اپنے چہرے کے تاثرات نارمل رکھے مگر یہ سب اس سے نہیں ہو رہا تھا۔ جب تفتیشی افسر کے سامنے اس نے اس سارے قضیے اور واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا تو باوجود کوشش کے، اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور چہرہ فق ہو گیا۔ گل بھابھی کی طرف تو اس سے دیکھا ہی نہیں گیا جن کے چہرے پہ حیرت اور آنکھوں میں ملامت تھی۔ شاید کم از کم سارہ سے انہیں یہ امید نہیں تھی۔ ملازمہ نے تو حق نمک ادا کیا تھا اور سارہ نے اپنا فرض جو بحیثیت ایک بیوی، ایک بہو اس پر عائد تھا یا نہیں مگر اسے بتایا یہی گیا تھا۔

تو اس طرح کے ہوتے ہیں حالات جب

ضمیر کی آواز دبانی پڑتی ہے۔ سچ کو ایک طرف رکھنا پڑ جاتا ہے۔ مصلحت کے نام پر دروغ گوئی سے کام لینا ہوتا ہے۔ سارہ کا ضمیر ملامت کر رہا تھا اسے، حوریہ کی کلائی میں فریکچر ہو گیا تھا، اس ننھی سی بچی کے لیے (جو اسے بہت پیاری اور عزیز بھی) وہ سچائی بیان نہیں کر سکی اور اب کمرے میں بیٹھی کڑھ رہی تھی۔ افسوس ندامت، شرمندگی، بے بسی اور جھنجھلاہٹ، سارے کے سارے مل کر ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔ خیالات کا ایک ریلا تھا جو اسے روندتا ہوا گزر رہا تھا۔

سچ اور حق کے لیے آواز بلند کرنا، ظلم کے خلاف اٹھنا، مظلوم کی مدد کرنا، اپنے مفادات پس پشت ڈالنا اور ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا، کتنے عظیم افکار، اعلیٰ خیالات اور عمدہ اخلاقی اقدار ہیں یہ سب مگر صرف لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سوچنے کی حد تک جب کوئی عملی قدم اٹھانے کا وقت آتا ہے تو مصلحت یا خوف کی نادیدہ زنجیریں، انسان کو آگے بڑھنے سے روک لیتی ہیں۔ تو سارہ سلمان یہ ہے اصل اور بدصورت حقیقت۔

سارہ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ہمیں مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں سے بڑے گلے ہیں وہ مفاد پرست، خود غرض، مصلحت پسند، بڑی طاقتوں کے حاشیہ بردار، زبانی جمع خرچ میں ماہر، عملی اقدامات صفر، غزہ کے کنارے کھڑے تماش بین۔

سب کچھ درست ہے سب صحیح ہے۔

مگر اپنا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ہمارے آس پاس کسی نہ کسی شکل میں، کسی کے بھی ساتھ ظلم و زیادتی ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کے خلاف آواز اور عملی قدم اٹھانا تو دور کی بات، ہم کبھی کبھار نوٹس بھی نہیں لیتے، کوئی چاہے بھی تو اسی طرح مجبور ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آج سارہ کے ساتھ ہوا۔

ایک فرد ہو یا پوری ایک قوم ظلم اور ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے اس کا مضبوط ہونا اور بے غرض ہونا ضروری ہے۔ اپنے فائدے، نقصان سے بے نیاز۔

آج کی دنیا خود کو کتنا ہی مہذب خیال کرے اور کتنا ہی ترقی یافتہ سمجھے، اس دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ یہاں فرد ہو یا قوم اسے اپنی لڑائی خود ہی لڑنی ہے۔

اور ایک لڑائی وہ تھی جو سارہ کو لڑنا تھی سلمان سے۔ وہ خوب جم کر لڑی اور اپنی ساری بھڑاس نکال لی۔

"اتنا کیوں بھڑک رہی ہو؟" سلمان یوں پر سکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور ویسے بھی اس نے اپنی ماں کو بچایا تھا۔ ایک بیٹے کا فرض ادا کر کے وہ مسرور اور مطمئن تھا۔ بیوی کے مزاج اور جذبات سے آشنا تھا اس لیے سارہ کی لمبی چوڑی تقریر کو اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ مگر سارہ کے لیے یہ معمولی بات نہیں تھی۔ جن اعلیٰ اخلاقی اقدار پر وہ فخر کرتی تھی کہ اپنے تئیں انہیں اپنا چکی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے، مگر آزمائش کی اس گھڑی میں اسے علم ہوا کہ وہ کتنی کمزور ہے۔ زبان اور قلم سے حق کا پرچار کرنا آسان ہے۔ حقیقت میں اسے اپنی ذات پہ، اپنی زندگی پہ نافذ کرنا کتنا کٹھن اور مشکل ہے۔ سارہ کو خوب اندازہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"حقیقت کیا ہے ابو جی مجھے سچ سچ بتائیں۔"

سارہ کا سوال سن کر ابو سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی پیشانی پر چند لکیریں پڑ گئیں۔

"گل کے والد اور بھابھی جان (تائی امی) کے درمیان مکان خریدنے کی بات ہوئی تھی مگر اس کے بعد حقیقت میں کیا ہوا۔ اس پر دونوں کے دعوے الگ الگ ہیں۔ بھابھی کا کہنا ہے کہ انہوں نے فل پیمنٹ کر کے گھر خرید لیا تھا۔ جب کہ گل کا کہنا کچھ اور ہے۔

"گل بھابھی کا کہنا ہے کہ ان کے والد نے ڈیل ختم کر دی تھی اور تائی امی سے کوئی رقم نہیں لی

پذیر تھیں۔ ان کے والد کے اچانک انتقال کے بعد انہوں نے پورے گھر پہ قبضہ کرلیا۔ گل بھابھی کو اوپر کے پورشن تک محدود کر دیا جسے پورشن کہنا بھی بس تکلف ہی ہے۔'' سارہ نے والد کی بات کو مزید آگے بڑھایا۔

''شاید، ایسا ہوا ہو۔'' ابو نے آہستہ سے کہا۔ وہ متذبذب تھے۔

''عدالت سے نوٹس آیا ہے۔ گل بھابھی نے مکان کی ملکیت کا دعویٰ کر کے تائی امی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔'' سارہ نے اب تھیلے سے بلی باہر نکالی تھی۔

''گل نے؟'' ابو کے ساتھ ساتھ امی نے بھی بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔

''جی، مقدمہ بازی کے لیے بہت رقم، اتنی ہی فرصت اور وقت چاہیے۔ وہ کیسے یہ سب مینیج کرے گی؟ اور تم لوگ تمہارا کیا ہوگا؟ یہ.....'' امی یکدم پریشان ہوا تھیں۔

''احسن چچا نے تائی امی سے ملنا جلنا کیوں ترک کر دیا تھا؟ آج تک ان کے تعلقات کشیدہ ہیں؟ کیوں؟ میں نے ان سے ملاقات کی تھی کل، میں ایک گھنٹے کے لیے گئی تھی اور چار گھنٹے بعد واپس آئی ہوں۔ جو کہانی انہوں نے سنائی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اتنی بڑی زیادتی، اتنا بڑا ظلم اور سب خاموش تماشائی؟'' سارہ کے انکشاف پر امی، ابو دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''تمہیں ان سب معاملات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے شوہر اور ساس کو علم ہو گیا کہ تم احسن سے ملی ہو تو طوفان ہی اٹھا دیں گے۔'' امی نے خود کو سنبھالا اور بیٹی کو تنبیہہ کی۔

''طوفان تو آئے گا امی..... گل بھابھی نے ابتداء کر دی ہے۔'' سارہ نے انہیں دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

پہلے، جب تائی امی نے اپنے پانچ بیٹوں کے ہمراہ ایک گھر کرایہ پر لیا جس کے مالک گل کے والد تھے۔ گل رخ جو سترہ برس کی ایک من موہنی لڑکی تھی اور تائی امی کا پہلوٹی کا بیٹا عفان جو بائیس تیئس برس کا خوبرو نوجوان تھا۔

عمریں کم ہوں اور جذبات زیادہ ہوں تو کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا نہ دکھائی دیتا ہے۔ اپنی عقل کام نہیں کرتی، کسی اور کی عقل پہ بھروسا نہیں ہوتا، گل اور شاہ زیب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کیوپڈ کے تیر نے کام کر دکھایا، دونوں کی آنکھیں انگاری ہو گئیں، ایک دوسرے کے سوا کسی اور کو دیکھنے سے ایک دوسرے کے سوا کسی اور کو قبول کرنے سے۔

تائی امی خوش نہیں، اعتراض کی کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔ گل رخ خوب صورت تھی، امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ با اخلاق اور تمیز دار تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے بیٹے کی پسند تھی، ان کے اندر کی لالچی اور خود غرض عورت کو اس سے اچھا رشتہ کہاں مل سکتا تھا؟

بے شک وہ کرایہ دار تھیں مگر مالی حیثیت میں اتنی کمزور نہ تھیں۔ اسی علاقے میں کوئی مکان خریدنے کی کوشش تھی، پرانے علاقے میں اپنا ذاتی مکان بہت بڑا تھا پھر بازار میں دکانیں تھیں۔ انہیں بیچ کر با آسانی مکان خرید سکتی تھیں۔

گل کے والد نے مخالفت تو نہیں کی مگر متذبذب تھے۔ کاروبار میں ہونے والا خسارہ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ ساری جمع پونجی وہ لگا چکے تھے۔ اب لے دے کے گھر بچا تھا۔ اور اس سے ملحقہ ایک پلاٹ جو سستے زمانوں میں خریدا تھا، اب اس کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اسے بیچ کر کاروبار میں لگا دیں۔ گل کا معاملہ بھی دھیان میں تھا۔ اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ ایسے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔ پرانے خیالات کے وضع دار انسان تھے، خاندان کو ترجیح دیتے تھے دولت کو نہیں، بیٹی کی خوشی

کے لیے یہ رشتہ قبول کرلیا۔

دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ منزل اتنی آسانی سے بھی مل سکتی ہے؟ کسی رکاوٹ کے حائل ہوئے بغیر؟ کسی بھی قسم کے ظالم سماج کے بغیر، دونوں ایک ہونے جارہے تھے۔

تائی امی نے گل کے والد سے پلاٹ کا سودا طے کرلیا تھا۔ شبیر صاحب نے مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم ہی قیمت لگائی۔ مستقبل کے سمدھیانے کا لحاظ بھی تھا اور یہ بھی کہ بیٹی قریب میں رہے گی۔

شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ تائی امی نے انتہائی شان دار اور نفیس بری بنائی تھی۔ گل کا جہیز بھی بہت قیمتی تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک شے، شادی ہوئی تو دونوں کی جوڑی کو دیکھنے والوں نے چاند سورج کی جوڑی قرار دیا۔

محبت ہوئی، شادی بھی ہوگئی وقت کا دریا کسی خواب کی مانند گزر رہا تھا۔ اگلے دس برس بے حد خوب صورتی اور آسائش سے گزارنے کے لیے گل اور شاہ زیب کا دامن چار قیمتی موتیوں اور مہکتے پھولوں سے بھر گئے۔

کیا ہوتا جو زندگی اتنی ہی خوب صورت اور مکمل گزرتی رہتی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایسا ہوتا بھی نہیں ہے کہ چمن زندگی میں ہمیشہ بہار ہی ٹھہری رہے۔ وہ دن جس کے ایک ایک لمحے سے خوشی کشید کی جاتی رہے، وہ دن بھی بہرحال ڈھل جاتا ہے۔

ایک حادثے نے شاہ زیب کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔ تمام گھر والوں کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا مگر گل کی تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ دو سال پہلے والد بھی داغ مفارقت دے گئے تھے۔

خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے جھولتے وہ اچانک ہی نیچے گر پڑی تھی۔ چوٹ بہت گہری تھی۔ محبت کا بچھڑ جانا، جیون ساتھی کا جدا ہوجانا معمولی بات نہیں تھی۔ جذباتی دھچکا اپنی جگہ اور زندگی کے تلخ حقائق اپنی جگہ موجود منہ چڑا رہے تھے۔

شبیر صاحب کا چھوٹا سا بزنس دیمک لگا ہی زمین بوس ہوگیا تھا۔ اپنی بیماری کے آخری عرصے میں اونے پونے فروخت کرکے انہوں نے سارے قرض داروں کا قرض اتارا کہ اللہ کے حضور ہر ایک کے حق سے بری الذمہ ہوکر جائیں۔ ان کی وفات کے بعد گل کے پاس یہ گھر تھا جس میں وہ شوہر کے ساتھ پہلے شفٹ ہوگئی تھی۔ سسرال پڑوس میں ہی تھی۔ تائی امی نے ہی اسے مجبور کیا تھا کہ والد کی بیماری اور تنہائی کے دنوں میں اسے ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔

اب بیوگی کے عالم میں وہ حیران پریشان کھڑی تھی۔ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ بینک بیلنس بہت زیادہ نہیں تھا۔ شوہر کے ساتھ جو زندگی گزاری، ایک ایک دن بھرپور گزارا۔ روپے پیسے کی کبھی پروا نہیں کی۔ حادثے سے کچھ ماہ قبل ہی وہ لوگ شمالی علاقہ جات گھوم پھر کے واپس آئے تھے۔

"کیسے گزرے گی اس طرح زندگی؟" گل نے بے بسی سے سوئے ہوئے بچوں کے معصوم چہرے دیکھے اور اضطراری حالت میں اپنا ناخن کترنے لگی۔ ابھی وہ عدت میں تھی۔ صدمے کی ابتدائی کیفیت بہت مضبوط تھی۔ وہ اکثر بیٹھے بیٹھے رونے لگتی، نہ اسے بھوک لگتی نہ پیاس کا احساس ہوتا۔

تائی امی گل اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اس کے گھر میں تھیں۔ گل کی ذہنی کیفیت وقت کے ساتھ ساتھ خراب ہوتی جارہی تھی۔

عدت ختم ہونے کے بعد بھی وہ سنبھل نہ سکی یا خود کو سنبھال نہ سکی۔ شدید قسم کا ڈپریشن لاحق تھا اسے تائی امی علاج کرواتی تھیں۔ مختلف گولیاں، وہ روزانہ بھانکتی اور ماضی کے اچھے وقت کو یاد کرتے ہوئے مستقبل کے اچھے وقت کی امید کرتی مگر گل کی ذہنی وجسمانی حالت گرتی جارہی تھی۔

ایک برس بھی گزر گیا مگر جیسے گزرا، گل ہی جانتی تھی تائی امی گھر میں وائٹ واش کروارہی تھیں۔ گل کو بچوں سمیت اوپر کے ایک پورشن میں شفٹ کردیا

گیا۔

اس دن کے بعد وہ اگلے دس سال تک اسی پورشن میں رہی۔ نچلے پورشن میں وائٹ واش تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ وہ شفٹنگ کی تیاریاں کر رہی تھی جب تائی اماں گل کے پاس آئیں۔ انہوں نے جو دستاویزات گل کو دکھائیں اس کے مطابق گل کے والد یہ مکان انہیں بیچ چکے تھے۔ ان کی وفات سے چند ماہ قبل یہ سودا ہوا تھا۔

"مگر پاپا نے مجھ سے تو کبھی ذکر نہیں کیا؟" گل کا دماغ پہلے ہی ماؤف رہتا تھا اس وقت تو جیسے بالکل ہی کام نہیں کر رہا تھا۔

"ان کی ہمت نہیں ہوئی تمہیں بتانے کی، قرض میں ڈوبے ہوئے تھے سر سے پاؤں تک، سب کچھ بیچ کر قرض اتارا ہے مرنے سے پہلے، کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے تمہارے لیے۔"

تائی امی نے زہر خند لہجے میں اسے جتایا۔ اور ان کا یہ لہجہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ معمول بنتا جا رہا تھا گل بے یقینی سے ان کا چہرہ تکتی رہی جس پر اچھائی رعونت بے رحمی اور مغروریت کی چھاپ دن بہ دن گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" دل کا یہ سوال تھا یا خود کلامی، اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا اور حقیقت یہ تھی کہ اسے بہت سے معاملات کی سمجھ آ ہی نہیں رہی تھی۔

سانس اور دیواروں کا دن بدن بدلتا رویہ اب ایک واضح منظر بن گیا تھا جسے وہ بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ گل اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئی۔ پچھلے چار سال سے وہ یہ اذیت جھیل رہی تھی اور بچے بھی اس کے ساتھ اس عتاب میں کا شکار تھے۔

دھیرے دھیرے نیچے سے اور نیچے والوں سے رابطہ بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ تائی اماں نے بہت کوشش کی کہ وہ گھر چھوڑ کر ان کے دیے ہوئے فلیٹ میں شفٹ ہو جائے مگر اپنی تمام تر بے کسی اور بے بسی کے باوجود گل یہاں سے نکلنے پر راضی نہیں ہوئی۔

"یہ میرے پاپا کا گھر ہے اس کی ایک ایک اینٹ سے ان کی نشانیاں اور یادیں وابستہ ہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

تائی امی کو اس کمزور سے وجود سے یہ امید نہیں تھی۔ گل سے ان کی بے گانگی اور بے رخی نے نفرت کی شکل اختیار کر لی تھی پتا نہیں کب اور کیسے ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کے بیٹے کی موت کی وجہ گل ہے۔ اس کی نحوست نے شوہر کی جان لے لی۔

یہ خیال ان کے اندر ہی اندر جڑ پکڑ کر اب ایک تناور درخت بن گیا تھا اور یہی بات ایک روز انہوں نے گل کو طعنے کی طرح مار دی۔ جب وہ اس گھر سے نکلنے پر برابر انکار کیے جا رہی تھی۔

"بی بی، تمہارے نصیب میں بیوہ ہونا لکھا تھا۔ کسی اور سے ہو جاتی شادی، میرا بیٹا تو بچ جاتا، کیسا کڑیل جوان، دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میرے کلیجے میں تو جب سے آگ لگی ہوئی ہے۔ تیرے منحوس قدم اس گھر میں رہے تو اور کیا کیا نقصان کریں گے میرا۔ میں تو برداشت نہیں کر سکتی۔ تیری یہ نحوست، نہ تیری اولاد کی۔"

تائی امی کی زبان اب شعلے اگلنے لگی تھی نہ کوئی لحاظ نہ مروت۔

گل کو نہ اپنی آنکھوں پہ یقین آیا نہ سماعتوں پر۔

"یہ آپ کے بیٹے کے بچے ہیں۔ آپ ایسے کیسے....." گل کی آواز بھرا گئی۔ مگر تائی امی کا لب ولہجہ اور الفاظ ان کے دل کی طرح سخت ہو چلے تھے۔

"جب میرا بیٹا ہی نہیں رہا تو اس سے وابستہ رشتے بھی میرے لیے ختم ہو گئے، اب تم سب یہاں سے دور ہو جاؤ تو بہتر ہوگا۔"

گل آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔ بے شک وہ اس گھرانے کا خون نہیں تھی مگر بچوں سے تو خون کا رشتہ تھا۔ سگے رشتوں میں ایسے کیسے خون سفید ہو سکتا ہے؟ اتنی بے مروتی بلکہ نفرت ہو سکتی ہے؟

وہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی مگر نہ تو سمجھ سکی نہ جان سکی، لیکن اس کے خون میں یکایک ہی ایک زبردست ابال آیا تھا۔ وہ اس گھر سے کیوں نکلے جس

کے بارے میں ابھی تک اسے یقین نہیں تھا کہ یہ گھر اب اس کا نہیں رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کے علم میں لائے بغیر اس کے والد اتنا بڑا فیصلہ کر سکتے ہیں؟ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی ساس سچ کہہ رہی ہیں۔ اسے اب کسی پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ نہ اپنوں پر، نہ غیروں پر اور اس لمحے گل کو ادراک ہو گیا تھا کہ اسے اپنی لڑائی اکیلے ہی لڑنی ہے۔ اسے گمان نہیں بلکہ یقین تھا کہ ساس کی نفرت جو عیاں تھی اپنے اندر ایک حرص لالچ اور ہوس سمیٹے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا، کچھ رشتے دار تھے، قریب کے بھی، دور کے بھی مگر پرائے پھڈے میں کودنا کسی نے مناسب نہیں سمجھا، خصوصاً ایسے عالم میں جب کہ غاصب مضبوط سے مضبوط اور طاقت ور سے طاقت ور ہو رہا تھا اور مظلوم کی کسمپرسی، بے بسی اور بے کسی دن رات بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

جب دنیا کے بہت سے ممالک میں یہودیوں پہ زندگی تنگ تھی ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک سرزمین سے دوسری سرزمین وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ انہیں امان ملی، پناہ ملی تو سرزمین فلسطین میں، جہاں وہ بے یار و مددگار آئے تھے۔ برطانیہ نے جو اس دور کی سپر پاور اور ایک عظیم سلطنت تھا۔ یہودیوں کی آبادکاری کے لیے خطہ فلسطین کو منتخب کیا اور ورے دامے، سخنے ہر طرح سے یہودیوں کی مدد کی کہ وہ فلسطین میں اپنے قدم جما لیں۔ خود یہ قوم بھی اسی سرزمین پہ آباد ہونا چاہتی تھی

مسلمانوں کی طرح یہودیوں میں بھی مذہبی فرقے ہیں جن کے خیالات اور عقائد میں اختلافات ہیں۔

ان میں کٹر مذہبی اور انتہا پسند طبقہ صیہونی (زائنیسٹ) کہلاتے ہیں جن کے مذہبی عقاید میں ایک یہودی ریاست کا قیام اور تیسرے ٹیمپل کی تعمیر شامل ہیں، جو مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے بنایا جائے گا اسے ہیکل سلیمانی کہا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑی جنگ (آرمیگاڈون برپا ہوگی۔ اس معرکہ عظیم کے بعد جو کہ خیر و شر کا آخری معرکہ ہوگا۔ مسجد اقصیٰ —— —— شہید کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے گا۔ قربانی کا رواج دوبارہ زندہ ہوگا۔

صیہونی ذہنیت کے لیے یہ ایک مذہبی معاملہ ہے جس کے لیے وہ سرزمین فلسطین پر غاصب جارح اور ظالم قوم بن کر ابھرے۔ اسرائیل کے قیام کے بعد سے ہی فلسطینیوں کی جبری بے دخلی اور قتل عام کا عمل آج تک جاری ہے۔ سرزمین فلسطین کا ایک بڑا حصہ عالمی نقشے میں آج اسرائیل کے نام سے منسوب ہے۔

یہودیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو صیہونیت اور صیہونی عزائم کے خلاف ہے۔ یہی طبقہ اسرائیل کے خلاف احتجاج میں شریک ہے اور فلسطین کی حمایت و آزادی کے نعرے لگا رہا ہے۔ مگر صیہونیت کی جڑیں امریکہ کے ایوان اقتدار کے اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آج سے نہیں بلکہ کئی عشروں سے امریکی اہم عہدوں پر صیہونیت نواز انتہا پسند افراد تعینات رہے۔ آج بھی امریکہ کا وزیر خارجہ انتونی بلنکن ایک کٹر زائنیسٹ یہودی ہے۔ جو برملا اسرائیل کے ہر ظلم و زیادتی کی حمایت کرتا ہے۔

امریکی سیاست میں صیہونی لابی بہت مضبوط اور بہت طاقت ور ہے۔ وہ امریکہ جس کی پالیسیاں دنیا بھر کے کئی ممالک پر اثر انداز ہوتی ہیں اور جو اپنے تئیں عالمی پولیس مین بنا ہوا ہے۔ اس پولیس مین کے ہتھیار اور اختیارات کے استعمال میں صیہونی لابی کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ عالمی سیاست، معیشت اور تجارت میں یہودی کم ہونے کے باوجود طاقت ور ہیں۔

سوال یہ ہے کہ عیسائی حکمران آنکھیں بند کر کے یہودیوں کا ساتھ کیوں دیتے ہیں؟

''اس کا جواب اگلی پوسٹ میں۔'' گل نے کلک کیا اور یہ پوسٹ اپنی فیس بک پر لگا دی۔

دوپہر کی دھوپ ڈھل کر دیواروں پر سے اتر رہی تھی اور کچھ لوگ جو دل سے اتر رہے تھے۔ سارہ حیران بھی تھی بلکہ دنگ رہ گئی تھی اپنی ساس کا ماضی جان کر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

کیا واقعی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں؟ چہروں پہ نقاب لگائے منافق، اندر سے کچھ، باہر سے کچھ۔ اگر چہ یہ کوئی اتنا حیران کن بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح کے کردار ہمارے آس پاس نظر آ ہی جاتے ہیں مگر صدمہ اور حیرانی تب ہوتی ہے جب اس طرح کے لوگ ہمارے بہت ہی قریبی ہوتے ہیں جن کو ہم عزیز رکھتے ہیں۔ معتبر سمجھتے ہیں۔ کوئی گمان تک نہیں ہوتا ان کے بارے میں کہ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ ظلم کیا ہوگا یا زیادتی کی ہوگی۔ جب ان کی اصلیت سامنے آتی ہے، ویسا ہی زوردار دھچکا لگتا ہے جیسے سارہ کو لگا تھا۔

''ابو جی!'' اپنا ناخن چباتے ہوئے اس نے باپ کو مخاطب کیا۔

''یہ سچ ہے کہ تائی امی نے وہ گھر خریدا نہیں تھا۔ اس پر قبضہ کیا تھا۔ پھر حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی آپ میں سے کسی نے ان سے بھی کچھ نہیں کہا؟ گل بھابھی کے لیے کسی نے کچھ نہیں کیا؟''

''کنفرم بھی تو نہیں تھا کہ کون سچ بول رہا ہے؟ دونوں ہی ملکیت کے دعوے کر رہی تھیں، اور ویسے بھی کسی کے معاملات میں بولنا بڑی خواری ہی ہے۔ اکثر اوقات فریقین آپس میں صلح کر لیتے ہیں اور بیچ میں بولنے والے لوگ برے بن جاتے ہیں۔''

ابو کا جواب مدلل اور مفصل تھا۔

سارہ نے ایک نظر باپ کو دیکھا اور قریب بیٹھی ماں کو جو ابو کی ہی ہم خیال تھیں۔ وہ خاموش ہوگئی۔ والدین سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی۔ عام افراد تھے معاشرے کے جیسا کہ یہاں لوگوں کی اکثریت ہے، کچھ کچھ دوغلے، تھوڑے تھوڑے منافق، کسی غلط کو غلط سمجھتے تو ہیں۔ مگر زبان سے اقرار کرنے میں تامل کرتے ہیں اور اس غلط کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانا، تو بہت دور کی بات ہے۔

سارہ نے اٹھ کر اپنے بیٹے کو چینج کیا۔ وہ سو کر اٹھ گیا تھا اسے فیڈ کرا کے وہ سلمان کو کال ملانے لگی۔

گل بھابھی کے لیے کچھ کرنا تھا وہ خود اکیلی شاید بہت زیادہ نہ کر سکتی تھی اس لیے سلمان سے بات کرنا چاہتی تھی اگرچہ اسے معلوم تھا کہ سلمان کی حمایت اپنی امی کے لیے ہی ہے مگر گل کا خیال تھا کہ وہ اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اتنا سمجھدار اور سلجھا ہوا انسان، کیسے ایک غلط کا ساتھ دے سکتا ہے؟ جو ظلم کے خلاف بات کرتا ہو وہ ظالم کا ساتھ کبھی نہیں دے گا، چاہے ظالم سے اس کا رشتہ اور تعلق کتنا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔

گل کی خوش گمانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اسے سلمان کے ردعمل کا اور انکار کا اندازہ تھا مگر یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ اس کی خوش گمانیوں کا شیرازہ بالکل ہی بکھر کر دب جائے گا۔

سائیڈ ٹیبل پہ گلدان میں تازہ پھول سجے ہوئے تھے۔ کمرہ میں ایئر فریشنر کے ساتھ ساتھ موتیے کی خوشبو سے بھی مہک رہا تھا۔ سارہ نے اپنے خوش رنگ دوپٹے کا پلو پیچھے کی طرف ڈالا۔ کانوں میں جھمکا بالی مل کر اس کے گال سے ٹکرائی۔

''اس رنگ میں تم بہت حسین لگتی ہو۔'' سلمان نے کان میں پڑی بالیوں کو دھیرے سے چھوا۔

''ویسے نہیں لگتی؟''

''ہر رنگ میں قاتل لگتی ہو یار!'' سلمان مسکرایا۔

''میں نے کسی کی جان تو نہیں لی۔''

''لے لو میری جان، تمہیں سب معاف ہے۔'' سلمان کا لہجہ مخمور ہوا۔

''اونہوں، کسی کو کچھ معاف نہیں ہوتا۔ ہر ایک کی گرفت ہوتی ہے، ہر ایک کی پکڑ ہوتی ہے، زیادتی کرنے والوں کی بھی اور ان کی حمایت کرنے والوں کی بھی۔'' سارہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سلمان کی مسکراہٹ دھیمی پڑ

ہی۔ اور جب تک گل سارہ کی بات ختم ہوئی تو اس کی مسکراہٹ پھیکی اور دھیمی ہوتے ہوئے غائب ہی ہو گئی تھی۔

"میں نے پہلے بھی تم سے ایک بات کہی تھی اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں مت پڑو، اگر تم ہماری حمایت نہیں کر سکتیں تو مخالفت بھی مت کرو، نیوٹرل رہو۔"

"ہماری حمایت...... مطلب؟ کیا تم بھی امی کا ساتھ دے رہے ہو؟ سب کچھ جانتے بوجھتے؟" سارہ بھونچکا رہ گئی۔

"اگر ہم سارے بھائی اپنی ماں کے ساتھ نہیں کھڑے ہوں گے تو اور کون کھڑا ہوگا؟ تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو، اگر تمہارے ماں، باپ میں سے کسی پر مشکل وقت ہو تو کیا تم ان کا ساتھ نہیں دو گی؟"

"اگر وہ غلط ہوئے تو نہیں۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ زبانی دعوے کرنا آسان ہے مگر جب اپنے قریبی اور پیارے لوگ مشکل میں ہوتے ہیں نا تو ساری اخلاقیات اور تہذیب دھری کی دھری رہ جاتی ہے......"

"گل بھابھی تمہاری اپنی نہیں؟ وہ اور ان کے بچے، تمہارے سگے بھائی کی فیملی ہیں۔ یہ گھر ان کا ہے، جس پر ہم سب قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔" سارہ نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔

"گل بھابھی جھوٹ بول رہی ہیں۔ اگر ان کے والد نے انہیں حقیقت سے لاعلم رکھا تو اس میں امی کا کیا قصور ہے؟"

"اور گل بھابھی کے ساتھ جو سلوک ہوتا رہا اس گھر میں، اس کی کیا وضاحت کرو گے؟"

"ایک ماں کے بارے میں سوچو۔ جس کا جوان بیٹا چلا گیا تمہیں کیا معلوم گل بھابھی جیسی نفسیاتی مریضہ کو امی نے اور ہم سب نے کیسے جھیلا ہے اور سنبھالا ہے، کبھی تو وہ بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں۔ امی کے ساتھ بہت بدتمیزی کرتی تھیں۔ زبان چلاتی تھیں۔

جب ہم بالکل ہی تنگ آ گئے تو امی نے انہیں اوپر شفٹ کر دیا تھا اور ویسے کئی بار ان سے کہا بھی کہ فلیٹ موجود ہے، وہاں شفٹ ہو جائیں مگر وہ انکار کرتی رہیں اپنی اور بچوں کی جان بوجھ کے ایسی حالت بنائی ہوئی ہے کہ لوگ انہیں مظلوم سمجھ کے ترس کھائیں۔"

سلمان نے جذباتی ہو کر ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔

"ہو سکتا ہے باقی سب کچھ سچ ہو مگر اس گھر کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ گل بھابھی جھوٹ نہیں بول رہیں، مجھے بہت معتبر انسان نے بتایا ہے جن پر مجھے بھروسا ہے۔"

"مجھ سے زیادہ تمہیں چچا کی بات پہ اعتبار ہے۔"

سلمان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ سارہ کس معتبر فرد کی بات کر رہی ہے۔ چچا ہی وہ واحد انسان تھے جنہوں نے سب سے پہلے گل بھابھی کی حمایت میں آواز اٹھائی تھی۔ اور تائی امی نے ان سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔

"مجھے تم پر بہت مان ہے سلمان!" سارہ نے بے حد امید سے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں اپنی ماں کو ذلیل کروا کر عدالت سے سزا دلوا دوں تا کہ تمہارا مان اور بھرم جو مجھ پر ہے۔ سلامت رہے؟"

سلمان کی تیوریاں تو چڑھی ہوئی تھیں اب پارا بھی اوپر چڑھ گیا۔

"تم میری بیوی ہو، اس گھر کی بہو ہو اور امی کتنا چاہتی ہیں تمہیں، لاڈلی ہو ان کی، ایک دن بھی انہوں نے بہو سمجھ کر ٹریٹ نہیں کیا تمہیں۔ ہمیشہ بیٹی جیسا لاڈ پیار کیا اور تم سب کچھ فراموش کر کے اس عورت کے لیے بحث کر رہی ہو۔"

سلمان کے چہرے پر غصہ تھا۔ آواز میں برہمی۔ اس نے پہلے اس طرح سارہ سے کبھی بات نہیں کی تھی۔

pklibrary.com

سارہ کچھ دیر خاموش رہی پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں کسی کے خلاف بات نہیں کر رہی۔ مجھے اس گھر کے افراد بھی عزیز ہیں اور عزت بھی۔ میں تو بس حق اور انصاف کے لیے بات کر رہی ہوں جو گل بھابھی کو ملنا چاہیے۔"

"تمہاری سوئی تو بس ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔" سلمان جھلا کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میری ماں جیل پہنچ جائے۔ یہی چاہتی ہو تم؟"

"عدالت سے باہر بھی معاملات طے ہو سکتے ہیں تم امی سے بات تو کرو۔"

"کوئی معاملہ طے نہیں ہو سکتا گل بھابھی سے۔ وہ اس گھر کا قبضہ مانگ رہی ہیں۔ جس میں لاکھوں روپے لگا کر ہم نے اس کی حالت بھی بدل دی ہے اور ویلیو بھی بڑھا دی ہے۔ یہ مکان انہیں دے کر ہم کہاں جائیں گے۔ یہ سوچا ہے تم نے؟ یہ ظالم، مظلوم اور حق و انصاف کی جو باتیں تم کر رہی ہو وہ کتابوں میں اور فیس بک پوسٹ میں ضرور اچھی لگتی ہیں مگر پریکٹیکل لائف میں ان سب اخلاقیات کی کوئی جگہ نہیں ہے، جب اپنے مفادات پہ ضرب لگتی ہے اور جان پہ بن آتی ہے تو ساری اخلاقیات قدار اور طور طریقے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

سلمان تند و تیز لہجے میں بول کر باہر نکل گیا سارہ نے بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور خالی کمرے میں ایک نگاہ دوڑائی کچھ دیر پہلے اسے بڑا یقین تھا کہ وہ سلمان کو قائل کر لے گی۔ مگر وہ یقین مٹی کا گھروندہ ثابت ہوا اور بری طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ حق اور انصاف کا پرچار کرنا ایک الگ بات ہے مگر کسی کو اس کا حق دلوانا بہت ہی کٹھن بہت ہی مشکل ہے۔ وہ تو ابھی زبانی قائل ہی نہیں کر سکی تھی شوہر کو تو آگے کے سخت مراحل میں کیسے سروائیو کر سکے گی؟

☆☆☆

"ہم مسلمانوں کی خام خیالی ہے کہ عیسائیوں کی اکثریت مذہب سے دور اور کسی مادی ترقی کی دوڑ میں ہے۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ عقائد کے اعتبار سے عیسائی بھی مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح اپنے اپنے مسلک کے پیروکار ہیں اور مذہبی رجحان رکھتے ہیں۔ یاجوج ماجوج آخری معرکہ خیر و شر (جنگ عظیم) دجال کی آمد، مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی آمد اور آخر میں تمام دنیا میں ان کے مذہب کا غلبہ عیسائیت کے یہ عقائد کچھ فرق کے ساتھ مسلمانوں کی طرح ہی ہیں ان کے پادری اور مذہبی مبلغ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کے پیروکار کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کا انتظار ہے۔

اگرچہ ان میں بھی الگ الگ فرقے اور مسالک ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو یہودیوں کے مخالف ہیں یا یوں کہیں کہ صیہونی عزائم اور سوچ کے خلاف ہیں مگر بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جو یہودیوں کا ساتھ دینا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ مسیحی صیہونیت (Christian Zionsm) کے پیروکار ہیں ان کا یقین ہے کہ 1948ء میں اسرائیل کا قیام بائبل کی ایک پیشین گوئی کی تکمیل ہے، اس عقیدے کے پیروکار انجیلیکل (Evengelical) کہلاتے ہیں جو اپنے عقیدے میں شدید انتہا پسند اور بنیاد پرست ہیں۔

امریکی باشندوں کی ایک چوتھائی سے زیادہ تعداد اس عقیدے سے تعلق رکھتی ہے اور اسرائیل کے قیام کے بعد سے آج تک امریکہ میں جتنے بھی صدور آئے ہیں۔ سوائے ایک آدھ کے سب کے سب ایونجلسٹ تھے جو بائیڈن سمیت، تب ہی آج تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں سب سے زیادہ امریکہ نے اسرائیل کے حق میں اور اس کی حمایت میں ویٹو کا حق استعمال کیا ہے۔ حتیٰ کہ آج غزہ کے معاملے پر بھی جب عالم اقوام کی اکثریت نے جنگ بندی کا مطالبہ کرتے ہوئے قرارداد منظور کی تو امریکہ

pklibrary.com

واحد ملک تھا جس نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیا۔

اسرائیل ایک لاڈلا اور بگڑا ہوا سپوت ہے جسے ایک سپر پاور (برطانیہ) نے تخلیق کیا اور دوسری سپر پاور (امریکہ) نے نہایت ناز و نعم سے پال پوس کر بڑا کیا۔ یہ سب سے زیادہ مالی امداد پانے والا ملک ہے۔ جس کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ کیونکہ اسرائیل وہ مرکزی اسٹیج ہے جہاں بائبل کی پیشن گوئیاں پوری ہوں گی۔ یروشلم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ہوگی اور وہ تخت داؤد پر بیٹھیں گے اور دنیا پر بادشاہت کریں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودیوں کی حمایت کے باوجود عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس سارے واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے بعد نجات پا کر جنت میں جانے والے وہی ہوں گے، جو عیسائی ہوں یا عیسائیت قبول کریں۔ خدا کے پاس دو منصوبے ہیں۔ یہودیوں کے لیے "ارضی منصوبہ" یعنی بہشت۔ جس میں ان کا قیام ہوگا۔

7 اکتوبر 2023ء کے بعد سے مغربی حکمرانوں کی منافقت اور مذہبی تعصب مزید کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تمام دنیا میں انتہا پسند اور بنیاد پرست مشہور کر کے دہشت گرد کا لیبل لگا دیا۔ مگر آج دنیا میں جو بائیڈن (شی سونک اور اہم مغربی سربراہان مملکت سے بڑھ کر انتہا پسند اور بنیاد پرست کون ہے؟ جنہوں نے نیتن یاہو جیسے قصاب کو فلسطینی مسلمان ذبح کرنے کا لائسنس دیا ہوا ہے۔ غیر مشروط اور لامحدود حمایت کا اذن دیا ہوا ہے غاصب اور جارح اسرائیل کو "حق دفاع" حاصل ہے لیکن فلسطین کے اصل باشندوں کو اپنی ہی سرزمین پر آزادی اور امن سے رہنے کا حق حاصل نہیں ہے مگر دنیا کے ٹھیکے دار طاقت ور حکمرانوں کے برعکس ان کے عوام نے فلسطین کے حق میں آواز بلند کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ باشعور بھی ہیں اور باضمیر بھی ہیں۔"

☆☆☆

سورج نے رخصتی کی راہ لی اور بہت دیر بعد جب چمکیلے تاروں کی ردا اوڑھ لی تو سارہ کو واپسی کا ہوش آیا۔ سہ پہر میں یہاں آئی تھی پھپھو سے بات کرنی تھی اور کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی سارہ انہیں قائل نہ کر سکی۔ حالانکہ آسان اور معمولی سی خواہش تھی کہ پھپھو۔ تائی امی سے گفت و شنید کر کے انہیں آمادہ کریں کہ وہ گل بھابھی کا حق انہیں واپس کر دیں۔

"گھاس تو نہیں کھا گئی ہو سارہ؟" پھپھو تو اس کی فرمائش سن کر ہی بدک گئیں۔

"آپ بھی جانتی ہیں پھپھو! کہ گل بھابھی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، ان کا جو حق ہے انہیں ملنا چاہیے۔"

"گل نے عدالت میں مقدمہ کیا ہوا ہے۔ جو فیصلہ ہوگا پتا چل جائے گا۔ تم کیوں انصاف کا پرچم اٹھائے پھر رہی ہو۔ تمہاری ساس اور میاں کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟" پھپھو نے اسے ڈرایا۔

"آپ بھی جانتی ہیں نا کہ سچ کیا ہے؟ چچا جان نے بتایا تھا کہ"

سارہ نے فقرہ ادھورا چھوڑا اور ان کے چہرے پہ نظریں جمائیں۔

"سب ہی جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے؟ مگر سچ بولنے کا رواج آج کل ہے کہاں؟ کسی کے منہ پہ اس کے متعلق سچ بول سکتے ہیں؟ میری بیٹی ان کے گھر ہے۔ اپنی سمدھن سے یہ کہہ دوں کہ انہوں نے جس مکان پہ قبضہ کیا ہے اسے اصل مالک کو واپس دے دیں۔ ویسے سچ تو یہ بھی ہے کہ انہوں نے بیعانے کی اچھی خاصی رقم ادا کی تھی اس وقت کے لحاظ سے خاصی بڑی رقم تھی اور بقول ان کے بیعانے کے بعد آدھی سے زیادہ رقم ادا کر دی تھی۔"

پھپھو نے بولتے بولتے سانس لی۔

"تم اپنی ساس کے خلاف محاذ بنا رہی ہو۔ کبھی ابو سے، کبھی چچا سے، کبھی ہم بہنوں سے، سب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ ان سے بات کریں۔ تو تم خود کیوں نہیں کر لیتیں یہ نیک کام؟

سارہ ایک لمحے کو خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔

''میرے اور ان کے درمیان ایک بھرم ہے جو میں چاہتی ہوں کہ قائم رہے۔ وہ بہر حال میری بڑی ہیں۔ امی ابو سے بھی بڑی ہیں عمر میں۔ ان سے دوہرا رشتہ ہے میرا۔ پہلے تائی پھر ساس اس بھرم اور احترام کو زائل نہیں کرنا چاہتی۔''

''ان کو کبھی تو علم ہوگا کہ یہ وفد جو ان کے پاس آیا ہے وہ کس نے بھجوایا ہے۔'' پھپھو نے سوال اٹھایا۔

''جب کی جب دیکھی جائے گی۔ آپ بتائیں، کیا کر سکتی ہیں؟'' سارہ نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

''سارہ، تم مجھے بہت عزیز ہو جانتی ہوں کہ تمہارا دل بہت پیارا، نرم اور ہمدرد ہے مگر بیٹا زندگی، کتابی باتوں کے سہارے نہیں گزرتی۔ اس کے حقائق بہت مختلف اور بہت تلخ ہیں۔ میری بیٹی ان کی بہو ہے۔ انہیں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

پھپھو کی آواز میں بے بسی تھی۔

''آپ اپنی بیٹی کو اپنی کمزوری کیوں بنا رہی ہیں! اسے اپنی طاقت بنائیں، ان سے کہیں کہ وہ بھی اس میں شریک ہو جائیں اور اپنے شوہر کو بھی قائل کرنے کی کوشش کریں۔''

''سارہ چندا، تم ہر چیز کو اتنا آسان کیوں سمجھتی ہو؟''

''پھپھو، کبھی معاملات آسان ہی ہوتے ہیں ہم خود انہیں بہت پیچیدہ اور مشکل بنا دیتے ہیں۔''

''تم سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہو۔ نیک اور ہمدرد، مگر سب ایسے نہیں ہوتے۔'' پھپھو نے ایک گہری سانس لی۔

''ہمارے درمیان زیادہ تر لوگ اچھے ہی ہوتے ہیں پھپھو، بس کچھ وجوہات کی بنا پر ان کی برائیاں، اچھائیوں پہ غالب آجاتی ہیں یا نمایاں ہو جاتی ہیں لیکن ان کی اچھائیوں کو ابھارا جا سکتا ہے، ذرا کوشش کی ضرورت ہے اور بس۔'' سارہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''اچھا پہلے تم اپنے شوہر کو تو قائل کر لو، اگر سلمان راضی ہو گیا اپنی ماں کو راضی کرنے میں، تو ہم بھی تم دونوں کا ساتھ دیں گے۔'' پھپھو نے اسے بچوں کی طرح بہلا کر ٹال دیا۔

واپسی کا سفر بھی سوچتے ہوئے گزرا۔

سلمان گھر پہ منتظر تھا۔ سارہ بتا کر تو گئی تھی کہ کہاں جا رہی ہے مگر جانے کا مقصد اب واپس آ کر سلمان کو بتایا تو وہ یکدم ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''تم کیا کرتی پھر رہی ہو تمہاری امی نے فون کیا ہے مجھے کہ تمہیں سمجھاؤں۔''

''امی نے؟'' سارہ کو یقین نہیں آیا۔

''پتا نہیں کیا خناس سما گیا ہے تمہارے دماغ میں۔'' سلمان کی آنکھوں میں غصہ تھا چہرے پر جھنجلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''کسی کو انصاف دلانا خناس ہے دماغ کا؟''

سارہ کو شوہر کے جملے سے تکلیف پہنچی تھی جو اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''تمہارے گھر پہنچنے سے ذرا دیر پہلے پھپھو نے بھی کال کی تھی، انہوں نے بھی یہی بات کی جو چچی (سارہ کی امی) نے۔''

سلمان نے ایک اور بم پھوڑا تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی۔ اس کے چہرے پہ اتنی بے یقینی اور بے چارگی تھی کہ سلمان کو ترس آ گیا۔

''دیکھو جان۔'' سلمان نے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھے۔

''انقلاب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ غلط کو غلط سمجھنا الگ بات ہے مگر اس کے خلاف آواز اٹھانا بہت کٹھن ہوتا ہے تم جیسے لوگوں کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اکیلا چھوڑ دیتے ہیں سب۔'' سلمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں تمہارا شوہر ہوں۔ تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہاری زبان سے نکلی ہر بات کو پورا کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ تم جانتی ہو تمہاری ایک

ہوں۔ مگر جو مدعا تم اٹھا رہی ہو۔ اس میں میں اپنی ماں کا ہی ساتھ دوں گا۔ اپنے والدین کو کون رسوا کرتا ہے یار؟"

سلمان نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر سے اٹھا لیے، تکلیف تو اسے بھی تھی۔ اپنی محبوب بیوی اور عزیز از جان ماں، دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیسے کرے؟ ماں سے بات نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا بیوی کو ہی سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہر کوشش بے کار بھی تھی۔

"تم نے مجھے بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے، تم سمجھتی ہو، کوئی بیٹا اپنی ماں کو ذلیل کر سکتا ہے؟"

"حق بات بولنے سے کسی کی ذلت نہیں ہوتی، بلکہ تم امی کو اس ظلم و زیادتی سے باز رکھ کر ان کے ساتھ بھلائی ہی کرو گے اس دن کی ذلت اور رسوائی سے بچاؤ گے جب....."

میں کوشش کر رہا ہوں کل بھابھی سے کوئی ڈیل ہو جائے۔ ہم سب بھائی مل کر کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ کسی کی کوئی حق تلفی نہیں ہوئی۔ بلیوی....."

"اچھا!" سارہ یقین کرنا چاہتی تھی مگر جانے کیوں یقین نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ریلی کے شرکاء بہت بڑی تعداد میں تھے تاحد نگاہ سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ دنیا بھر میں فلسطین کے حق میں اور اسرائیل مخالف مظاہرے ہو رہے تھے۔

ایسی ہی ایک ریلی جب سارہ کے شہر میں ہوئی تو وہ بھی اس میں شریک تھی بلکہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے گھر اور رشتے داروں، حلقہ احباب کے بیشتر افراد اس ریلی میں شریک تھے ہاتھوں میں پوسٹرز، پلے کارڈز اور بینرز اٹھائے، چل رہے تھے اکثریت نے سیاہ و سفید کفایہ (مخصوص فلسطینی اسکارف) کندھوں پہ ڈالے ہوئے تھے یا گردن کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔

سارہ آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر سوچوں کے

کرداب نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

کتنی عجیب بات ہے، ہم کسی بھی جگہ ہوں ظلم پر رنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔ افسوس بھی کرتے ہیں اور مذمت بھی۔ مگر جو کچھ ہمارے آس پاس، ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا تو دور کی بات کبھی ہم الٹا ظالموں کے ہی مددگار بن جاتے ہیں۔

کیسی دلچسپ نفسیات ہے ہماری یہ، کوئی کہانی پڑھتے ہوئے۔ ڈرامہ یا فلم دیکھتے ہوئے ہماری ساری ہمدردیاں مظلوم، دکھی اور بے بس ہیروہیروئن کے ساتھ ہوتی ہیں اور جب یہ کردار اصل زندگی میں ہوں تو ہم سے بڑا ولن کوئی نہیں ہوتا۔

جب جہاں ہمارے مفادات پہ ضرب پڑتی ہے، قربانی دینے کا وقت آتا ہے ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں گفتار کے غازی ہم سب ہیں۔ کردار کے غازی بہت قلیل، بہت کم بلکہ نایاب۔

"بات سنو۔" عائزہ نے اسے ٹہوکا دیا۔ جو اس کی کزن بھی تھی اور جٹھانی بھی۔

"تم نے کون سی مہم شروع کی ہوئی ہے گھر میں؟ تم کل بھابھی کو سپورٹ کر رہی ہو۔ جانتی ہو اس کا انجام؟ میرے میاں ہوں یا تمہارے، یہ سارے بھائی پہلے اپنی ماں کے بیٹے ہیں پھر کچھ اور ہیں، نعمان آئیں گے تم سے بات کرنے۔ غصہ کر رہے تھے کہ سارہ کو کیا ہو گیا ہے؟" عائشہ نے چلتے چلتے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"گھر میں بھی وہی کر رہی ہوں جو آج یہاں کر رہی ہوں، یعنی مظلوم کی حمایت، سارہ نے مختصرا جواب دیا۔

"انقلاب لانے کی کوشش کرو گی تو بھگتنا بھی پڑے گا۔" عائشہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے ڈرایا۔

"جانتی ہوں" سارہ کا جواب اب بھی مختصر تھا مگر بات یہ تھی کہ جو معاملہ اس نے اٹھایا تھا وہ نہ

معمولی تھا نہ مختصر، اسے طول پکڑتا تھا اور وہ طول پکڑ ہی رہا تھا۔ گل جب گھر پہنچی تو نعمان بھابھی پہلے ہی سے وہاں موجود تھے اور سارہ کے آنے سے پہلے وہ امی اور سلمان کو لے کر بیٹھے تھے اور سارہ کی نگاہ جب ان کے چہرے پر پڑی تو وہ کھلی کتاب بنا ہوا تھا ان کے سرخ وسفید چہرے پہ غیظ وغضب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

سارہ اس لمحے کے لیے تیار تھی، بہت سوچا تھا اس نے اس وقت کے بارے میں، کہ جب اسے تائی امی کا سامنا کرنا پڑے گا مگر پھر بھی اس لمحے ذرا دیر کو اس کے قدم ڈگمگا گئے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دماغ بالکل بلینک ہو گیا۔

''یہاں بیٹھو۔'' تائی امی نے فوراً ہی اسے بلالیا۔

''سارہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ دھیرے دھیرے اس کے اوسان بحال ہو رہے تھے اور ساری حسیات جیسے دوبارہ واپس آ رہی تھی۔

''وہ سب جو تم ادھر ادھر سب سے کہتی پھر رہی ہو۔ وہ مجھ سے ڈائریکٹ کہو۔'' تائی امی نے بغیر کسی تمہید کے تیز لہجے میں اسے حکم دیا۔

سارہ نے وہاں بیٹھے تمام افراد پہ ایک نظر دوڑائی کسی کے بھی چہرے پر کوئی نرمی کوئی ملائمت یا حوصلہ افزائی نہیں تھی۔ سلمان نے سچ کہا تھا کہ اسے یہ لڑائی اکیلے ہی لڑنی پڑے گی۔ سارہ نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی۔

''تائی امی! آپ جانتی ہیں کہ جیسے آپ مجھے عزیز رکھتی ہیں۔ میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کی عزت بھی کرتی ہوں۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ جس کا جو حق ہے اسے واپس دے دیں۔'' سارہ نے مختصر اور محتاط لفظوں کا چناؤ کر کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''اور نہ دوں تو کوئی کیا بگاڑ لے گا؟'' تائی امی کے چہرے پر خشونت بھی تھی اور رعونت بھی۔

سارہ چند لمحے خاموش رہی پھر گویا ہوئی۔

''حق دار کو اس کا حق تو دینا ہی پڑتا ہے یا تو دنیا میں یا آخرت میں۔''

سارہ وہاں رکی نہیں، اٹھ کر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ پیچھے پیچھے سلمان بھی آ گیا۔

''تم حد سے آگے بڑھ رہی ہو سارہ!'' سلمان کے چہرے پہ دبا دبا غصہ تھا۔

''حد سے آگے میں نہیں بڑھی سلمان، صرف نشان دہی کی ہے۔''

سارہ کی آواز میں تھکن بھی تھی اور اداسی بھی، انسان کا ضمیر اسے پل صراط پہ کھڑا کر دیتا ہے۔ جس پر چلنا بہت ہی کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔

''مجھے صاف صاف بتاؤ، تم ہمارے ساتھ ہو یا گل بھابھی کے ساتھ؟'' سلمان نے شانے پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''سوال کا جواب دینے سے پہلے سوچ لینا۔ کون سا جواب تمہیں تمہاری اس جنت سے محروم کر سکتا ہے۔'' سلمان کے لہجے اور آنکھوں میں وہی تپش تھی جو تائی اماں کے چہرے پہ وہ ابھی دیکھ کر آئی تھی۔

سارہ نے جواب دینے کے لیے لب کھولے۔

☆☆☆

ہر طرف تباہی، بربادی، بے بسی اور بے کسی تھی۔ سفاکیت اور درندگی کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر گزرتے لمحے اس میں اضافہ ہی ہو رہا تھا اندھا دھند بمباری میں روزانہ سینکڑوں افراد شہید ہو رہے تھے اور ہو رہے ہیں جن میں ایک بڑی تعداد بچوں کی ہے۔ فلسطینیوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ چھپ چھپا کر نہیں بلکہ ببانگ دہل، سینہ تان کر معصوم بچوں پہ ممنوعہ فاسفورس بم گرا کر انہیں جلایا گیا جو انسانی ہڈیوں تک کو راکھ کر دیتے ہیں۔ تادم تحریر چوبیس ہزار سے زائد افراد جو شہید ہوئے ان میں ہزاروں بچے اور عورتیں تو ہیں ہی مگر کئی گھرانے ایسے ہیں جو پورے کے پورے ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

وہ صحافی بھی عتاب کی رو میں آئے جو صیہونی ظلم کے مناظر دنیا کو دکھا رہے تھے۔ انہیں اور ان کے گھرانوں کو ختم کیا گیا۔ وہ ڈاکٹرز اور طبی عملہ جو ناکافی

سہولتوں اور خطرات کے باوجود اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اسپتالوں پہ بمباری کر کے انہیں بھی نشانہ بنایا گیا۔ ہر مقام کھنڈر بن گیا، چاہے رہائشی عمارتیں ہوں، گھر ہوں، عبادت گاہیں، مساجد بھی، چرچ بھی، اسکول تعلیمی ادارے، بازار، دکانیں خصوصاً بیکریاں (تاکہ بھوک مٹانے کا کوئی سامان بھی میسر نہ ہو) اسپتال بھی نہ چھوڑے، درخت کھیت، زرخیز زمین سب جگہ بارود کی بارش کی گئی۔ یہاں تک کہ قبرستان بھی نہیں بخشے۔ وہاں بھی بلڈوزر چلا دیے۔

شہدا کے لیے قبرستان بھی کم پڑ گئے تھے۔ سڑک کنارے اجتماعی قبر میں پچاس، ساٹھ اور سو سو شہداء کی تدفین کی گئی۔ وہ شہدا شاید خوش نصیب تھے جو زندگی میں ایک ساتھ ایک کنبے کی حیثیت سے رہتے تھے اپنی شہادت کے بعد اکٹھے ایک ہی کفن میں دفن کیے گئے۔

امت مسلمہ نے ہمیشہ کی طرح مذمت، تشویش اور غم واندوہ جیسی تراکیب سے کام چلا لیا۔ اسرائیل کے خلاف بیٹھے بیٹھے قراردادیں بھی منظور ہو گئیں۔ عملی اقدامات اٹھانے کے لیے سب کے پاس اپنی اپنی وجوہات ہیں۔ اقتصادی اور معاشی مجبوریاں، حاکموں، آقاؤں کی ناراضی کا خوف، ایوان اقتدار اور بادشاہی سے محرومی کا ڈر۔

یمن نے جرات دکھائی اور دنیا بھر کے عوام نے چاہے وہ کسی مذہب، کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ مظلوم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

موسم کے تیور بدل رہے تھے سرد اور خشک ہواؤں نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ موسم کی تبدیلی اور شدت سے جہاں بڑے متاثر ہو رہے تھے وہاں بچے بھی متاثر تھے۔

سارہ نے انتہائی فکر اور تشویش سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ بخار کی شدت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ ٹھنڈ سے سینہ بھی جکڑا ہوا تھا۔ رو رو کر خود بھی نڈھال ہوا اور ماں کو بھی کیا۔ بہت دیر بعد وہ اب سویا تھا۔ سارہ اس کا مسل ٹھیک کر رہی تھی۔

''دوائی پلا دی؟'' امی نے قریب آ کر نواسے کا ماتھا چھوا۔

''جی!'' سارہ کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ تھکن بھی تھی اور دکھ بھی۔

دو راتوں سے وہ مسلسل جاگ رہی تھی کل رات بیٹے کی وجہ سے جاگی اور اسے سے پہلی رات جاگنے کی بہت ساری وجوہات تھیں اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ جو آواز اس نے اٹھائی ہے۔ اس کی پاداش میں اپنی چھوٹی سی جنت سے محروم ہونا پڑے گا۔ شوہر کی بے رخی، بے اعتنائی کا عتاب جھیلنا پڑے گا۔ ساس کے غیض وغضب کا اور قریبی رشتوں کی سرد مہری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تھوڑی بہت مشکل کا اندازہ تھا مگر اسے خوش فہمی یا غلط فہمی تھی کہ انسانیت اور اخلاقیات کے ناتے قریبی رشتے تو اسے سپورٹ کریں گے۔ مگر انسانوں کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ ہر ایک میں اخلاقی جرات کے پیمانے الگ الگ ہوتے ہیں۔

دوسرے مظلوموں کی حمایت کرنا اور ظالم سے نفرین بھیجنا آسان ہے۔ امتحان تو تب ہوتا ہے جب ظالم ہمارا قریبی ہو جس سے ہمارے رشتے، مفادات اور جذبات جڑے ہوں اس وقت مظلوم کے حق کی حمایت کرنا اس کے لیے آواز اٹھانا، عملی قدم اٹھانا جوئے شیر کھودنے کے مترادف ہے۔ سنگلاخ چٹان جیسے فرد کے سامنے کھڑا ہونا سہل نہیں اپنی ذات کے پرخچے اڑنے لگتے ہیں۔

سارہ کی ہستی پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ تائی امی نے اسے اتنی باتیں سنائی تھیں کہ اپنا آپ دو کوڑی کا لگنے لگا تھا۔

''تم چھوٹی سے اٹھ کر محل میں آ گئیں تو اپنی اوقات بھول گئیں؟ میں اگر آسمان پہ لے جا سکتی ہوں تو زمین پہ گرانا بھی جانتی ہوں، اپنے سر آنکھوں پہ بٹھایا مگر تمہیں عزت راس نہیں آئی۔'' تھپے میں بھری تائی امی نے اسے اتنا لتاڑا کہ وہ بس روہی پڑی۔

''ٹھیک ہے انہوں نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ جس گھر سے اٹھ کر یہاں آئی تھی دونوں میں زمین آسمان کا فرق

تھا۔ وہ جس پورشن میں رہائش پذیر تھی اس پر بے دریغ رقم خرچ کی گئی تھی۔ آرام، آسائش، سہولتیں، عیش، سکون، خوشی اور عزت کیا نہیں تھا جو اسے میسر تھا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ناشکری تھی وہ تو سب کی محبتوں کی قدر دان تھی، اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ مگر اپنے دل اور ضمیر کا کیا کرتی جن کا شمار ابھی زندوں میں تھا۔

گل بھابھی اور بچوں کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا تھا اور اب اتنا کچھ ہونے اور جاننے کے بعد وہ اس گھر میں کیسے رہتی؟ اندر ہی اندر ندامت اور شرمندگی ہو رہی تھی۔ مگر اپنے میکے آ کر اور سب کی آراء و تبصرے سن کر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سسرال میں رہنے میں زیادہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی یا یہاں میکے آ کر زیادہ ندامت ہو رہی ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر اور باہر سب لوگ اسے ہی کیوں قصوروار ٹھہرا کر ناشکرا قرار دے رہے ہیں؟ ہر کوئی اسے یا تو سمجھا رہا تھا یا ڈرا رہا تھا۔

"کسی معمولی باتوں پہ بھی کوئی اپنا گھر چھوڑتا ہے؟ تمہیں کیا ضرورت ہے دوسرے کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی، تمہاری ساس جانیں یا ان کی بہو، دونوں خود ہی نمٹ لیں گی آپس میں، تمہارا بولنا کوئی ضروری تو نہیں، گل بھابھی میں جب اتنا دم خم ہو، آ گیا ہے کہ وہ مقدمہ کر سکتی ہیں تو آگے بھی اپنے معاملات خود ہی دیکھ لیں گی۔ تم اپنا گھر کیوں بگاڑ رہی ہو۔"

دوسروں کے پیچھے امی نے اسے ڈانٹا تھا، ابو نے سمجھایا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ابو، گل بھابھی اپنی لڑائی خود لڑ رہی ہیں۔ میں نے تو عملاً ان کا کوئی ساتھ نہیں دیا۔ بس میں اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی جس پر کسی کی بددعا کا سایہ ہو۔"

سارہ کا لہجہ دکھ اور کرب سے بوجھل تھا۔ سب اسے مورد الزام ٹھہرا رہے تھے یا بے وقوف، جذباتی کے القاب مل رہے تھے۔

"سارہ بیٹا! اتنی حساسیت اچھی نہیں انسان جتنا حساس ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے بہت زیادہ اور بڑی چوٹ لگ جاتی ہے۔" چند لمحوں بعد ابو نے ہی لب کشائی کی۔

"ہم لوگ دوہرا معیار رکھتے ہیں ابو۔ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ جس میں احساس نہیں وہ انسان نہیں دوسری طرف کسی کا حساس ہونا خود اسی کے لیے نقصان دہ بھی بن جاتا ہے۔"

"شوہر کا گھر چھوڑ کر کیا ملے گا تمہیں؟" امی نے سوال کیا۔ وہ سارہ کے طرز عمل سے اس لیے بھی خائف تھیں کہ اس سے چھوٹی بہنیں گھر میں موجود تھیں۔ انہیں بیاہنا تھا۔ معاشرتی رویے سے خوب واقف تھیں۔

"میں نے شوہر کا گھر نہیں چھوڑا ہے امی! سلمان جب چاہیں مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں۔ جسے وہ اپنی کمائی سے اپنی محبت سے بنائیں۔" سارہ نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کیا کر رہی ہو اور آگے پتا نہیں کیا ہوگا۔" امی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"سلمان کا فون بھی نہیں آیا۔ زیادہ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا؟" امی کی پریشانی کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا امی بس وہ، اس گھر میں رہنا چاہتے ہیں اور میں نہیں۔"

سارہ کا موقف اتنا سادہ نہیں تھا جتنی سادگی سے وہ بیان کر رہی تھی۔ بہت کم وقت لگا اور سارے خاندان میں چرچا ہو گیا، جہاں پہلے سرگوشیاں اور چہ مہ گوئیاں جاری تھیں وہاں سارہ کی میکے میں موجودگی نے سب کے خدشات اور سرگوشیوں پہ تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ سوائے چند ایک کے ہر کوئی ناصح بنا ہوا تھا۔

وہ جو چارہ ساز تھا غم گسار تھا روٹھا ہوا تھا۔ اگرچہ کال کی تھی سلمان نے مگر مختصر سی، نپی تلی رسمی باتیں، خیر خیریت، طبیعت اس کی اور بچے کی، اس سے آگے اور اس کے علاوہ نہ سلمان نے کچھ پوچھا اور نہ سارہ نے کچھ کہا۔

☆☆☆

دسمبر کا آغاز ہوئے ہفتہ بیت چکا تھا۔ دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ مختصر سے صحن میں دھوپ ابھی بھرپور تھی۔ یہ ہر شے روشن تھی۔ سارہ امی کے ساتھ مٹر چھیل رہی تھی ابو چھٹی کے دن کا اخبار ہاتھ میں لیے اسے حفظ کر رہے تھے کیونکہ صبح سے دوپہر ہو چکی تھی اور ان کا ناشتہ بھی اخبار کے ہمراہ ہوا۔ ابھی تک وہ ہاتھوں اور آنکھوں سے جدا نہیں ہوا تھا۔

"اب تو جان چھوڑ دیں اس موئے اخبار کی۔ سوائے ہیبت ناک خبروں کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ اور یہ آپ پڑھ کیا رہے ہیں؟" امی نے قریب ہی کرسی پہ بیٹھے شوہر نامدار کے ہاتھوں میں پکڑے اخبار کا جائزہ لیا۔ جو فولڈ تھا۔

"ارے بس، کچھ نہیں۔" ابو نے اخبار ایک طرف رکھ دیا مگر امی کی نگاہیں اپنے طاقتور چشمے کے پیچھے سے بھانپ چکی تھیں۔

"پتا نہیں کیا ملتا ہے آپ کو ضرورت رشتہ کے اشتہار پڑھ کر، بچوں کے رشتے کے لیے تو کبھی ٹرائی نہیں کیا بس پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔" امی نے اعتراض اٹھایا۔

"ان اشتہارات سے قوم کی سائیکی کا پتا چلتا ہے ہمارے خیالات اور خواہشات کا عکس ہوتا ہے اس میں۔"

"ساری قوم تو اشتہار دے کر یا دیکھ کر شادی نہیں کرتی۔" امی نے سر جھٹک کر ایک اوہنہ کی اور دوبارہ اپنے کام یعنی مٹر چھیلنے میں مشغول ہو گئیں پھر اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔

"سلمان کی کال آئی؟"

"جی رات میں آئی تھی۔" سارہ مضمحل تھی۔ چہرے کی شادابی چند دنوں میں ہی ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو رہے تھے۔ بیٹا اللہ اللہ کر کے ٹھیک ہوا تو اس کے اپنے بیمار پڑنے کے آثار نظر آنے لگے۔

"کچھ کہہ رہا تھا؟"

"کچھ خاص نہیں وہی روز کی طرح خیر خیریت پوچھ رہے تھے اور بس۔"

"خدا جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔"

امی کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی اور سارہ کی پریشانی ان سے بھی سوا تھی۔ لاکھ کوشش کرتی خود کو سنبھالنے کی، مگر روز بکھر بکھر جاتی، گل بھابھی کی کال آئی تھی۔

"میں اپنی لڑائی خود لڑلوں گی تم اپنا گھر خراب نہ کرو سارہ!" گل بھابھی نے بہت دل سوزی سے اسے سمجھایا تھا۔

"میں تو خود اکیلی ہوں۔ کمزور ہوں۔ کیا ساتھ دے سکتی ہوں آپ کا۔ بس اپنا دل ہی قبول نہیں کر رہا وہاں رہنا۔ میں نے کوشش کی آپ کے لیے مگر کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔" سارہ کی آواز میں رنج تھا۔

"تمہاری کوشش ہی اہم ہے۔ یہ مت سوچو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فرق پڑتا ہے۔ کبھی ایک اکیلی، تنہا آواز سے بھی فرق پڑتا ہے۔"

گل بھابھی نے اسے سراہا تھا اور مقدمہ جیتنے کی امید بھی ظاہر کی تھی۔ معاملات بہت واضح تھے۔ ان کے پاس پراپرٹی کے کاغذات موجود تھے۔ اصلی اور جینوئن دستاویزات جنہیں کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

"جب وہ ناامید نہیں تو میں کیوں اتنی دل برداشتہ ہوں۔" سارہ نے مٹر پلاؤ بگھارتے ہوئے اپنا احتساب لیا۔

"محض چند لوگوں کا حوصلہ شکن رویہ میرے حوصلے کیسے توڑ سکتا ہے۔"

سارہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے ایک نئی طاقت مل گئی ہو۔ اسے کسی سے کوئی انعام، کوئی صلہ تو نہیں چاہیے تھا۔ زبانی کلامی ہی سہی وہ سپورٹ بھی نہ ملی۔ پھر بھی مایوسی کی گہری دھند کو خود پہ حاوی نہ کیا۔

"اپنی اداسی اور ناامیدی سے باہر آؤ سارہ سلمان۔" اس نے صحن میں نکل کر ارد گرد پھیلی چمکیلی دھوپ کی نرم گرم حدت کا لطف اٹھایا۔

اس کا بیٹا نانی کی گود میں غوں غاں کر رہا تھا۔ سارہ نے اسے لینے کو ہاتھ بڑھائے تو بچے کی آنکھوں میں جیسے شناسائی کے رنگ ابھرے۔ سارہ کی گود میں ہمک

کر آتے ہوئے اس نے خوشی کی قلقاریاں ماریں۔
سارہ کا دل گہری طمانیت اور خوشی سے بھر گیا۔
"امی، میرا بیٹا مجھے پہچاننے لگا ہے۔"
"ظاہر ہے بچہ اپنی ماں کو نہ پہچانے تو اور کسے پہچانے گا؟ امی نے بہت دنوں بعد سارہ کے چہرے پہ ایسی مسکراہٹ دیکھی تھی۔"
سارہ نے بیٹے کی کچھ تصاویر لے کر سلمان کو بھیج دیں۔ فوراً ہی اس کی کال آ گئی۔
"آج کا ڈنر میرے ساتھ کرو گی؟ ایک ضروری بات کرنی ہے۔"
"کیا بات ہے؟" سارہ چونک پڑی۔
"ملو گی تو بتاؤں گا۔" سلمان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
سلمان کی کال ختم ہو گئی مگر سارہ کی ادھیڑ بن ختم نہ ہوئی۔ سلمان کا غیر معمولی سنجیدہ لہجہ کھٹک رہا تھا۔
اوپر سے تھوڑی دیر میں سمیرا باجی آ گئیں۔ کزن تھیں۔ خاندان بھر کی معلومات ان کے پاس ہوتی تھیں۔ ستم یہ تھا کہ ان کی بتائی ہوئی اکثر اطلاعات اور خبریں درست نکلتی تھیں۔
"تم بڑے مزے سے اپنے میکے میں بیٹھی ہو، کچھ خبر بھی ہے۔ بڑی اماں کیا کرتی پھر رہی ہیں؟" گول مٹول سی سمیرا آپا نے آتے ہی سارہ کو چھاپ لیا۔
"کیا کر رہی ہیں بڑی امی، گل بھابھی کے خلاف مقدمہ لڑ رہی ہیں اور کیا۔"
"گل بھابھی کو تو وہ دیکھتی رہیں گی مگر پہلے تم سے تو نمٹ لیں۔ سلمان نے بتایا نہیں کچھ تمہیں؟"
"کیا؟" سارہ پریشان ہو گئی۔
"سلمان کے لیے لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں۔ بلکہ ایک تو فائنل بھی کر لی۔ سنا ہے سلمان بھی ایگری ہو گیا ہے۔"
ان کی پاٹ دار آواز صحن میں گونج رہی تھی اور سارہ کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو سمیرا؟" امی کا چہرہ فق ہو گیا اور ابو بھی یکدم ہی ہڑبڑا اٹھے۔
"کس نے بتایا تمہیں۔"
"بڑی بی نے خود بتایا ہے۔ سخت غصے میں تھیں کہ سارا کو اتنی عزت دی، محبت دی، مان دیا، کسی کا لحاظ نہیں کیا۔ ایک لمحے میں سب ختم کر کے چلی گئی۔"
سمیرا باجی نے رٹو طوطے کی طرح آموختہ دہرا دیا۔
"اور سلمان؟ سارہ نے اپنے کانپتے دل کو سنبھالنے کی سعی کی۔" ظاہر ہے ساری دنیا جانتی ہے وہ اپنی ماں کا فرماں بردار ہے۔ ورنہ تمہارے پیچھے آ کر تمہیں لے نہ جاتا؟ ارے الگ گھر لے لیتا کہیں، لوگ کرائے پر بھی تو رہتے ہی ہیں۔ سمیرا باجی نے بولنے میں ایک وقفہ لیا اور پھر شروع ہو گئیں۔
"میں نے سنا، میرے دل میں تو پنکھے لگ گئے۔ دوڑی دوڑی یہاں چلی آئی، دیکھو برا مت ماننا۔ تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو تمہاری خیر خواہی میں آئی ہوں۔ تمہیں سمجھانے میاں کو فون کرو اور اپنے گھر چلی جاؤ، لڑکی کا اصل گھر تو وہی ہے جہاں اس کا شوہر ہے۔ کتنا پیسہ خرچ کر کے تمہارے لیے اتنا بڑا اپورشن بنایا۔ اتنا آرام، سہولتیں، اتنی خوشی، محبت، کیا نہیں ملا تمہیں، خوش نصیب ہو، کفران نعمت کرو گی تو پچھتاؤ گی۔"
سمیرا باجی بول بال کر لوازمات کے ساتھ چائے پی کر رخصت ہو گئیں۔ یہاں پورا گھرانہ جیسے آندھیوں کی زد میں تھا۔ سارہ کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی تھی۔ ایک لفظ نہیں کہا گیا اس سے، امی سر تھام کے بیٹھی مدد طلب نگاہوں سے ابو کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
"میں بھابھی جان کے گھر جا کر بات کرتا ہوں۔" ابو کے اوسان بحال ہوئے تو انہوں نے عندیہ دیا۔
"نہیں نہیں کسی کو کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں..... میں خود بات کر لوں گی سلمان سے۔" سارہ نے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیری۔
اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور درا صل وہ یقین کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ سلمان کتنا ہی محبت کرنے والا، پروانہ وار نثار ہونے والا شوہر تھا محبوب تھا مگر تھا تو ایک مرد، پھپھو نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا کہ وہ ذرا عقل سے کام لے۔

مرد کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا سارہ، اکیلا چھوڑنا ہی خطرناک ہے۔ فطرت میں ہرجائی پن ہوتا ہے۔ کہیں اور ٹک گیا تو روتی پھرو گی۔ اور بھابھی جان کو تم کیا سیدھا سمجھتی ہو۔ تم نے جو معاملہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا ہے اس کا بدلہ ضرور لیں گی تم سے۔ اپنے سگے پوتے پوتیوں کو نہیں بخشا تو تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

"سلمان تو ایسے نہیں ہیں پھپھو!" سارہ نے بڑے یقین اور شدومد سے انہیں جھٹلایا تھا۔

"پھر بھی اپنے میاں کو اپنے پلو سے باندھ کر رکھو۔"

سارہ کو پھپھو کی باتیں یاد آرہی تھیں۔

"کیا وہ ٹھیک کہیں میں نے غلط سوچا؟ میرا اعتبار جھوٹ تھا۔" سوچ سوچ کر اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ امی ابو کو اس نے منع کر دیا تھا کہ وہ خود بات کر لے گی مگر خود کی تو ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

موبائل بج رہا تھا سلمان کی کال آرہی تھی۔

ایک، دو، تین، چار وقفے وقفے سے کئی بار فون آیا۔ ہر بار وہ خوف زدہ نگاہوں سے فون بجتا ہوا دیکھتی رہی۔

پانچویں بار بالآخر ہمت کر کے اس نے کال ریسیو کر ہی لی۔

"کہاں ہو؟ کب سے ٹرائی کر رہا ہوں۔" سلمان کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مصروف تھی۔"

"اچھا خیر، میں نے ڈنر کا کہا تھا ریڈی ہو تم؟ پک کرنے آرہا ہوں میں؟"

"میں آج جا نہیں سکتی تمہارے ساتھ۔"

"تو پہلے بتانا تھا نا، مجھے بہت ضروری بات کرنی تھی۔" وہ مزید جھنجلایا۔

"کیا بات ہے؟" ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے سوال کیا۔

"ہے ایک..... امپورٹنٹ بات تم سامنے ہو تیں تو بتاتا، تم ابھی فری نہیں ہو؟ ایسا کیا خاص کام ہے؟"

"تمہیں کیا بات کرنی ہے؟" سارہ نے دوبارہ سوال کیا۔

"فون پہ نہیں بتا سکتا ملو گی تو بتاؤں گا۔"

"اچھا پھر دو، تین روز ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں ٹھہر سکتا، ادھر امی ہیں، ادھر تم، دونوں نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ بیچ میں پس کر رہ گیا ہوں۔" سلمان کی آواز میں جھنجلاہٹ کے ساتھ طیش بھی غالب تھا۔

"ہم بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"پتا نہیں کب کرو گی۔ امی نے جان کھائی ہوئی ہے میری، اور اچھا ٹھیک ہے خدا حافظ۔" سلمان نے اچانک ہی کال آف کر دی۔ سارہ فون کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

"کون بھول سکتا ہے ان سب کو جو ابھی تک ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔"

"آئس کریم ٹرک میں رکھے معصوم پھولوں کے جسد خاکی، کون فراموش کرے گا انہیں۔"

وہ گھنگھریالے بالوں والا یوسف، جسے ہسپتال میں ڈاکٹر باپ نے شناخت کیا اور جو آٹھ برس کی دعاؤں اور انتظار کے بعد دنیا میں آیا تھا۔

وہ بارہ سالہ ٹاکر جس کی تمنا تھی ایک لاکھ سبسکرائبرز کی اور اس کی شہادت کے بعد اس کے سبسکرائبرز دس لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئے۔

وہ بہادر بچہ جس نے بے ہوش یا سن کیے بغیر اپنے زخموں پہ ٹانکے لگوائے اور مسلسل تلاوت کرتا رہا۔

وہ تمام صحافی، رپورٹرز، کیمرہ مین جو اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران اسرائیلی جنگی جنون کا نشانہ بنے۔

تمام ہسپتالوں کا عملہ جو بمباری سے کھنڈر بنے شفاخانوں میں بھی اپنا کام کرتے رہے اور آخری سانس تک وہیں موجود رہے اپنے وعدوں اور ارادوں کو پورا کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

پناہ گزین کیمپوں میں صابرہ، شتیلا کیمپوں کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

فلسطین کے شاعر بھی، ادیب بھی، مصور بھی،

ڈاکٹرز، اساتذہ، مزدور بھی۔

سب ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہو رہے ہیں۔

انکیوبیٹرز میں رکھے بچے باقیات بن گئے۔ جان و مال کا خوف، بھوک، موسم کی شدت سب کچھ ختم ہو جانے کا درد، اپنی زمین، اپنے گھر سے جبری بے دخلی، سب کچھ ہے مگر ان کا صبر، توکل، حوصلہ اور دلیری، تاریخ کے صفحات پر سب رقم ہو رہا ہے اور ہوگا۔ سپیدہ سحر نمودار ہوا مگر سارہ کی آنکھیں پہلے ہی کھل چکی تھیں۔ وہ کب سے بیدار تھی۔ نماز، دعائیں، سب سے فارغ ہو کر پھر انہی سوچوں نے گھیراؤ کر لیا۔

زندگی بے مہر ہے، بے درد ہے۔

انسان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سب نہیں مگر بعض کتنا خوش نصیب خیال کرتی تھی وہ خود کو، مگر اب ایسا لگ رہا تھا جیسے منہ کے بل زمین پر آ گری ہو۔

زندگی یکایک کیسے بدل جاتی ہے؟

سارہ نے شال لپیٹی اور کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔

"میرا کیا قصور ہے؟ کسی ظلم اور زیادتی کی نشاندہی کرنا اتنا بڑا جرم بن گیا۔"

وہ خود سے مخاطب تھی اور اپنے آپ سے سوال جواب کر رہی تھی۔ مگر کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

دن کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ گلی سے مختلف ٹھیلے والوں کی آوازیں وقفے وقفے سے آ رہی تھیں۔ باورچی خانوں سے اٹھنے والی خوشبوئیں فضا میں پھیل کر ادھر ادھر بکھر رہی تھیں۔

سارہ نے اپنے بال گول مول لپیٹے اور شال اوڑھ کر نیچے آ گئی۔ امی کچن میں ناشتہ بنا رہی تھیں۔ اس کی آہٹ پر مڑیں۔

"لائیں امی! میں بنا دیتی ہوں پراٹھے۔" سارہ نے سنک سے ہاتھ دھوئے۔

"سلمان سے بات ہوئی تمہاری؟"

"ہمت ہی نہیں ہوئی، کچھ پوچھنے کی۔" سارہ نے ماں کے آگے سچ بیان کیا۔

"جب تک بات نہیں کرو گی تو پتا کیسے چلے گا کہ معاملہ کیا ہے۔ سمیرا نے ایسی خبر سنائی کہ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی، سلمان پر یقین بھی ہے مگر بھابھی جان سے کچھ بعید نہیں۔" امی نے پیڑا بناتے بناتے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"میرا بھی یہی حال ہے۔" سارہ نے پیڑا بیل کر اندر گھی لگایا اور اسے فولڈ کرنے لگی۔

"اس سے ملو اور بات کرو کیا کہتا ہے۔" امی نے نصیحت کی۔

"جی!" سارہ کا دل سہما ہوا تھا مگر۔

مگر بات کرنی تو ضروری تھی۔ صبح کا سورج دوپہر میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکا اور سہ پہر ہوتے ہوتے اس کی حدت اور شدت میں کمی آنے لگی۔ شام میں تھوڑی تھوڑی ٹھنڈی ہوا شرماتی لجاتی آئی۔

کراچی آ کر ان ہواؤں کو جانے کیا ہو جاتا ہے۔"

اے سی چلا کر کمبل اوڑھ لیتا ہوں۔ جیکٹ پہن کر باہر نکلتا ہوں پھر سارہ وقت جیکٹ گاڑی میں رہتی ہے اور میں گاڑی سے باہر بڑے شوق سے سوپ پیتا ہوں۔ فرائی فش کھاتا ہوں۔ پھر آئس کریم کے مزے بھی لیتا ہوں۔"

بلا تکان بولتے بولتے سلمان نے اسے دیکھا۔ اور گاڑی کی رفتار ذرا تیز کی۔

"تم سن رہی ہو میری باتیں؟"

"ہاں......!" سارہ چونک پڑی۔

"اچھا، بتاؤ، میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"میرا امتحان مت لو سلمان۔" سارہ کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

"کیا ہوا؟" وہ چونک پڑا۔

"سمیرا آپا آئی تھیں۔ وہ کچھ بتا رہی تھیں کہ۔"

سمیرا باجی پہنچ گئیں۔ "تمہارے گھر، بھانڈا پھوڑ دیا۔ انہوں نے بہت ہی ہلکے پیٹ کی ہیں۔ کوئی راز رکھ نہیں سکتیں کسی کا۔" سارہ کی پوری بات سنے بغیر سلمان شروع ہو گیا۔

"کیا وہ سچ ہے جو وہ کہہ رہی تھیں؟" سارہ نے اس ستمگر کو دیکھا جو بہت پرسکون لگ رہا تھا۔

"ہاں بھئی، سچ ہے اب فیصلہ تو کرنا ہی تھا آ رہا

پار۔ بس میں نے فیصلہ کر ہی لیا۔" سلمان نے بڑی احتیاط سے ایک موڑ کاٹا۔

"اتنی آسانی سے تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟" سارہ کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔

"فیصلہ کرنا تو تھا بس جو مجھے ٹھیک لگا۔ میں نے فیصلہ لے لیا۔" سلمان کا اطمینان قابل دید تھا سارہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم نے اپنے بیٹے کا بھی نہیں سوچا، اس کا کیا ہوگا؟" سارہ کی آواز بھرا گئی۔ آنسو تھے کہ پلکوں کی باڑ توڑ کر بس بہنے کے منتظر تھے۔

"بیٹے کا کیا..... مطلب؟"

سلمان نے ڈرائیو کرتے کرتے ایک نظر بیوی پر ڈالی اور یکدم ہی اس کا پیر بریک پہ پڑا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" سلمان انتہائی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کے آنسو بے قابو ہو کر تمام چہرہ بھگو رہے تھے۔

"تم دوسری شادی کرو گے تو کیا مجھے رونا نہیں آئے گا؟"

"میری دوسری شادی؟" سلمان نے اس کا فقرہ دہرایا اور فوراً ہی کسی نتیجے پہ پہنچ گیا۔

"سمیرا باجی نے بتایا ہوگا۔ ہے نا۔"

"ہاں اور میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کیسے تائی امی کی بات مان گئے۔ آپ کو میرا ذرا خیال نہیں آیا؟ کتنا بھروسا تھا مجھے آپ پہ کتنا اعتبار سب ختم کر دیا۔" سارہ بری طرح رو رہی تھی۔

سلمان چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔

"ایک بات بتاؤ۔ جس شوہر کو دوسری شادی کرنی ہو وہ اپنی بیوی سے اسکائپ پر گھنٹوں باتیں کیوں کرے گا؟ کیوں اس کی منتیں کرے گا گھر واپس آنے کے لیے، بیوی کی شکل دیکھے بغیر جسے نیند نہیں آتی، وہ دوسری شادی کا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ بچے کا خیال تو بعد میں آئے گا۔ پہلے تو اپنی محبوب بیوی کا خیال آئے گا ایسی کسی حرکت کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی۔"

سلمان نے اس کے چہرے سے آنسو صاف کیے۔

"میں سمجھتا تھا کہ محبت میں ایک میں ہی بے وقوف ہوں خبر نہیں تھی کہ تم مجھ سے بھی بڑی بے وقوف ہو۔" سلمان نے اس کی ناک پکڑ کر ہلائی۔

"تو پھر سمیرا باجی؟"

"کرائے کا یہ گھر لیا ہے۔ تمہارے لیے۔ وہ نہیں بتایا انہوں نے فضول باتیں کر کے چلی آئیں۔ کل ڈنر کے بہانے سے گھر دکھانا تھا تم نہیں آئیں۔ آج ہاتھ لگی ہو۔" سلمان مسکرایا۔

"ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اتنا بے اعتبار اور ناقابل بھروسا ہوں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں دراصل بہت ڈر گئی تھی۔" سارہ محجوب ہو گئی۔

سلمان نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی۔

"چلو ایک بات تو پتا چلی آج۔"

"کیا؟"

"میری بیوی کو کتنی محبت ہے مجھ سے، بس اظہار کرنے میں تنجوس ہے۔"

"اظہار کرنا ضروری تو نہیں۔"

"ہاں جی ایسی بیوی کے لیے ضروری نہیں، جو کٹھور ہو، سنگ دل ہو اور ظالم بھی۔"

"میں یہ سب ہوں۔" سارہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ہاں ہو تو مگر پھر بھی مجھے پیاری ہو۔" سلمان ڈرائیو کرتے ہوئے حرے سے ہنس رہا تھا اور اسے گھورتے گھورتے سارہ بھی ہنس پڑی۔

کھڑکی کا پردہ سرکا کر سارہ نے باہر کا جائزہ لیا۔ بڑی خوب صورت نکھری نکھری اجلی سی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نئے گھر میں آج انہیں ایک ماہ ہو گیا تھا۔ اپنے شوہر اور بچے کے ہمراہ اگرچہ وہ خوش تھی مگر اس خوشی کے ساتھ ساتھ ایک کسک، ایک چبھن تھی جو اس کی خوشی کو جیسے کھائے جا رہی تھی۔

سلمان کو متفکر اور پریشان دیکھتی تو اس کی مسرت و شادمانی پہ اوس پڑ جاتی۔ مقدمہ ابھی عدالت

میں چل رہا تھا۔ واضح اور مضبوط ثبوت ہونے کے باوجود فیصلے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ جو پاکستان کے عدالتی نظام کا خاصا ہے۔ مگر زمینی عدالتوں کے علاوہ فیصلے ایک اور عدالت میں بھی ہوتے ہیں جہاں صرف اور صرف عدل وانصاف ہی ہوتا ہے۔

سلمان ایک روز دوپہر میں ہی گھر آ گیا۔ سارہ اپنے لیے روٹی بنا رہی تھی۔ سلمان کے یوں بے وقت آنے پر حیران ہوئی اور اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑی جہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"سب خیریت تو ہے؟" سارہ نے پانی کا گلاس اسے دیا جو ایک گھونٹ پی کر اس نے ایک طرف رکھ دیا۔

"بھائی جان کا فون آیا تھا، امی کو فالج کا اٹیک ہوا ہے وہ ہاسپٹل میں ہیں۔" سلمان کا چہرہ حزن وملال کی تصویر بن گیا۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ سارہ جانتی تھی۔

"ہم ابھی ہاسپٹل چلتے ہیں تم پریشان مت ہو۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" سارہ نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم پہلے کھانا کھالو۔"

"نہیں۔ اب مجھ سے کچھ بھی نہیں کھایا جائے گا۔" سارہ کی نرم آواز میں رنج گھل گیا۔

بچے کو اپنی امی کے انتہائی چھوڑ کر وہ دونوں ہاسپٹل پہنچے جہاں تائی امی انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھیں۔ فالج کا حملہ شدید تھا۔ ان کا آدھا دھڑ مکمل ناکارہ ہو گیا تھا۔ جان بچ گئی تھی مگر پہلے جیسی صحت اب ناممکنات میں سے تھی۔ ہفتہ دس دن اسپتال میں رہ کر ان کی چھٹی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سارہ نے کئی ماہ بعد آج اس گھر میں قدم رکھے تھے جہاں واپس نہ آنے کا ارادہ کر کے وہ یہاں سے نکلی تھی۔ مگر آج یہاں آنا اس کی مجبوری تھی، گھر کے لان، لاؤنج اور کمروں میں ہر جگہ ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سارہ کے بعد دو بہوویں ان کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ وہ بھی جا چکی تھیں۔ تائی کی حالت دیکھ کر سب ہی توبہ تلا کر رہے تھے اور عبرت پکڑ رہے تھے۔

سارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ جہاں خاموشی ناگوار بو اور تاریکی کا راج تھا۔ اس نے لائٹ جلائی اور تائی کی حالت دیکھ کر لرز گئی۔ ہمیشہ نک سک سے تیار، نفاست پسند وہ عورت اپنی ہی گندگی میں لتھڑی بستر پر پڑی تھی۔ بے بسی لاچاری اور عبرت کی جیتی جاگتی تصویر۔

سارہ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ وہ آنکھیں جو اس گھر کی طرح ویران اور سنسان ہو رہی تھیں۔

"میں آپ کو لینے آئی ہوں، آپ ہمیشہ کہتی تھیں نا کہ آپ میرے اور سلمان کے ساتھ رہیں گی۔"

سارہ نے جھک کر نرمی سے ان کے بال سنوارے۔ وہ گناہ گار تھیں، خطا کار تھیں، جتنی بڑی تھیں۔ یہ ان کا اور اللہ کا معاملہ تھا۔ سارہ کے لیے وہ آج بھی ماں جیسی محترم تھیں۔ جنہیں اس حال میں دیکھنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

جس گھر پر وہ راج کرتی تھیں آج اسی کے ایک تاریک کمرے میں لاچاری کا نمونہ بن کر پڑی تھیں۔ اس کمرے کے بعد اگلی منزل دوگز کی جگہ تھی جو ہر ذی روح کا مقدر ہے۔

تائی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انسان کی صرف زبان ہی تو نہیں بولتی، اس کا چہرہ، آنکھیں، آنسو بھی بات کرتے ہیں۔ تائی کی زبان خاموش تھی مگر ان کا چہرہ، آنکھیں اور آنسو چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ قدرت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے وہ ندامت کے سمندر میں غوطہ زن تھیں۔

اس گھر میں اسی کو آنا تھا جو اس کا اصل مالک تھا یعنی گل اور اس کے بچے اور رہیں تائی امی تو وہ اپنے بیٹے بہو کے گھر جا رہی تھیں۔ جہاں سے محبت کرنے والے بیٹا اور بہو ان کی زندگی کے بقایا دنوں کو آسودہ اور پرسکون بنانے والے تھے۔

☆☆

مَلیا سمیعون

بات کا بتنگڑ

وہ سیل فون ہاتھ میں تھامے نجانے کب سے استغراق کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ اقرا نے ان کا شانہ پکڑ کر جھنجوڑا تو وہ ہوش میں آئیں۔

"مجھے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔"

خضرا کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تو وہ نئے سرے سے مضطرب ہو گئیں۔ خضرا نے یہ سب کیوں کہا؟ کیا وہ کوئٹہ والی حسینہ پھر سے ٹپک پڑی ہے؟ اس کی ساس نے کوئی نیا شوشا چھوڑا ہے یا پھر کوئی اور مظلوم کہانی...... سوچ سوچ کر ان کا دماغ شل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

خضرا ان کی بڑی بیٹی، پچھلے چند سالوں سے روایتی سسرال کی چکی میں پس رہی تھی۔ سخت گیر ساس اور سر پھری نند نے اسے بہت ٹف ٹائم دیا تھا۔ خضرا کا فوجی میاں ولید کوئٹہ میں تعینات تھا۔ وہ اپنی ماں کے اشاروں پہ چلتا تھا۔ چند ماہ قبل کوئٹہ کی کسی لڑکی سے اس کا افیئر سننے میں آیا تھا۔ بہرکیف وہ معاملہ بھی جلد ہی رفع دفع ہو گیا تھا۔ حال ہی میں خضرا کے میاں ولید نے کوئٹہ میں بیوی بچوں کے لیے کوارٹر لیا تھا۔ اور ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود زندگی میں پہلی بار، اپنی من مانی کر کے بیوی بچوں کو چند ماہ کے لیے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو وہ خوشی خوشی عازم سفر ہوئی تھی، پھر وہاں اچانک کیا افتاد آن پڑی کہ وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگی ہے۔

☆☆☆

"اقرا! مجھے سر درد کی گولی دے دو۔ پھر سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" فرحانہ نے کنپٹی مسلتے ہوئے چھوٹی بیٹی کو پکارا۔

"امی! آپ پہلے کھانا کھا لیں پھر میں آپ کو پین کلر دے دوں گی۔ ایسے خالی پیٹ میڈیسن مت لیا کریں۔"

"خضرا کا فون سنتے ہی میری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے۔ اس کی ساس کو بھی چھوٹی سی بات پر بکھیڑے ڈالنے کی عادت ہے۔"

"آپ کو ان سے پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ ان کو بھی ادھوری خبریں سنا کر کال کاٹنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔" اقرا نے بیزاری سے کہہ کر اگلا جملہ دل میں سوچا۔

"ہم بات کر رہے تھے کہ کال کٹ گئی۔ بعد میں میں نے اتنی کالز کیں مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید سروس پرابلم ہے۔ پتا نہیں میری بچی کس حال میں ہو گی۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اقرا نے خضرا کو بارہا سمجھایا تھا کہ اپنے گھر کی ہر چھوٹی بڑی بات امی کو مت بتایا کرو۔ ان کو گھٹنوں بیٹھ کر کڑھنے اور پھر اپنی طبیعت خراب کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے مگر خضرا جب بھی اپنی ساس کے زیر عتاب آتی۔ اگر نہ بھی آتی تو بھی فوراً فون کھڑکا دیتی۔

"آج سالن میں نمک تیز ہو گیا ہے کیا کروں؟"

"آج بریانی بنائی ہے چاول چپک گئے ہیں۔ میری ڈانٹ پکی۔"

"ان کے کپڑوں سے پہ ضدی داغ صاف نہیں ہو رہے۔" "اوہو آپی! آپ امی کو کیوں پریشان کرتی ہیں۔ گوگل پہ سرچ کر لیا کریں۔" اقرا عاجز آ جاتی۔

"ہمارے گھر گوگل نہیں ہے۔" وہ معصومیت سے آگاہ کرتی۔

اقرا فوراً سرچ کر کے اسے نت نئے ٹوٹکوں سے مستفید کرتی۔ مانا کہ اس کی ساس مزاج کی ذرا تیز تھیں مگر اس نے بھی ساس کو ہوا ہی بنا لیا تھا۔

☆☆☆

pklibrary.com

"اقرا جلدی آؤ۔" وہ برتن سمیٹ کر کچن میں گئی تو امی کے پکارنے پر سرعت سے پلٹی۔

"میرا دل بیٹھا جا رہا ہے مجھے پانی پلاؤ۔" زرد چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسی وقت ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

"تمہارے ابو کی کال ہے۔" انہوں نے پانی پیتے ہوئے مطلع کیا۔

"اب پلیز ابو کو کچھ مت بتایئے گا۔" اقرا کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے چھوٹتے ہی خضرا والی بات بتا دی۔ وہ بات جس کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔

"اب ان کو الگ پریشانی ہو گی۔" اقرا کو کوفت ہونے لگی۔

ڈور بیل کی آواز پر اقرا اٹھ کر باہر چلی گئی۔

فراست ماموں نے اس بار بہت دنوں بعد چکر لگایا تھا۔ امی اب انہیں پوری کتھا سنا رہی تھیں۔ درحقیقت خضرا کا رشتہ عنبرین ممانی نے ہی کروایا تھا۔ ان دنوں امی کی ایک دوست اپنے سائیکاٹرسٹ بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں وہ رشتہ سب کو پسند تھا رسماً سوچنے کی مہلت مانگی گئی مگر اچانک ہی عنبرین ممانی ولید کا رشتہ لے کر ٹپک پڑیں۔ ابو کو آرمی کے جوان بہت پسند تھے۔ انہوں نے خضرا کو یاہنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اب امی کو سارے فساد کی جڑ عنبرین ممانی ہی نظر آئی تھیں۔

ماموں تو سدا کے کانوں کے کچے تھے امی کی باتوں میں آ کر ممانی سے شاکی رہتے۔

"میں جاتے ہی عنبرین سے بات کروں گا کہ وہ خضرا کی ساس سے صاف صاف بات کرے کہ آخر اسے خضرا کا سکون کیوں کھٹک رہا ہے۔" ماموں گھر سے نکلتے ہوئے مشتعل تھے۔

"امی! پہلے آپ خضرا آپی سے بات کر کے پوچھ تو لیتیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں کہ نیٹ ورک پرابلم ہے، رابطہ نہیں ہو رہا۔ وہاں میری بچی خدا جانے کس حال میں ہو گی۔ یہاں میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے تو نہیں بیٹھ سکتی۔" ان کا لہجہ خود بخود تیکھا ہو گیا۔

پھر سارا دن ان کا موڈ خراب ہی رہا۔ اقرا معمول کے کاموں میں مصروف رہی۔ رات کا کھانا بھی بوجھل ماحول میں کھایا گیا۔ رات سونے کے لیے لیٹی تو خضرا کی کال آ گئی۔ اس نے اسپیکر آن کر کے موبائل امی کو تھما دیا۔

"سفر کی وجہ سے طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سارا دن وومیٹنگ ہوتی رہی۔ یہاں پانی کا بھی بہت مسئلہ ہے۔ پینے کے لیے صاف پانی کا حصول بہت مشکل ہے۔ ان ہی پریشانیوں کی وجہ سے میں نے آپ کے سامنے سوچے سمجھے بغیر وہ سب کہہ دیا تھا۔"

سلام دعا کے بعد امی نے چھوٹتے ہی وہ بات پوچھی جس نے صبح سے ان کا سکون غارت کر رکھا تھا۔ خضرا کے جواب نے انہیں مطمئن کر دیا۔ مگر خضرا کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ اس کی بات ابھی جاری تھی۔

"آج عنبرین ممانی نے میری ساس کو کال کر کے سخت سست سنائیں۔ پھر آنٹی نے ولید کے نمبر پر کال کر کے جو کچھ کہا میں تو ولید سے نظریں نہیں ملا پا رہی۔ میری چھوٹی سی بات کو آپ نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ اب تو ان سب کو لگنے لگا ہے کہ میں میکے سے ٹینشن لیتی ہوں۔ ان سب کے سامنے آپ کا اور میرا امیج بری طرح ڈیمیج ہوا ہے۔"

خضرا کی باتیں سن کر ان کا بی پی ہائی ہونے لگا۔ "یہ مجھ سے کیا حماقت سرزد ہو گئی۔" وہ سخت پشیمان تھیں۔ اقرا تاسف سے انہیں دیکھنے لگی۔

تصدیق و تحقیق کے بنا کسی بات کو آگے پھیلانا انسان کو خفت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اب ماں بیٹی سر جوڑ کر مسئلے کا حل سوچ رہی تھیں کہ خضرا کی ساس کو کیسے رام کیا جائے۔

☆☆

pklibrary.com

عیشہ حسین

ساحلی الجھن

ناولٹ

"تمہاری اسائنمنٹ تم گھر بھول آئے تھے۔" ریان کھچا کھچ بھری کلاس کے وسط سے گزرتا ایک ڈیسک کے پاس رکا تھا اور پٹی لگے ہاتھ سے اسائنمنٹ ساحر فاروق کے سامنے رکھی تھی۔ اس نے چونک کر نا بھی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا لیکن ریان آگے بڑھ گیا تھا۔

ساحر نے اسائنمنٹ الٹ پلٹ کر دیکھی تھی اور اٹھنے ہی والا تھا کہ پروفیسر کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ وہ واپس بیٹھا اور گردن موڑ کر پیچھے بیٹھے ریان کو دیکھا جو مسکرا کر ساتھ بیٹھے لڑکے سے کوئی بات کر رہا تھا۔

(اسے تو بعد میں دیکھوں گا!) پروفیسر کو دیکھتے ساحر نے دانت کچکچائے تھے۔

"تو نے تو کہا تھا تجھے بخار ہے اس لیے تو نے اسائنمنٹ نہیں بنائی۔" اس کے دوست نے ایک رنجیدہ سی نظر اس کے سامنے پڑی اسائنمنٹ پر ڈالی تھی اور دوسری سامنے کھڑے پروفیسر پر۔

"اس وقت نہیں بنائی تھی۔ بعد میں بخار اترا تو بنالی۔" ساحر سنجیدہ سا سامنے دیکھتا اعتماد سے بولا تھا۔ اس کے دوست نے اسائنمنٹ اپنی جانب کھسکائی تھی اور صفحات الٹ پلٹ کے دیکھے تھے۔

"جا یار یہ تو تمہیں بنا سکتا۔" اس کے دوست نے تمسخرانہ نظروں سے اسائنمنٹ کو دیکھا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں بنا سکتا؟" ساحر نے اسائنمنٹ جھپٹی تھی۔

"یہ کہانیاں ریان کی لکھی ہوئی ہیں۔ یار! اللہ تیرے بھائی جیسا بھائی سب کو دے۔" اس کا دوست ٹھنڈی آہ بھر کر بولا تھا۔

"سوتیلا بھائی۔" ساحر سنجیدگی سے سامنے دیکھتا بولا تھا۔

اسائنمنٹس کلیکٹ ہوئیں۔ لیکچر ہوا تھا اور بالآخر پروفیسر نے جان چھوڑ دی تھی۔ کلاس میں افراتفری پھیلی تھی۔ کچھ لوگ باتوں میں مشغول تھے۔ کچھ کلاس سے باہر جا رہے تھے اور کچھ پروفیسر کی سنگدلی پر اسے کوس رہے تھے۔ ایسے میں ساحر اٹھ کر آخری ڈیسک تک آیا تھا۔

"مجھے تمہاری اسائنمنٹ کی ضرورت نہیں۔" اس نے بیگ میں کتابیں ڈالتے ریان کو دیکھا تھا۔

"کیا میں نے تم سے کہا ہے کہ تمہیں ضرورت تھی؟" زپ بند کرتے ریان نے سادگی سے اسے دیکھا تھا۔

"ویسے ہاتھ تو تمہارے خالی ہیں۔ مجھے لگا اسائنمنٹ میرے منہ پر مارنے آئے ہو؟"

"اب زہر سے مرتے آدمی کو تریاق دو گے تو وہ بیچارا کیا کرے گا؟" ساحر نے ڈھٹائی سے کندھے اچکائے تھے۔

"پر جب آدمی بچ جائے تو اسے یہ تو نہیں کہنا چاہیے کہ اسے تریاق کی ضرورت نہیں تھی۔" ریان نے اسی کے انداز میں کندھے اچکائے تھے۔

"زہر دینے والے تریاق دیں تو یہ کہنا پڑتا ہے۔" ساحر نظروں میں طنز لیے بولا تھا۔

"پچھلی دو اسائنمنٹس تم نے بنائی نہیں۔

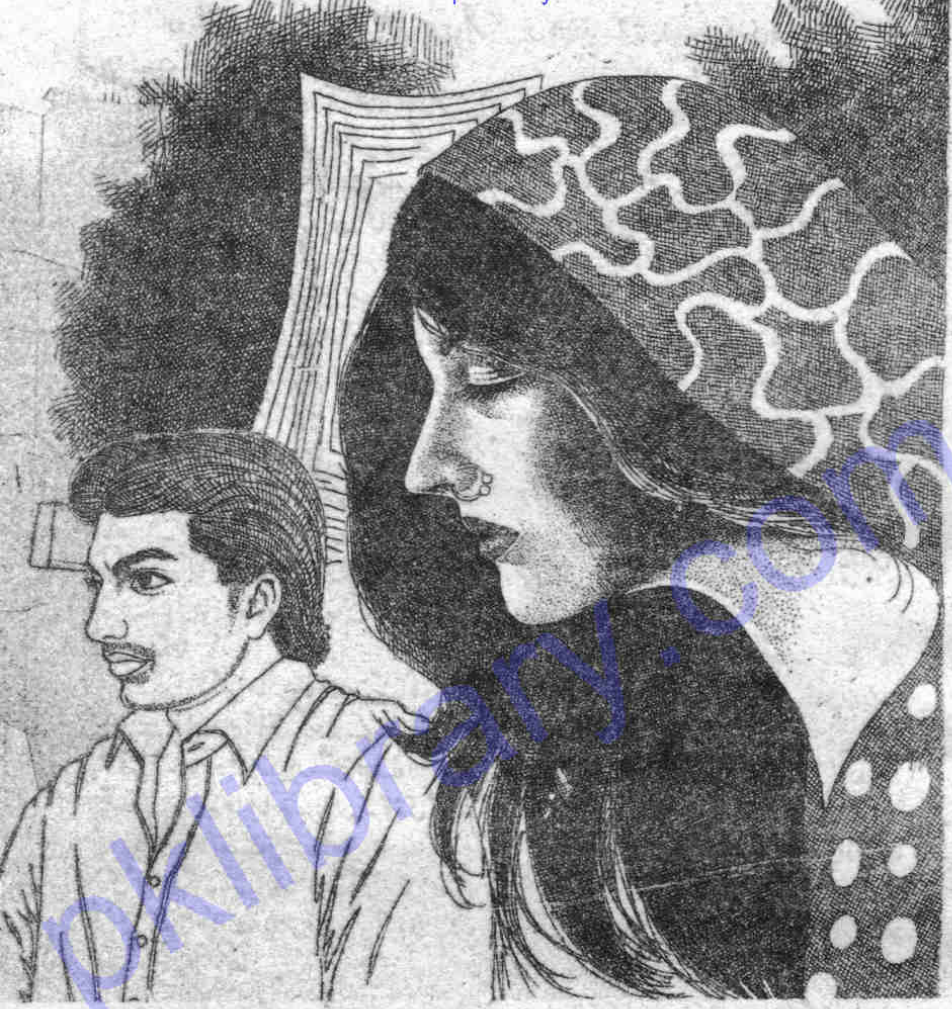

پریزنٹیشن بھی کچھ خاص نہیں تھی اور ٹیسٹ اور پراجیکٹس تو اللہ کی پناہ اور کہہ رہے ہو کہ ضرورت نہیں تھی۔'' ریان بیگ کندھوں پر پہنتا کھڑا ہوا تھا۔

''جاسوسی کرتے ہو میری؟'' ساحر نے آنکھیں سکیڑ کے اسے دیکھا تھا۔

''کلاس میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو؟'' ریان نے کندھے اچکائے تھے۔

''یہ آئے دن مزید احسانات مت کیا کرو۔ پہلے ہی بہت احسانات ہیں تمہارے۔'' ساحر کے لہجے میں کڑواہٹ گھلی تھی۔

''تمہیں نہیں لگتا تمہیں جانا چاہیے۔ تمہارے دوست انتظار کر رہے ہیں۔'' ریان نے اس کی بات نظر انداز کی تھی اور دروازے کے پاس کھڑے اس کے دوستوں کی طرف ابرو سے اشارہ کیا تھا۔

''یہ چوٹ کیسے آئی؟'' ساحر اس کے ہاتھ پر لگی پٹی کو دیکھتا بولا تھا۔

"اوہ پلیز اب یہ مت کہنا کہ تمہیں میری فکر ہو رہی ہے۔"

"فکر اور تمہاری؟" وہ ہنسا تھا۔ "میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں تمہاری ماں کو یہ نہ لگے کہ میں نے تمہاری دھلائی کی ہے۔ فکر تو مجھے تمہارے مرنے کی بھی نہ ہو۔" وہ آنکھوں میں تلخی اور چہرے پر مسکراہٹ لیے بولا تھا۔

"بہت اچھے۔ مجھے یہی امید تھی۔" ریان لنگڑاتا ہوا سائیڈ سے نکلا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے اگلی کلاس کے لیے دیر ہو رہی تھی اور یہ گھر کے لڑائی جھگڑے تو کبھی ختم نہیں ہوتے تھے۔

☆☆☆

آخری لیکچر ختم ہوا تھا۔ ریان کتابیں سمیٹ رہا تھا جب اس کا موبائل وائبریٹ ہوا۔ اس نے موبائل آن کیا ساحر کا میسج تھا۔ (پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس باہر آجاؤ ورنہ قید خانے میں لوکل سے جانا پڑے گا)

ریان نے گہرا سانس لیا تھا اور بیگ پہن کے تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا تھا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جھکا اور ہانپتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ اور سیدھا ہوا تھا۔ وہاں نہ گاڑی تھی نہ ساحر، ریان کے کندھے ڈھلکے تھے اور چہرے پہ تھکن اتری تھی۔ ٹانگ میں الگ تکلیف تھی۔ تیزی سے چل کر آنے کی وجہ سے درد مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ سڑک پہ ایک جانب مڑ گیا تھا۔

یہ ہر روز کا تماشا تھا۔ اس کا رخ اب لائبریری کی جانب تھا۔ ویسے بھی اتنی جلدی قید خانے میں جانے کا اس کا دل نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھی ساحر کی طرح گھر کو قید خانہ کہہ دیا کرتا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں تم دونوں کو ایک ایک گاڑی لے دوں۔" فاروقی ریموٹ سے چینل بدلتے بولے تھے۔ ایک طرف صوفے پر بیٹھے ریان نے سر اٹھایا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ڈیڈ، ہم ایک ہی کالج جاتے ہیں ایک ہی گاڑی کافی ہوگی۔"

"آر یو شیور؟" وہ گردن موڑ کے اسے دیکھتے بولے تھے۔ ریان پھیکا سا مسکرایا تھا اور سر ہلایا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ساحر؟" فاروق نے دوسری طرف بیٹھے ساحر کو مخاطب کیا تھا جو ٹانگوں کی قینچی بنا کر میز پر رکھے فون پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ اس نے جھکا سر اٹھایا تھا اور ریان کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آف کورس ڈیڈ! ریان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک ہی گاڑی ٹھیک ہے۔" وہ بھرپور مسکرایا تھا۔ فاروق مسکرائے تھے اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگے تھے اور ریان کی نظر کچن کے دروازے میں کھڑی شبنم پر پڑی وہ ملامتی نظروں سے اسے دیکھ رہی۔ ریان نے سادگی سے انہیں دیکھا تھا اور سر موبائل پر جھکا دیا تھا۔ شرٹ کی جیب میں پڑا اس کا فون تھرتھرایا تھا اور وہ حال میں لوٹا تھا۔

جیب سے فون نکال کر دیکھا تھا سامنے "مام کالنگ" لکھا تھا ریان نے گہری سانس لی تھی اور فون کان سے لگایا تھا۔

"کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟" وہ ضبط سے بولی تھیں۔

"لائبریری میں کام تھا اس لیے تھوڑی دیر تک آؤں گا۔"

ریان نے آنکھیں بند کیں اور دو انگلیوں سے کنپٹی دبائی تھی۔

"لائبریری میں کام تھا یا وہ آج پھر جان بوجھ کے تمہیں چھوڑ آیا ہے؟" شبنم سخت لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ ساحر جب ایسا کوئی کام کرتا تھا تو جان بوجھ کہ سیدھا گھر جاتا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مام!" وہ نرمی سے بولا تھا۔

"شرم نہیں آتی ماں سے جھوٹ بولتے ہوئے؟"

"آپ کہتی ہیں تو میں میسج کا اسکرین شاٹ

pklibrary.com

لے کے بھیج دیتا ہوں اس نے مجھے میسج کیا تھا میں ہی نہیں آیا۔'' ریان ڈھٹائی سے اپنی بات پہ قائم رہا تھا۔

''خالدہ بتا رہی تھی کہ وہ تمہیں صبح بھی ساتھ لے کے نہیں گیا۔'' وہ غصے میں تھیں۔

''مجھے نوٹس کاپی کروانے تھے اور.....''

''بس کرو کہانیاں سنانا'' شبنم نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''مجھے نہیں پتا مام! آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔'' وہ دو انگلیوں سے کنپٹی دباتا بے زار سا بولا تھا۔

''یہ سارا مسئلہ جنم ہی نہ لیتا اگر تم گاڑی لینے کے لیے مان جاتے۔'' وہ زچ ہوئی تھیں۔

''یہ سارا مسئلہ جنم ہی نہ لیتا اگر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔'' ریان ان ہی کے لہجے میں بولا تھا۔

''میری غلطی؟ اگر تم گاڑی کے لیے مان جاتے تو آج ایسے ذلیل نہ ہو رہے ہوتے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی تھیں۔

''مام اس بات کو اب یہاں گھسیٹ کے لانے کا فائدہ؟''

''آج آنے دو فاروقی کو میں بات کرتی ہوں۔''

''مام پلیز!'' وہ زچ ہوا تھا۔ ''گھر میں تماشا مت لگایئے گا میں نے کہا نا میں اپنی مرضی سے نہیں گیا اس کے ساتھ۔''

''یہ بات ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم گھر آجاؤ اور یہ بتاؤ کچھ کھایا ہے تم نے؟'' وہ بات بدل گئی تھیں۔

''جی لنچ کر چکا ہوں۔ تھوڑی دیر تک آجاؤں گا۔ ابھی فون رکھتا ہوں لائبریری میں بیٹھا ہوں۔''

''جلدی آنا، اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' ریان نے موبائل بے دلی سے سامنے میز پر رکھا تھا اور سر میز پر جھکا دیا تھا۔ اتنے سالوں کی پریکٹس کے بعد اب وہ مام سے جھوٹ بولنے میں ماہر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ساحر لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا ساتھ ساتھ سیب کھا رہا تھا۔ اسے آج ریان کے واپس آنے کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ اتنے میں ریان دروازہ دھکیل کے اندر داخل ہوا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی تھیں اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔ ساحر پلٹا اور دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

''بڑی دیر لگا دی تم نے قید خانے میں واپس آنے میں، قوانین سے اچھی طرح آگاہ ہو تم اور پھر ویسے بھی قید خانے کے اصولوں کی پاسداری کرنا ہر ذمہ دار قیدی کا فرض ہے۔'' وہ محظوظ سا بولا تھا۔

''مجھے کال کر دیتے میرے بھائی میں لینے آجاتا۔''

ریان نے اسے نظر انداز کیا تھا اور آگے بڑھ گیا۔ تب ہی شبنم کچن سے باہر آئیں اور اسے لنگڑا کے چلتا دیکھ کہ متفکر سی اس تک آئی تھیں اور ہاتھ پر بندھی پٹی نے ان کی اذیت میں اضافہ کیا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' وہ اس کا پٹی بندھا ہاتھ ہاتھ میں لے کر بولی تھیں۔

''کچھ نہیں بس وہ ایک بائیک سے ٹکر ہو گئی تھی۔'' اس نے ہاتھ دھیرے سے واپس کھینچا تھا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی مام سے جھوٹ بولتے ہوئے۔ جانتے بھی ہو کہ مام سے جھوٹ بولنے کی سزا ڈیڈ کی عدالت میں پیشی ہے۔'' ساحر لہجے میں مصنوعی تاسف لیے بولا تھا۔

''مام آپ کو اسے لوکل سے آنا جانا سکھانا چاہیے تھا۔ یہ بس کی چھت پہ چڑھتے ہوئے گرا ہے۔'' ساحر شبنم کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ ''تم کیب کروا لیتے یار۔'' بات مکمل کر کے اس نے ریان کو دیکھا تھا۔

ریان نے آنکھیں میچی تھیں اور پھر دانت کچکچا کہ اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟''

"میرے ایک دوست نے غلطی سے تمہیں دیکھا تھا۔" ساحر معصومیت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جاسوسی کرتے ہو میری؟" ریان زچ ہوا تھا۔

"کلاس میں کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔" ساحر نے دونوں ہاتھ اٹھائے تھے اور شبنم جو ضبط سے سرخ ہوتے چہرے سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ساحر سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"تم اسے ساتھ کیوں نہیں لے کے آئے؟"

"کیونکہ یہ پورے دس سیکنڈ لیٹ تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں انہیں دکھاتا بولا تھا۔

"اور وقت کی پابندی آپ ہی نے تو سکھائی ہے مجھے ڈیڈ کی غیر موجودگی میں بھول گئیں آپ؟"

"کیوں کر رہے ہو تم یہ سب؟" وہ دکھ سے بولی تھیں۔

"مام!" ریان نے ان کو روکا تھا لیکن وہ اس کی نہیں سن رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟ آپ ہی نے تو سکھایا ہے مجھے یہ سب۔" وہ باری باری مصنوعی حیرت سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"آپ نے جو اسباق مجھے پڑھائے ہیں میں انہی کا پریکٹیکل دے رہا ہوں آپ کو۔ کچھ غلط کر دیا میں نے؟" اس نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تھی۔

"واپس کیسے آئے ہو تم؟" آنکھوں میں سرخی ہلکی اور نمی لیے وہ اسے نظر انداز کر کے ریان سے مخاطب ہوئی تھیں۔ لہجہ اب کے پست تھا۔

"ایک کلاس فیلو مل گیا تھا۔" وہ ان کی سرخ آنکھوں کو دیکھتا گویا ہوا تھا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی لیکن ساحر کی یہ نفرت انہوں نے خود کمائی تھی۔

"آج آئینے دو فاروقی کو میں بات کرتی ہوں۔ بہت ہو گیا یہ تماشا۔" شبنم کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر عزم تھا۔

"آپ کو کرنی بھی چاہیے ماما۔" ساحر تابعداری سے ترنت بولا تھا۔

"قید خانے میں انصاف نہیں ہوگا تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔"

شبنم نے جبڑے بھینچے اسے دیکھا تھا۔

"آپ نہیں کریں گی ماما۔" ریان نے شبنم کو دیکھا تھا جو گردن موڑے ناپسندیدگی سے ساحر کو دیکھ رہی تھیں۔ "میں ضرور کروں گی۔" شبنم کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی۔

"تو پھر آپ اپنا گھر خراب کریں گی اور ڈیڈ کے سامنے جھوٹی ہوں گی کیونکہ میں آپ کو پہلے ہی سچ بتا چکا ہوں۔" ریان جبڑے بھینچے آگے بڑھ گیا تھا اور شبنم فاروقی نے اپنی سرخ نم آنکھیں ساحر پر جمائی تھیں۔

"سچ مچ نافرمان اولاد!" وہ دور جاتے ریان کو دیکھتا بڑبڑایا تھا اور نظریں موڑ کر شبنم کو دیکھا تھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"ایسے مت دیکھیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔" ساحر نے معصومیت سے کندھے اچکائے تھے۔ شبنم پلٹ گئی تھیں۔ ساحر سیدھا ہوا تھا۔ گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور مسکراتی نظریں ٹی وی کی اسکرین پہ جما دیں تھیں ہاں البتہ دل بوجھل تھا۔

☆☆☆

ریان نہا دھو کے سفید شرٹ اور جینز پہنے ہاتھ کے زخم کی ڈریسنگ بدل رہا تھا جب بیگ پہنے ہاتھ میں موبائل پکڑے ساحر اندر آیا تھا۔

"اکیڈمی نہیں جاؤ گے؟" وہ محظوظ سا بولا تھا۔

ریان نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا تھا۔

"نہیں میں لنگڑاتی ٹانگ کے ساتھ بسوں میں دھکے نہیں کھا سکتا۔"

"تو کیب کروا لیا کرو یا وقت کی پابندی کر لیا کرو۔"

"ہاں کروا لوں گا لیکن آج میرا موڈ نہیں ہے۔" ریان سکون سے بولا تھا۔

"کتنی تکلیف دیتے ہو اپنی ماں کو سچ مچ یہ اسی

نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ آخر مان کیوں نہیں جاتے تم ان کی بات بتا کیوں نہیں دیتے ڈیڈ کو کہ میں تم پہ ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہوں۔" ساحر دیوار سے ٹیک لگائے سینے پہ ہاتھ باندھے نرمی سے بولا تھا۔

"تاکہ تمہیں خود پر ترس کھانے کا ایک اور موقع مل جائے!" ریان نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"مام سے ایسے بات مت کیا کرو۔"

"واؤ جھوٹ تم بولو اور بدتمیزی کا ٹیگ مجھ پہ لگاؤ۔" ساحر اس کی ترس کھانے والی بات نظر انداز کر گیا تھا۔ "اور یہ بات تو مجھے تمہیں کہنی چاہیے۔" ہاتھ پہ پٹی لپیٹتے ریان نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم نے مجھے کبھی ان سے بدتمیزی کرتے یا اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔" ساحر نے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

"تم میرے ساتھ یہ سب صرف مام کو تکلیف پہنچانے کے لیے کرتے ہو ہے نا؟ کیا یہ بدتمیزی نہیں ہے؟"

"یار تم پتا نہیں اپنے دماغ میں کون سے تانے بانے بنتے رہتے ہو دیکھو میرے بھائی میں تو انہیں سود سمیت وہی لوٹا رہا ہوں جو وہ اتنے سالوں تک مجھے دیتی آئی ہیں۔" ساحر سادگی سے بولا تھا۔

"ہم دوست تھے ساحر!" ریان لیپ ٹاپ پہ ٹائپنگ کرتا بولا تھا۔ آج اس نے اتنے سالوں بعد یہ ذکر کیا تھا آواز قدرے دھیمی تھی۔

"ہاں ہم دوست تھے۔" ساحر نے 'تھے' پہ زور دیا تھا۔

"لیکن اب ہم سوتیلے بھائی ہیں تو تم بھی پرانی باتیں بھول جاؤ ورنہ خوش فہمی میں مارے جاؤ گے۔ مجھ سے کسی بھی قسم کی اچھائی کی امید مت رکھنا اب ہم بس قید خانے کے ساتھی ہیں۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتا بولا تھا۔

"آنکھ کے بدلے آنکھ کا تقاضا ہوگا تو ساری دنیا اندھی ہو جائے گی۔" ریان سادگی سے بولا تھا۔

اس کا اشارہ شبنم اور ساحر کی خاموش جنگ کی طرف تھا جس میں مہرہ ریان بنتا تھا یا فاروق علی۔

"تمہیں تو فلاسفی پڑھنی چاہیے ریان بزنس میں کیا کر رہے ہو؟"

وہ رشک سے اسے دیکھتا بولا تھا۔

"تمہیں اکیڈمی کے لیے دیر ہو رہی ہے ساحر۔" ریان سنجیدگی سے اسکرین فولڈ کر کے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ ساحر اور شبنم کو سمجھانا بے کار تھا۔

"کتنی فکر ہے تمہیں میرے وقت کی۔ خیر مجھے بھی تمہاری فکر ہے ایک مشورہ دیتا ہوں ڈیڈ کو جا کے سب کچھ بتا دو۔ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری بات کا فوراً یقین کر لیں گے۔" ساحر مسکرایا تھا۔

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔" ریان دراز کھنگالتا کڑواہٹ لیے بولا تھا۔

"وہ جو تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں وہ نفرت تو نہیں لگتی میرے بھائی۔" ساحر کے لہجے میں چبھن تھی۔

"ترس کھاتے ہیں۔" ریان نے پلٹ کے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جتنا وہ مجھ پہ خرچ کرتے ہیں اس سے زیادہ خیرات تو وہ اپنے نوکروں کو دے دیتے ہیں۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟"

"سب دکھائی دے رہا ہے مجھے ریان! مام کے ارادے بھی اور ڈیڈ کی نیت بھی۔" وہ لہجے میں چبھن لیے بولا تھا۔

"میرا نہ تم سے کوئی مقابلہ ہے ساحر اور نہ جھگڑا۔ غلط فہمیاں بیٹھ کے بات چیت کرنے سے ختم ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے پہ طنز کرنے سے نہیں۔" وہ اس کے سامنے کھڑا بولا تھا۔

"غلط فہمی ہو تب نا۔" ساحر نے سیٹ چھوڑی تھی۔ "اور میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے میری بے بی سٹنگ مت کیا کرو آیا نہیں ہو تم میرے اور نہ ہی استاد،" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

جاؤ ساحر ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" ریان اکتایا تھا۔

"جا رہا ہوں، رات کو ڈیڈ کی عدالت میں ملاقات ہوگی اگر تم نے غداری نہ کی تو۔ ویسے مجھے پکا یقین ہے آج کا کیس عدالت میں ضرور جائے گا۔"

"حسرت ہی رہے گی تمہاری۔" ریان بڑبڑایا تھا۔ ساحر چلا گیا تھا اور اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ساحر اور مام کو سمجھانا بھینس کے سامنے بین بجانے جیسا تھا۔ وہ دونوں انسانوں کے اس گروہ میں سے تھے جو ٹھوکر کھائے بغیر نہیں سمجھتے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ بعض ٹھوکروں کے بعد انسان تہی دامن اور خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

☆☆☆

ساحر ڈیڈ سے بات کرنے جا رہا تھا۔ جب ریان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند آوازیں اس کے کان میں پڑی تھیں۔

"میں نے فاروقی سے بات کی ہے وہ تمہیں کینیڈا بھیج دیں گے۔ اپنی باقی کی پڑھائی تم وہیں جا کے کرنا۔" یہ شبنم کی آواز تھی۔

"اور ساحر؟" ریان کی دھیمی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"وہ یہیں پڑھے گا۔ اتنا قابل تو وہ ہے نہیں پڑھائی میں اور ویسے بھی رکھیں فاروقی اسے اپنے سینے سے لگا کے۔" وہ تلخ لہجے میں بولی تھیں۔ ساحر کے لیے ان کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی جسے وہ یہاں سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

وہ آج تک سمجھ نہیں پایا تھا وہ اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی تھیں آخر؟

"آپ جانتی ہیں وہ مجھ سے زیادہ قابل ہے۔" ریان بولا۔

"یہ باپ بیٹے کا مسئلہ ہے۔" شبنم نخوت سے بولی تھیں۔

"آپ اس میں انوالو ڈ ہیں ماما، ورنہ ڈیڈ کو کیسے پتا ساحر کے قابل یا ناقابل ہونے کا؟" ریان جھنجلایا۔

"ریان ہم یہاں تمہاری بات کر رہے ہیں۔" شبنم اکتائی تھیں۔

"میں وہیں پڑھوں گا مام جہاں ساحر پڑھے گا۔"

"ریان۔" شبنم دبا دبا سا چلائی تھیں۔

"یہ سب ساحر کا ہے مام۔ یہ گھر، یہ گاڑیاں اور یہ بزنس، اس سب پہ صرف اس کا حق ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بولا۔

"ایسے کیسے سب کچھ اس کا ہے۔ اس کاروبار کو کھڑا کرنے کے لیے میں نے زیورات بیچ کر فاروق کو پیسے دیے تھے۔ اور وہ زیورات تمہارے باپ سفیر احمد نے مجھے دیے تھے۔" وہ غصے میں تیز تیز بولی تھیں۔

"اس سے زیادہ پیسے وہ میری پڑھائی اور مجھے کھلانے پلانے پہ لگا چکے ہیں۔" ریان نے جواباً کہا اور ساحر آگے بڑھ گیا تھا۔ اپنے پیچھے کھٹر پٹر کی آوازوں پر وہ حال میں لوٹا اور پلٹ کے دیکھا تھا۔ ریان اوپر آیا تھا اور اسے کھڑا دیکھ کے رک گیا تھا اور واپس پلٹ گیا تھا۔

"اتنی مشکل سے لنگڑا لنگڑا کے اوپر آئے ہو تو اب رک جاؤ۔" ساحر شیشے کے گلاس میں بھری یخ سیاہ ڈرنک کو حلق سے اتارتے بولا تھا۔

ساحر ہنسا تھا۔ "اور جانتے ہو تمہاری مام کا رویہ میرا دل مردہ کر چکا ہے۔"

"میں انہیں تب نہیں روک سکتا تھا ساحر۔ اب روک سکتا ہوں۔ اور میں نے انہیں روکا ہوا ہے۔" ریان نے دور تک پھیلے شہر کو دیکھا تھا۔

"اب تو پانی سر سے گزر چکا ہے۔" ساحر نے کندھے اچکائے تھے۔

"اپنے اپنے دیکھنے کا نظریہ ہے تم وہ دیکھ رہے ہو جو کھو چکا ہے اور میں اس پہ فوکس کر رہا ہوں جو بچا ہے۔"

"میرے سارے نظریے اور مقاصد مر چکے

ہیں اب تو صرف ایک ہی مقصد بچا ہے۔'' ساحر اس کی طرف کمر کیے کھڑا بولا تھا۔

''کیا مجھے مارنے کا؟'' ریان نے طنزاً کہا۔

''کیسی بات کرتے ہو یار، تم تو بھائی ہو میرے۔'' وہ طنزیہ ہنسا تھا۔

''میں تو قید خانے سے رہائی کی بات کر رہا تھا۔'' وہ پلٹا تھا۔

''سب کچھ تو ہے تمہارے پاس ساحر، باپ، گھر، جس میں تم حق سے رہتے ہو۔ کسی کے ٹکڑوں پہ نہیں پلتے اور تمہیں کوئی اٹینشن دلوانے کے لیے دوسروں کے سامنے کم تر نہیں کرتا۔'' ریان افسردگی سے بولا تھا۔

''اور ایک سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی۔ یہ تم بھول گئے۔'' ساحر ڈھٹائی سے بولا تھا۔

''اور رہی بات باپ کی تو وہ چھیننا چاہتا ہے اور جلد یا بدیر یہ گھر بھی چھن جائے گا۔''

''خون کے رشتے نہ چھینے جاتے ہیں نہ توڑے جاتے ہیں۔''

''کوشش تو کی جاسکتی ہے نا۔'' ساحر دھیرے سے بولا تھا۔ ''مجھ سے تو سب کچھ چھین لیا تمہاری مام نے اب ان کی باری ہے۔'' وہ بڑبڑایا تھا۔

''خیر تم نے کیا کھویا ہے؟''

''ماں، باپ، گھر اور دوست۔'' ریان سادگی سے بولا تھا۔

''ماں؟'' ساحر نے ابرو اچکا کے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں۔ میری ماں تو اسی چھوٹے سے بوسیدہ فلیٹ میں رہ گئی ہے۔ جو عورت فاروق انکل سے شادی کر کے آئی ہے وہ تو کوئی اور ہی ہے۔''

''باپ تو تمہیں مل گیا ہے!''

''میرا باپ مر چکا ہے۔'' ریان نے سرد آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''اور کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا لیکن افسوس میں نہیں کر سکتا۔'' ریان سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

''کرو گے؟'' ساحر آگے آیا تھا۔

''کوشش کر سکتا ہوں، وعدہ نہیں کروں گا۔'' ریان پلٹ کے بولا تھا۔

''اپنی مام کو لے کے اس گھر سے اور ڈیڈ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ۔''

''میں یہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میری دعا ہے کہ تمہاری یہ حسرت حقیقت میں بدل جائے۔'' ریان زینے اتر گیا تھا۔

''آمین۔'' ساحر وہیں جنگلے سے ٹیک لگائے دور تک پھیلے آسمان کو دیکھنے لگا تھا۔

''کبھی کبھی اسے ریان کے ساتھ تلخ رویے پہ گلٹ بھی ہوتا تھا لیکن شبنم کے لیے دل میں جو نفرت تھی وہ ہر احساس اور ہر چیز پہ حاوی تھی۔

☆☆☆

ریان اپنے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا جب شبنم دستک دے کر اندر آئی تھیں۔

''ٹانگ میں زیادہ درد تو نہیں ہے؟'' وہ نرمی سے مخاطب ہوئی تھیں۔ لیپ ٹاپ کام کرتے ریان نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''اور ہاتھ کا زخم؟''

''اب بہتر ہے۔'' وہ ہر احساس سے عاری لہجے میں بولا تھا۔

''میرے ساتھ چلو اور فاروقی سے بات کرو۔'' انہوں نے کئی دن کے بعد دوبارہ بات چھیڑی تھی۔

''مام آپ مجھے تکلیف دینا کب بند کریں گی؟'' وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتا سپاٹ سا بولا تھا۔

''میں تکلیف دے رہی ہوں تمہیں؟'' ان کی کشادہ پیشانی پہ بل پڑے تھے۔

''جی۔'' اس نے چہرہ موڑ کے انہیں دیکھا تھا۔

''اور پچھلے نو دس سالوں سے دے رہی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' شبنم کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔ وہ اس کی ٹیبل کے پاس کھڑی تھیں۔

''ہر بار آپ ایسے ہی کرتی آئی ہیں۔ ساحر نے مجھے تنگ اب کرنا شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے جو آپ ہر چھوٹی اور بے تکی بات پر مجھے فاروق انکل کے پاس لے کے جاتی تھیں۔ اٹینشن دلوانے کے لیے وہ تکلیف تھی مام، ساحر کے لیے ان کی آنکھوں میں اپنائیت تھی ماما اور میرے لیے ترس اور ترحم، جو آپ ہر دن میں ہزار دفعہ مجھے لے جا کر کم تر ثابت کرتی تھیں وہ تکلیف تھی مام! نہیں چاہیے یار مجھے ان کی اٹینشن، آپ کو سمجھ میں کیوں نہیں آتا مام! کہ میرا باپ مر چکا ہے اور وہ جگہ اب ساری زندگی ایسے ہی خالی رہنی ہے۔'' ریان کی آنکھیں شبنم سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔

''اب بس مام، میں مزید آپ کو یہ سب نہیں کرنے دوں گا۔ میری زندگی پہلے ہی کافی مشکل ہے اور میں پہلے ہی بہت تکلیف میں ہوں۔ میرے لیے آئے دن مزید عذاب مت کھڑے کیا کریں۔'' ریان نے چہرہ واپس لیپ ٹاپ کی جانب موڑا تھا۔

''میں نے تمہیں بس ایک آسائشوں والی زندگی دینی چاہی تھی۔'' شبنم دھیرے سے بولی تھیں۔ ریان کا یہ روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''اور آپ ہے کس نے کہا تھا کہ مجھے یہ عالی شان زندگی چاہیے تھی۔ میں اس خستہ حال، ٹوٹے پھوٹے فلیٹ میں خوش تھا۔ میرے پاس ماں تھی، دوست تھا اور اپنا گھر تھا۔'' وہ کنپٹی دباتا بولا تھا۔

''تمہیں میری شادی سے مسئلہ ہے؟'' شبنم نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

''مجھے اس رویے سے مسئلہ ہے جو آپ کا ساحر کے ساتھ تھا۔'' وہ زچ ہوا تھا۔

''اور مسئلہ مجھے تب ہوا تھا جب آپ نے فاروق انکل کی زندگی میں مجھے ساحر کی جگہ دینے کی کوشش کی تھی۔ چیزیں اپنی اصل جگہ پر رہیں تو وہ ٹھیک رہتی ہیں۔ آپ نے جگہ بدلنے کی کوشش کی اور اتنے لوگوں کی زندگی خراب کی۔ اپنی ان سکیورٹی کی وجہ سے آپ نے مجھے تکلیف دی۔ ساحر کو اذیت دی، فاروق انکل کو نقصان پہنچایا اور خود اب آپ بے سکون ہیں۔ وہ آپ کو سود سمیت وہی لوٹا رہا ہے جو آپ نے اتنے سالوں میں اسے دیا ہے۔ اگر آپ یہ سب نہ کرتیں تو شاید حالات آج بہتر ہوتے۔'' وہ آج بولنے پہ آیا تھا۔ تو سارے حساب برابر کر دیے تھے۔

''آپ نے ساحر کو فاروق انکل سے دور کیا اور قدرت نے میرے اور آپ کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے۔''

''ریان'' شبنم نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا بولے جا رہے ہو؟'' ان کی آواز کانپی تھی، ریان نے چند لمحوں میں ان کو آئینہ دکھا دیا تھا۔

''فاروق انکل ساحر کے باپ ہیں مام، وہ دس بار کیا دس ہزار بار بھی غلطی کرے گا تو وہ اسے معاف کر دیں گے۔ فاروق انکل کا سب کچھ ساحر کا ہے مام یہاں میرا کچھ نہیں ہے۔ مجھے ساحر کے ساتھ اسکول میں پڑھانے کا مطلب یہ تو نہیں تھا مام کہ وہ مجھے ساحر کی جگہ دینے لگے ہیں۔'' اس نے شبنم کو دیکھا تھا اور وہ ریان پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھیں۔

''میرے پاس رشتوں کی پہلے ہی بہت کمی تھی۔ بابا کے جانے کے بعد آپ میرے پاس تھیں۔ اور آپ کی شادی کے بعد میں نے آپ کو بھی کھو دیا۔ جب آپ نے فاروق انکل کو ساحر سے دور کرنے کی کوشش کی تو آپ میرے دل سے بھی اتر گئی تھیں۔ وہ میرا دوست تھا مام، اس خستہ حال فلیٹ میں میں حق سے رہتا تھا۔ یہاں میں ان لوگوں کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہوں۔ اگر وہ آج میرے ساتھ یہ سب کر رہا ہے تو اس کی ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ یہ نفرت بھی آپ ہی کی پروان چڑھائی ہوئی ہے۔

آپ نے مجھ سے گھر چھین لیا، ماں چھین لی، دوست چھین لیا۔ مجھے وہ سب دینے کی کوشش میں جو میرا نہیں تھا آپ نے مجھ سے وہ سب بھی چھین لیا جو میرے پاس تھا۔'' وہ آج بولنے پہ آیا تھا تو اتنے سالوں کی بھڑاس ایک ساتھ نکالی تھی۔ وہ سب جس کا

اعتراف شبنم خود سے نہیں کر پاتی تھیں وہ سب ریان نے کہہ دیا تھا۔

''تم یا تو ناشکرے ہو چکے ہو یا احساس کمتری کا شکار!'' شبنم اسے دیکھتے ہوئے کمزور لہجے میں بولیں اور دھیرے سے پاس رکھی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اپنی غلطیاں ماننا آسان کہاں تھا۔

''آپ جانتی ہیں لوگ باہر میرے بارے میں کیسی باتیں کرتے ہیں؟ گھر کے ملازم کن نظروں سے دیکھتے ہیں؟'' ریان جیسے ان کو نہیں سن رہا تھا۔

''آپ جانتی ہیں ساحر مجھے کن نظروں سے دیکھتا ہے؟'' وہ ڈھلکے کندھوں کے ساتھ بیٹھا تھکی تھکی نظریں ان پہ جمائے بولا تھا۔

''میں نے تمہیں بس ایک اچھی زندگی دینے کی کوشش کی تھی۔'' وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اسے دیکھتی بولی تھیں۔

''میرا نام ریان سفیر ہے مام! ساحر فاروق نہیں۔ آپ بار بار یہ بات بھول مت جایا کریں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا اور شبنم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ رکنا اب محال تھا۔

''میں ویسے بھی کچھ دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے پست لہجے میں بولا تھا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' شبنم کے قدم تھمے تھے۔

''وہاں جہاں سفیر احمد رہتا تھا۔ میری اصل جگہ۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا تھا۔

''اس کھنڈر میں رہو گے کیسے؟'' وہ غائب دماغی سے پلٹ کے اسے دیکھتی بولی تھیں۔

''جیسے اس عالیشان محل میں رہتا ہوں۔ وہی کھنڈر میرے نصیب میں ہے۔'' ریان نے کندھے اچکائے تھے اور انہیں دیکھا تھا۔ ''یہ آپ کا گھر ہے مام! فاروق انکل آپ کے شوہر ہیں۔ آپ کا حق ہے یہاں۔''

''ایسا مت کرو ریان۔'' شبنم آہستہ آواز میں بولی تھیں۔

''آپ ہم دونوں کو ساتھ لے کر چل سکتی تھیں مام، اب آپ بھی ایسا مت کریں۔ مجھے مت روکیں۔ پلیز میرے اوپر رحم کریں۔'' ریان نے التجا کی تھی۔

''ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' شبنم نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ریان پورا ان کی طرف گھوما تھا۔

''جانتی ہیں میری ماں اس بوسیدہ سے فلیٹ میں ہی رہ گئی ہے۔ جو عورت فاروق انکل کی بیوی بن کے آئی ہے وہ تو کوئی اور ہی ہے۔''

شبنم کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ مکافات عمل کی چکی چل چکی تھی۔

☆☆☆

صبح کے چھ بج رہے تھے اور شبنم نائٹ گاؤن پہنے گیلا چہرہ لیے کھڑکی تک آئی تھیں۔ فاروق علی لان میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ شاید تھوڑی دیر پہلے ہی جاگنگ کر کے آئے تھے۔ اتنے میں شبنم کی نظر مین گیٹ پر پڑی تھی وہاں سے سرمئی ٹریک سوٹ پہنے ریان اندر آیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سفید ٹریک سوٹ پہنے ساحر آیا تھا۔

ریان بالوں میں ہاتھ پھیرتا فاروق سے تھوڑے فاصلے پر رکا تھا اور انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا دونوں مسکرا کے کوئی بات کرنے لگے تھے۔

تب ہی فاروق نے اپنے کان میں ہینڈز فری لگائے لاؤنج میں جاتے ساحر کو مخاطب کیا تھا وہ بھی پلٹا تھا اور وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے بات کرنے لگے تھے۔

ساحر ہاتھ ہلا ہلا کے کچھ بول رہا تھا اور ریان دونوں ہاتھ پہلو پر رکھے اسے دیکھتا سر اثبات میں ہلا رہا تھا اور فاروق مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ (آپ ہم دونوں کو ساتھ لے چل سکتی تھیں مام) شبنم کے کانوں میں ریان کی آواز گونجی تھی۔

فاروق کے سامنے شبنم اور ساحر بالکل ٹھیک رہتے تھے، ریان البتہ جیسا ان کی موجودگی میں ہوتا تھا

ویسا ہی ان کی غیر موجودگی میں رہتا تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تو کہتا کہ ریان نہیں بلکہ ساحر شبنم کا بیٹا ہے کیونکہ وہ بالکل شبنم کے جیسا تھا وہ ان کی پھینکی بریانٹ کا جواب پتھر سے دیتا تھا۔ شبنم وہاں سے ہٹی تھیں اور قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ منظر دل کو بوجھل کررہا تھا۔

شبنم نے چونک کے آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھا تھا وہ آج سے بارہ تیرہ برس پہلے شبنم تھی جو خستہ حال فلیٹ میں رہتی تھی اور سادہ لباس پہنتی تھی۔

"ریان کی جگہ بنانے کے لیے ساحر کو ہٹانا ضروری نہیں تھا۔ تم سب کو ساتھ لے کے چلتیں تو حالات آج مختلف ہوتے۔" وہ عورت تاسف سے بولی تھی اور شبنم کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

"ریان چلا گیا تو تمہارے پاس کیا بچے گا شبنم؟ ریان سے زیادہ قیمتی کیا ہے تمہارے لیے؟" افسردگی سے کہتی وہ عورت ہوا میں تحلیل ہوئی تھی اور شبنم کا عکس واضح ہوا تھا۔ سیاہ نائٹ گاؤن میں ملبوس وہ عورت ایک ہی رات میں بکھر گئی تھی۔ شبنم نے لوشن اٹھا کے چہرے پر لگایا تھا۔

آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور جسم پہ تھکاوٹ طاری تھی دو دن بعد شبنم کو فاروق کے ساتھ ایک اہم پارٹی پہ جانا تھا۔ کچھ دن پہلے تک یہ دو دن کافی مصروف گزرنے والے تھے۔ شبنم کو پارلر جانا تھا۔ ڈریس ڈیزائنر سے ملنا تھا۔ مینی کیور، پیڈی کیور، ہیر ٹریٹمنٹ، اسکن پالش وغیرہ وغیرہ اور اب ایک دم سے ساری مصروفیات ختم ہوگئی تھیں۔

ریان کے جانے کے تصور سے ہی زندگی بے رنگ ہوگئی تھی۔ وہ الماری تک آئی تھیں، اندر سے ایک مخملی پوٹلی نکالی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ ریان کو سب کچھ دینے کے لالچ میں شبنم نے اس کا کچھ نہیں چھوڑا تھا اور اب کہانی کا انجام یہ ہوا تھا کہ ریان کو بھی کھونے جارہی تھیں۔

☆☆☆

ریان اپنے کمرے میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑا گیلے بالوں میں برش پھیر رہا تھا جب شبنم دستک دے کر اندر آئی تھیں۔ ریان نے آئینے میں انہیں دیکھا تھا۔ بالوں کو رف سے جوڑے میں باندھے وہ آج بکھری بکھری لگ رہی تھیں۔

"ناشتا نہیں کرنا؟" شبنم نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"بس آ ہی رہا تھا۔" وہ بیگ میں چیزیں رکھتا بولا تھا۔

"آئی ایم سوری ماما۔ میں پتا نہیں رات کو کیا کچھ بول گیا۔ میں آپ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا پر......"

"اٹس او کے!" شبنم نے نرمی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"میں جانتا ہوں آپ نے میرا فائدہ ہی سوچا تھا لیکن......" ریان پلٹا تھا۔

"لیکن طریقہ غلط تھا۔" شبنم پھیکا سا مسکرائی تھیں۔

"آپ بس مجھے دعا دے دیا کریں۔ وہ دنیا بھر کے خزانوں سے بہتر ہے۔" وہ ان کے پاس آیا تھا اور ان کا سر دونوں ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولا تھا۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی بولی تھیں۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" ریان مسکرایا تھا اور نرمی سے ان پہ بوسہ دیا تھا۔

"تم بالکل سفیر جیسے ہو۔" وہ سوگواری سے مسکرائی تھیں۔

"اچھا! مجھ سے زیادہ ہینڈسم تھے؟" ریان نے انہیں دیکھا تھا۔ فضا میں تناؤ کم ہوا تھا۔

"نہیں۔" شبنم نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ "تم سے زیادہ نہیں تھے۔" وہ مسکرائی تھیں اور ریان سر جھٹک کے ہنسا تھا۔

"اچھا یہ رکھ لو۔" شبنم نے مخملی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی تھی جسے ریان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

pklibrary.com

"یہ تمہارے بابا نے دی تھیں۔ سونے کی چوڑیاں ہیں۔ باقی سب کچھ تو فاروق کے بزنس میں لگ گیا۔ ان کے دیے زیورات میں سے بس یہی بچی ہیں۔"

"میں ان کا کیا کروں گا؟" ریان نے کندھے اچکائے تھے۔

"رکھ لو کبھی پیسوں کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔" وہ اس کی الماری تک آئی تھیں اور پوٹلی اندر رکھی تھی۔

"مام یہ آپ کی ہیں اور آپ....." وہ پرفیوم لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"مجھے بحث نہیں کرنی ریان۔" وہ اس کی بات کاٹتی بولی تھیں۔ ریان نے گہرا سانس لیا تھا۔

"چلیں پھر نیچے چل کے ناشتا کریں۔" وہ کہہ کے دروازے کی جانب بڑھا تھا اور پھر رکا تھا وہ اس کے پیچھے نہیں آرہی تھیں۔ شبنم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن پھر خاموش ہوگئی تھیں۔ وہ اسے بزنس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھیں لیکن یوں ہی خیال آیا تھا کہ پہلے فاروق سے بات کریں۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" ریان نے انہیں دیکھا تھا۔

"یہی کے میری ساری زندگی تمہارے گرد گھومتی ہے۔ تم چلے جاؤ گے تو میں کیسے رہوں گی۔" شبنم پھیکا سا مسکرائی تھیں۔

"فکر مت کریں میں ملنے آیا کروں گا نا۔" ریان ان کے گرد بازو پھیلا کے ان کو ساتھ لے کر چلتا بولا تھا اور شبنم نے آنسو صاف کیے تھے۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھیں لیکن روک نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

فاروق، شبنم اور ریان ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے اور ساحر سیڑھیاں اتر کے اپنی دھن میں مگن باہر کی جانب بڑھا تھا۔

"ساحر تم ناشتا نہیں کرو گے؟" فاروق نے اسے پکارا تھا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں؟ بھوک کیوں نہیں ہے؟" فاروق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھا تھا۔

"ایسے ہی ڈیڈ! دل نہیں چاہ رہا اور ویسے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے گلہ آمیز نظروں سے پہلے باپ کو دیکھا تھا پھر شبنم کو اور واپس پلٹ گیا تھا۔

"فرق پڑتا ہے۔ میری فیملی تم ہو اس لیے واپس آؤ اور ہمیں جوائن کرو۔" فاروق نرم لہجے میں بولے تھے۔

ساحر کے قدم زمین نے جکڑے تھے اور چائے کی پیالیوں تک لے جاتا شبنم کا ہاتھ رکا تھا۔ ریان البتہ سر جھکائے ناشتا کرتا رہا تھا۔

ساحر خاموشی سے واپس آیا اور فاروق کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے فاروق ناشتا ختم کر کے اٹھے اور پھر ساحر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا اٹھا اور ریان سے مخاطب ہوا تھا۔

"میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔ دس منٹ میں باہر آجاؤ۔"

ریان نے سر ہلایا تھا۔

"اگر ساحر چلا گیا تو مجھے بتانا میں ڈراپ کردوں گی یا کیب کروالینا۔ بسوں میں دھکے مت کھاتے رہنا۔ پہلے ہی تمہاری ٹانگ میں درد ہے۔" وہ مدھم آواز میں بولی تھیں۔ سکون سے ناشتا کر کے ریان باہر آیا تھا اور توقع کے برعکس ساحر گاڑی کھڑی کیے ہوئے تھا۔ ریان نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اور اس نے کلائی پر بندھی گھڑی ریان کو دکھائی تھی۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کے وہ اندر بیٹھا تھا۔

"پورے پانچ منٹ لیٹ ہو تم۔" ساحر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگا تم جا چکے ہوگے۔" ریان نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔

"کروادی نا مس پہلی کلاس، پروفیسر اب سر پھاڑنے کو دوڑے گا۔" ساحر ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"پانچ منٹ میں بندہ گلی کی نکڑ تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔" ریان سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے بولا۔

"ارادہ ہی نہیں تھا تمہارا آج کلاس لینے کا۔" اندا زمیں بے نیازی تھی۔

ساحر نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔ اس کا رخ اب یونی کی طرف نہیں بلکہ اپنے دوستوں کے گھر کی طرف تھا وہ انہیں پک کرنے والا تھا۔ گاڑی ایک سڑک کے پاس رکی تھی اور تین لڑکے اس طرف آئے تھے۔ دو پیچھے بیٹھے تھے اور ایک نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ کانوں میں ہینڈ فری لگائے ریان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ریان تم پیچھے چلے جاؤ، مجھے ساحر سے پریزینٹیشن کے بارے میں کچھ ڈسکس کرنا ہے۔"

"ریان یہیں بیٹھے گا اس کی ٹانگ میں درد ہے۔ تم پیچھے بیٹھ جاؤ، ہم یونی جا کے ڈسکس کرلیں گے۔" ریان کے بولنے سے پہلے ساحر عام سے لہجے میں بولا تھا۔

اس لڑکے نے گھور کے ریان کو دیکھا تھا اور پیچھے جا بیٹھا تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سینما کے سامنے رکے تھے ساحر نے کسی مووی کے ٹکٹس لینے تھے۔ ریان گاڑی کے پاس ہی کھڑا رہا تھا اور وہ لوگ گھوم کے آئے تھے ساحر ابھی دور تھا اور اس کے دوست ریان کے پاس آئے تھے۔

"پریزینٹیشن کی تیاری کیسی ہے ریان؟"

"ہوں..... اچھی ہے۔" وہ موبائل پہ سر جھکائے بولا تھا۔

"اسائنمنٹ بنالی؟" دوسرے نے سوال کیا تھا۔

"ہاں بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔" وہ مصروف سا بولا تھا۔

"اور ساحر کی بنالی؟" تیسرے نے سوال کیا تھا۔

"میں اس کی اسائنمنٹ کیوں بناؤں گا؟" اس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کا کہ انہیں دیکھا تھا ان کے لہجے عجیب تھے کچھ عجیب تھا۔

"اس کے باپ کا جو کھاتے ہو۔" ایک لڑکا مسکرا کے بولا تھا۔ یہ وہی تھا جسے ساحر نے پیچھے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" ریان نے ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھا تھا۔

"ساحر کے باپ کا کھاتے ہو اسی لیے اسے اسائنمنٹ بنا کے دیتے ہو نا۔ تو وہ کام ہم بھی کردیں گے اگر تم اسائنمنٹس بنا دو تو!"

"کم سے کم میں اس کی گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھ کے اس کے تلوے تو نہیں چاٹتا۔ بولنے سے پہلے سوچ تو لیتے۔" ریان آنکھوں میں چبھن لیے بولا تھا اور ان کے چہرے سرخ ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ جھگڑا بڑھتا ساحر واپس آیا تھا اور گاڑی ان لاک کی تھی۔ ریان نے جھک کے بیگ نکالا تھا۔ ساحر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"میں خود چلا جاؤں گا۔" ریان ایک چبھتی نظر اس کے دوستوں پر ڈالتا پلٹ گیا تھا۔

"کچھ ہوا ہے کیا؟" گاڑی کے اندر بیٹھ اس نے سرسری سا پوچھا تھا۔

"یار تیرا بھائی تو بہت جلدی برا مان جاتا ہے۔" وہ تینوں ہنسے تھے۔

"کیا کہا ہے تم لوگوں نے اسے؟" وہ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے پلٹا تھا اور باری باری ان تینوں کو دیکھا تھا۔

"زیادہ کچھ نہیں بس مذاق میں اتنا کہا تھا کہ ....."

اس کے دوست نے روداد سنائی تھی اس توقع سے کہ وہ ان کو شاباشی دے گا لیکن معاملہ الٹ ہوا تھا۔

"گاڑی سے اترو!" ساحر نے جبڑے بھینچے ان تینوں کو دیکھا تھا۔

"کیا؟" وہ ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"یہ ہمارا فیملی میٹر ہے۔ میرے اور ریان کے

درمیان جو بھی جھگڑا ہے وہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔ اور مجھے اپنے گھر کے معاملوں میں باہر کے بندوں کی مداخلت سخت زہر لگتی ہے۔'' وہ چبا چبا کے بولا تھا

''اب گاڑی سے اترو اور آئندہ زبان سنبھال کے۔'' وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔

''اور جو خود تم اس کے ساتھ کرتے ہو؟ وہ فیملی کا معاملہ ہے؟'' ان میں سے ایک طنز کیا تھا۔

''ریان اب تمہاری فیملی ہے!'' دوسرا زہر خند لہجے میں بولا تھا اور وہ تینوں گاڑی سے اتر گئے تھے۔

☆☆☆

زندگی معمول کے انداز میں گزر رہی تھی۔ اپنے دوستوں سے اس کی بول چال بند تھی۔ ساحر یونی ورسٹی کے باہر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ریان کو باہر آنے کا چانس وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریان سامنے سے آیا تھا۔

''گھر کی بات گھر تک ہی رہنے دیتے۔ تم خود ذلیل کرنے کے لیے کم تھے جو اب اپنے دوستوں کو بھی اس کام پہ لگا دیا ہے۔'' وہ آنکھوں میں شکوہ لیے بولا تھا۔ ساحر سیدھا ہوا تھا۔

''تمہارے چہرے پہ یہ چوٹیں کیسے آئیں؟'' ساحر نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

''سیڑھیوں سے گرا ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا تھا اور ساحر نے اس کا چہرہ دوبارہ دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے پہ نیل اور زخم تھا۔ دائیں گال کی ہڈی پر بھی نیل تھا۔ نچلے والا ہونٹ کنارے سے پھٹا ہوا تھا اور بائیں گال پہ گردن کے پاس کافی خراشیں تھیں۔

''تم جاؤ میں لائبریری جا رہا ہوں۔ واپسی پہ خود آجاؤں گا۔'' ریان بولا تھا اور ساحر نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ ریان پلٹ گیا تھا اور اس کے ذرا سا دور جاتے ہی ساحر نے موبائل نکالا اور کسی کو کال کی تھی۔

''یونی میں کوئی لڑائی ہوئی ہے کیا؟''

''اوہ اچھا! کس کس کی؟ ریان لڑنے والا لگتا تو نہیں!''

''لڑائی ہوئی کس وجہ سے کی؟''

''بس اتنی سی بات پہ؟ ٹھیک ہے، تھینکس یار!'' اس نے موبائل جیب میں ڈالا تھا اور یونی ورسٹی کے اندر چلا گیا تھا۔ کف موڑتا وہ ایک کھلے گراؤنڈ میں آیا تھا۔ وہاں لڑکوں کا ایک گروپ کھڑا باتیں کر رہا تھا ساحر کی طرف ان کی کمر تھی۔

وہ سب ساحر کے دوست ہوا کرتے تھے کچھ دن پہلے تک، ساحر تیز تیز چل کے ان کے قریب گیا تھا اور سرخ شرٹ والے لڑکے کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔

''ہمت کیسے ہوئی تمہاری اسے ہاتھ لگانے کی؟'' وہ ماتھے پر بل ڈالے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ باقی لڑکے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے ریان سے بدتمیزی کی تھی اور آج اس سے ہاتھا پائی کی تھی۔

''تم تو کہتے تھے وہ تمہارا سوتیلا بھائی ہے۔'' وہ لڑکا سینے پہ ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''میں نے کہا تھا یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔'' ساحر نے اس کا گریبان پکڑا تھا اور دونوں کے درمیان ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ دو تین لڑکے آگے بڑھے تھے اور انہیں الگ کیا تھا۔

''اس سے دور رہنا۔'' ساحر اپنے آپ کو چھڑا کے بولا تھا۔

''دیکھ لوں گا تمہیں۔'' وہ لڑکا پھٹے ہونٹ سے نکلتے خون کو صاف کرتا بولا تھا۔ ساحر ہاتھ جھاڑ کے وہاں سے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

وہ سیدھا گھر پہنچا تھا۔ اپنی دھن میں مگن ساحر اپنے کمرے میں آیا تو ٹھٹک گیا۔ سامنے شبنم نک سک تیار کھڑکی کے پاس کھڑی تھیں۔ آنکھیں البتہ بے رونق تھیں۔

''آپ یہاں؟'' ساحر نے حیرت سے انہیں دیکھا پھر اس کے ذہن میں ریان کا زخمی چہرہ گھوما تھا۔ کیا وہ گھر آچکا تھا؟ شاید وہ اسی کی تفتیش کرنے آئی

تھیں۔

"ہماری جنگ تو لاؤنج میں ہوتی ہے یا ڈرائنگ ٹیبل پہ!" وہ طنز اُبولا تھا اور بیگ اتار کر بیڈ پہ بیٹھا تھا۔

"میں تم سے لڑنے نہیں آئی۔" شبنم نے اسے دیکھا۔

"پھر؟" ساحر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔" چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد شبنم بولی تھیں۔

"معافی!" ساحر کی آنکھوں میں تعجب تھا۔

"آئی ایم سوری ساحر، میں نے تمہارے اور فاروق کے درمیان اتنے فاصلے پیدا کیے۔ میں تم سے جلنے لگی تھی۔ میں تمہارا اور ریان کا موازنہ کرنے لگی تھی۔ جو تمہارے ساتھ میں اتنے سالوں سے کرتی آئی ہوں وہ خود ایک دن بھی برداشت نہیں کر پائی۔"

"مجھے لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا پھر۔" ساحر نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"یہ آپ کی کوئی نئی چال ہے۔"

"میں نے تم سے تمہارے باپ کو چھیننے کی کوشش کی اور قدرت نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ میں تمہیں تمہارے باپ کی نظروں میں گراتی رہی اور اللہ کی قدرت دیکھو میں اپنے ہی بیٹے کی نظروں میں گرتی گئی۔" شبنم اس کی بات نظر انداز کر کے پست آواز میں بولی تھیں۔

"کافی جلدی احساس ہو گیا آپ کو؟ نہیں؟" ساحر نے انہیں دیکھا تھا وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی دماغی حالت آج ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

"مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ میں ان سکیور ہو گئی تھی میں بھول گئی تھی کہ ریان سفیر کا باپ مر چکا ہے اور ساحر فارق کا باپ اس کے سر پہ ہے۔ میں یاں تھی میں اسے ایسے محبت کا ترسا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے تم سے چھین کے اسے دینے کی کوشش کی۔ اسے ایک بہترین زندگی دینے کی کوشش میں، میں نے اس کی زندگی مزید بدترین بنا دی۔" شبنم نے چہرہ اس کی طرف موڑا تھا۔

"ایک ایک گناہ یاد کرنے بیٹھوں گی تو رات گزر جائے گی۔ میں بس معافی مانگنے آئی تھی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ مکافات عمل کی چکی چلتی دیر سے ہے لیکن پستی باریک ہے۔ میرا مقصد بس ریان کو ایک اچھی زندگی دینا تھا۔ اور بدلے میں تمہاری حق تلفی کرتی رہی۔" آج شبنم بول رہی تھی اور ساحر سن رہا تھا۔

"تمہارا اور فاروق کا رشتہ ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ تم لوگ لڑ سکتے ہو۔ دور ہو سکتے ہو لیکن پھر بھی تم دونوں کا رشتہ قیامت تک نہیں ٹوٹے گا اور دیکھو میں تم سے کچھ نہیں چھین پائی اور خود خالی ہاتھ رہ گئی، فاروق کے دل اور زندگی میں جو تمہاری جگہ ہے ساحر! وہ کوئی کبھی نہیں لے سکتا۔" شبنم کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔

"آج رات جب فاروق کو بتاؤں گی تو شوہر کا اعتماد کھو دوں گی۔ ریان کو پہلے ہی کھو چکی ہوں اور سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے ناخوش ہے۔ میں نے اس کی زندگی خراب کی اور اسے اتنی تکلیف دی۔" شبنم نے آنسو صاف کیے تھے۔

"تم چاہو تو ان کے سامنے تم سے معافی مانگ لوں گی۔" شبنم نے ساحر کو دیکھا تھا۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت شبنم کو ریان سفیر سے تھی اور شبنم نے اسے ہی تکلیف دی تھی۔ اب وہ ان سے دور ہونے والا تھا یا شاید ہو چکا تھا!

"ریان کو کیا ہوا؟ وہ کہیں جا رہا ہے کیا؟" ساحر نے ان کی ساری باتوں کے جواب میں یہ دو سوال پوچھے تھے۔ شبنم نے فقط سر اثبات میں ہلایا اور دروازے کی جانب بڑھی تھیں۔

"میں ڈیڈ سے سوری کر چکا ہوں اور میرے اور ان کے درمیان چیزیں اب بہتر ہو رہی ہیں اس لیے آپ کو انہیں کچھ بتانے کی ضرورت....." ساحر ان کی طرف سے رخ موڑے بول رہا تھا اور ڈور ناب گھماتا

شبنم کا ہاتھ تھما تھا۔ وہ پلٹی تھیں اور اس کی بات کاٹی تھی۔

"نہیں۔" آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولیں۔

"یہ مت کرنا۔ میرے گناہوں پہ پردہ مت ڈالنا۔" وہ انگلی اٹھا کہ تنبیہ کرتی بولی تھیں۔

"میں آپ کے گناہوں پر پردہ نہیں ڈال رہا۔ آپ ماں نہیں ہیں میری، مجھے نہ ہی آپ سے کوئی لگاؤ اور نہ ہی آپ کی کوئی فکر ہے۔ آپ ڈیڈ کو بتائیں گی تو وہ ہرٹ ہوں گے۔ وہ آپ پہ اندھا اعتماد کرتے تھے جو کہ انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ میرے ڈیڈ Suffer کریں اس لیے یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہی ختم ہو جانی چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

بات یہ تھی کہ ساحر نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا۔ وہ گنہگار تھیں تو معصوم وہ بھی نہیں تھا۔ اگر شبنم کے گناہوں سے پردہ اٹھتا تو باعزت وہ بھی نہیں رہنے والا تھا اور وہ اپنے باپ کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس دنیا میں بچا اپنا آخری پر خلوص رشتہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"میں ایسے گلٹ کے ساتھ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔" شبنم نے سر نفی میں ہلایا۔

"آپ ڈیڈ کا بھروسا کھو دیں گی تو ان کے دل سے بھی اتر جائیں گی۔ ان کے گھر اور زندگی میں شاید پھر بھی رہیں۔ اور میں الگ ان کی نظروں میں گروں گا۔ میں نے بھی تو ریان کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔" اس کی آواز مدھم ہوئی تھی۔ "تو جہاں اتنے سال آپ نے بھیس بنائے رکھا ہے وہاں چند سال اور سہی، ویسے بھی یہ لڑائی تو میرے اور آپ کے درمیان تھی تو ڈیڈ کو اس سے دور رکھیں۔"

"اب جب دیکھنے کا انداز بدلا ہے تو تم بھی ریان جیسے لگتے ہو۔ لیکن اب شاید بہت دیر ہو چکی ہے۔ زندگی ضائع کر دی میں نے، میں واقعی خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تھیں۔ "ہم پارٹی پہ جا رہے ہیں شام تک آجائیں گے۔" وہ اس کا کندھا تھپک کے آگے بڑھ گئی تھیں۔

"پلیز ڈیڈ سے کوئی بات مت کیجیے گا۔" ساحر نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

"فکر مت کرو صرف ان زیادتیوں کا اعتراف کروں گی جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہیں۔" وہ باہر نکل گئی تھیں اور وہ کمرے کی کھڑکی تک آیا تھا۔ نیچے وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ فاروق علی نے یونہی کسی خیال کے تحت نظر اٹھا کہ اوپر کھڑکی دیکھا تھا۔ ساحر کو وہاں کھڑا دیکھ کے وہ مسکرائے تھے۔ وہ بھی مسکرایا تھا اور جواباً وہ ہاتھ ہلا کے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

کچھ خاص تھا اس ایک لمحے میں۔ انہیں جاتا دیکھ کہ ساحر کا دل ڈوبا تھا۔ وہ تب تک دیکھتا رہا تھا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کے وہ شام کبھی نہیں آنی تھی جب انہوں نے واپس آنا تھا۔

☆☆☆

سات سال کا ساحر دونوں ہاتھوں میں اپنے باپ کا ہاتھ تھامے سامنے کھڑی ہلکی گلابی رنگ کی میکسی پہنے اپنی ٹیچر کو دیکھ رہا تھا جو ان کی شاید کوئی فیملی فرینڈ بھی تھی۔ پھر اس کی نظر اس عورت کے پیچھے کھڑے بچے پہ پڑی تھی جس نے اس عورت کا لباس مٹھی میں دبوچ رکھا تھا اور سہما ہوا اس کے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

ساحر اس بچے کو دیکھ کے مسکرایا تھا وہ سائیڈ مانگ نکالے اس لڑکے کو جانتا تھا وہ اس کا کلاس فیلو تھا۔ اس لڑکے نے بھی اسے دیکھا تھا اور مسکرایا تھا۔ وہ بھی شاید اسے پہچان گیا تھا۔ ساحر کو باقی باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں لیکن اسے اتنا سمجھ میں آیا تھا کہ اس کا وہ معصوم سا کلاس فیلو اب اس کے ساتھ اس گھر میں رہنے والا تھا۔ اور وہ خوش تھا۔

☆☆☆

جھنجوڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور ساحر کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"مام ڈیڈ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ جلدی چلو ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔" ساحر کہہ کے تیزی سے پلٹ گیا تھا۔ ریان کا دماغ ماؤف ہوا تھا۔ چند لمحے لگے تھے اسے سمجھنے میں، وہ بیڈ سے نیچے اترا تھا۔ جوتے پہن کے سائیڈ ٹیبل سے والٹ اور موبائل اٹھا کہ وہ نیچے بھاگا تھا۔

چند سیال سکون سے گزرے تھے اور پھر چیزیں بدلنے لگی تھیں۔ ساحر اپنے باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ شبنم ایک طرف سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ فاروق علی ماتھے پہ بل ڈالے اسے ڈانٹ رہے تھے کیوں کہ اس کے گریڈز گر رہے تھے۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے شبنم کو دیکھا تھا۔ فاروق علی بزنس ٹرپ پہ گئے تھے اور پیچھے ساحر بیمار رہا تھا اور شبنم نے فاروق کو کوئی اور ہی کہانی بتائی تھی۔ اور اس دن ساحر کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ جھوٹ بھی بولتی ہیں۔ ساحر رزلٹ کارڈ پکڑے پلٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر جاتے ہوئے اس نے لاؤنج میں دیکھا تھا۔ وہاں غیر آرام دہ ریان کھڑا تھا۔ شبنم ٹانگ پہ ٹانگ جمائے صوفے پہ بیٹھی تھیں اور فاروق علی ریان کا رزلٹ کارڈ پکڑے اس کی تعریف کر رہے تھے۔ تب ہی ریان نے غیر ارادی طور پر اوپر دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور ساحر ایک سرد نظر اس پر ڈال کے اوپر چلا گیا تھا۔

ساحر ہسپتال کے ویران کوریڈور میں سرد دیوار سے ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

"چائے!"

ریان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ چائے کے دو کپ پکڑے کھڑا تھا۔ ساحر نے چپ چاپ کپ لیا تھا اور ریان اس کے سامنے پڑے بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے ریان! میرے اور ڈیڈ کے درمیان تو ابھی چیزیں بہتر ہونا شروع ہوئی تھیں۔" ساحر چائے کے کپ کو تکتے ہوئے بولا تھا۔ اس کا لہجہ پست تھا اور آواز میں خوف تھا۔

"فکر مت کرو، تمہارے ڈیڈ کو کچھ نہیں ہوگا۔" ریان نے تسلی دی تھی ساحر نے سر اٹھا کے اس کے نیل اور خراشیں لیے چہرے کو دیکھا تھا۔

"تمہاری مام کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔" ساحر آہستہ آواز میں بولا تھا۔ اور ریان نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ان دونوں کو اپنے بولے گئے الفاظ پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جانتے ہو اتنا عرصہ ہو گیا ہے ریان میں ڈیڈ کے گلے نہیں لگا۔ مجھے بس ایک بار سارے گلے شکوے ختم کر کے ان کے گلے لگنا ہے۔" ساحر چہرہ موڑے سنسان کوریڈور کو دیکھتے بولا تھا۔ وہ شاید آنکھوں میں آئی نمی چھپا رہا تھا۔

"اور مجھے بس مام کا ہاتھ پکڑے یہ کہنا ہے کہ میں ان کو کبھی چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔" ریان اسی کے لہجے میں بولا تھا اور ساحر نے گردن موڑ کے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تسلی بھی نہیں دے پا رہے تھے۔ ساحر رات کے اندھیرے میں چھت پہ بیٹھا ہاتھ میں پکڑی ٹارچ جلا بجھا رہا تھا جب ریان نوازمات سے بھری ٹرے اٹھائے اوپر آیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ساحر نے اسے گھورا تھا۔

"ڈنر نہیں کیا تھا نا تم نے اس لیے لے کر آیا ہوں۔"

"تمہاری مام کی باتوں سے میرا پیٹ بھر گیا تھا۔" ساحر نے ناپسندیدگی سے اسے ٹرے رکھتے دیکھا تھا۔ ریان نے بغل میں چپس کے پیکٹ بھی دبا رکھے تھے۔

"سوری۔" چیزیں رکھ کے وہ پلٹا تھا اور سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو اب؟" ساحر دبی دبی آواز

میں بولا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا ناراضی کا عنصر اب لہجے سے غائب تھا۔

''تمہاری کتابیں لینے جارہا ہوں۔ ہمیں تمہارا ہوم ورک کرنا ہے اور ٹیسٹ بھی تیار کرنا ہے۔ تاکہ تمہارے گریڈز دوبارہ اچھے ہوجائیں۔'' وہ گردن موڑ کے آہستہ آواز میں بولا تھا اور دوبارہ سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔

''سنو!'' ساحر نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ ''فریج میں آئس کریم پڑی ہے وہ بھی لیتے آنا۔''

ریان نے جواباً سر ہلایا تھا۔ تاریچ آن کر کے ایک طرف رکھ کے وہ ریان کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

وہ دونوں بے چین سے کوریڈور میں بیٹھے تھے۔ تب ہی نرس ان تک آئی تھی۔

''آپ دونوں کا کیا رشتہ ہے ان سے؟'' نرس نے ان دونوں کی شکل دیکھی تھی۔

''بیٹے! ہم بیٹے ہیں ان کے۔'' ساحر نے فوراً جواب دیا تھا۔ ریان نے چونک کے اس کی شکل دیکھی تھی۔

''آپ دونوں میرے ساتھ چلیں۔ ڈاکٹر بلا رہے ہیں۔'' وہ ان کے آگے آگے چلنے لگی تھی اور ساحر اور ریان اس کے پیچھے چل دیے تھے۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ نرس آپریشن تھیٹر کے سامنے جا کر رکی تھی۔ ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تھا۔

''یہ دونوں بیٹے ہیں ان کے۔'' نرس ڈاکٹر سے بولی ڈاکٹر نے ایک افسردہ نظر ان دونوں پہ ڈالی تھی۔

''سوری ہم انہیں نہیں بچا سکے۔'' دھیرے سے کہا۔ ریان نے دیوار کا سہارا لیا تھا اور ساحر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا بنچ پہ گرنے کے انداز میں بیٹھا۔

ساحر اور ریان کچن میں کھڑے کوکنگ کر رہے تھے جب ساحر کے ہاتھ میں موجود گرم چمنا غلطی سے ریان کے بازو پہ لگ گیا۔ ریان وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساحر اس کے بازو پہ دوا لگا رہا تھا جب شبنم اندر آئیں۔ دونوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' وہ ریان کا بازو دیکھتی بولی تھیں۔

''وہ ہم کوکنگ کر رہے تھے۔'' ساحر نے بولتے ہوئے ریان کو دیکھا تو اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ کچھ نہ بتائے لیکن ساحر نے بات جاری رکھی تھی۔

''تو غلطی سے گرم چمچہ ریان کے بازو پر لگ گیا۔'' ساحر نے سچ بول دیا تھا۔

''غلطی سے نہیں لگا تم سے۔'' شبنم کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

''جان بوجھ کے مجھے تکلیف دینے کے لیے تم نے کیا ہے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔

''مام اس نے جان بوجھ کے نہیں کیا غلطی سے لگا تھا۔'' ریان کو شبنم کا رویہ برا لگا تھا اور ساحر جو عموماً ایسی جھڑپ پہ یا تو ٹکا سا جواب دیتا تھا یا پیر پٹخ کے ایک آدھ چیز توڑ کے چلا جاتا تھا آج ہاتھ میں ٹیوب پکڑے وہیں کھڑا تھا اور ایک ٹرانس کے عالم میں شبنم کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ تکلیف جو ساحر انہیں دینا چاہتا تھا وہ آج اسے شبنم کے چہرے پہ نظر آئی تھی۔ جس طرح کہانیوں کے جادوگروں کی جان بے زبان طوطے میں ہوتی تھی ویسے ہی شبنم کی جان ریان میں تھی۔ ساحر مسکرایا تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے اور سامنے بیٹھا وکیل فاروق علی کی وصیت پڑھ کے سنا رہا تھا۔

''ان کی ول کے مطابق آپ دونوں .....''

وکیل بول رہا تھا اور ریان نے نرمی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

''ہم دونوں نہیں صرف ساحر۔''

''لیکن فاروق علی کی ول کے مطابق کچھ شیئرز .....''

''ساحر اکیلا سنبھالے گا۔ سب کچھ اور مجھے

امید ہے وہ بہت اچھے سے سنبھالے گا۔'' ریان سادگی سے بولا تھا اور وکیل نے ناسمجھی سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ اس سے پہلے کے وہ کچھ بولتا ادھیڑ عمر منیجر اندر آیا تھا۔

''السلام علیکم! میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اس نے لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کی شکل باری باری دیکھی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' ساحر کھڑا ہوا تھا وہ ایک ہفتے میں بڑا ہو گیا تھا۔ ''نہیں بالکل نہیں آپ بیٹھیں پلیز!'' وہ پھیکا سا مسکرایا تھا۔

''میں دراصل اکاؤنٹس اور کچھ دوسری ضروری چیزوں کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔'' منیجر بریف کیس ٹیبل پہ رکھ کے بیٹھتا بولا تھا۔

''ایکسکیوزمی!'' ریان معذرت کرتا اٹھ گیا لیکن ساحر وہیں بیٹھا رہا تھا اس نے وکیل کی پوری بات سنی تھی اور وہ زخمی سا مسکرایا تھا۔

کچن میں ہونے والے واقعے کے بعد ساحر اور ریان کے درمیان چیزیں بدل گئی تھیں۔ ساحر دور ہوا تھا تو ریان بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ساحر اور شبنم کے درمیان سرد جنگ عروج پہ تھی۔ شبنم نے فاروق کو مہرہ بنایا تھا اور ساحر کو تکلیف پہنچائی تھی تو ساحر نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا اس نے ریان کو مہرہ بنایا تھا اور شبنم کو اذیت پہنچائی تھی۔

ریان کے ساتھ برا کرنے کا اس کو گلٹ تھا۔ ایک اچھا دوست اور بھائی کھونے کا دکھ تھا لیکن یہ گلٹ اور دکھ اس نفرت پہ حاوی تھا جو وہ شبنم کے لیے محسوس کرتا تھا۔ ریان کو چوٹ پہنچانے سے لے کر اس کی چیزیں خراب کرنے تک ساحر نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے شبنم کو اذیت پہنچی تھی لیکن بالکل شبنم کی طرح سکون ساحر کو بھی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

ریان ایک بوسیدہ سے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے سفری بیگ زمین پہ رکھا تھا اور ایک تھکی تھکی نظر اس گھر پہ ڈالی تھی۔ گارے اور اینٹوں سے بنا وہ گھر ویران کھڑا تھا۔ اتنی دیر میں گاؤں کی کچی سڑک سے ایک بوڑھا چلتا ہوا ادھر آیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے اس خوب صورت نوجوان کو سر سے پیر تک دیکھا تھا۔

''میں ریان سفیر ہوں۔ سفیر احمد کا بیٹا۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ بوڑھے نے تنقیدی نظروں سے اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ واقعی سفیر احمد کا بیٹا تھا کیونکہ وہ بالکل اس کے جیسا تھا۔ ریان دروازہ دھکیل کے اندر آیا تھا۔

ساحر آفس سے فارغ ہو کر گھر آیا تھا تو شام ہو چکی تھی۔ ملازموں نے کھانا لگا دیا تھا۔ ساحر ہاتھ منہ دھو کے آیا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

''ریان کہاں ہے؟''

''کیا وہ کھانا کھا چکا ہے؟'' پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس نے سرسری سا سوال کیا تھا۔

''سر وہ تو چلے گئے ہیں!'' مؤدب کھڑے ملازم نے بتایا۔

''کہاں چلا گیا؟'' ساحر کے ہاتھ تھمے تھے۔

''زیادہ کچھ نہیں بتایا انہوں نے۔ بس اتنا بتایا تھا کہ وہ جا رہے ہیں۔'' ملازم سادگی سے بولا تھا۔ ساحر نے سر ہلایا تھا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

ریان گھر کے اندر آیا تھا تو بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے گر گیا۔ وہ جگہ تو بالکل رہنے کے قابل نہیں تھی۔ گھاس جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ مکان بھی خستہ حال تھا۔ وہ باہر بھاگا تھا اور دور جاتے آدمی کو آواز دی تھی۔

اسے بہت سا کام کرنا تھا۔ گھر صاف کروانا تھا، ضروری سامان لانا تھا اور اپنے لیے یہاں گاؤں میں کوئی کام ڈھونڈنا تھا۔ شہر میں اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ملازم اپنے کوارٹرز میں سونے جا چکے تھے۔

لائٹس جل رہی تھیں اور سارا گھر روشن تھا۔ ساحر نے ایک نظر اس خاموش محل پر ڈالی تھی۔ یہی تو وہ چاہتا تھا کہ ریان اور شبنم یہاں سے چلے جائیں۔ لیکن ایک

مسئلہ ہو گیا تھا ان کے ساتھ ڈیڈ بھی چلے گئے تھے اور اب اسے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ریان کے کمرے تک آیا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا وہ کالج یا یونیورسٹی جانے سے پہلے چھوڑ کے جاتا تھا۔

اس کے کمرے کو دیکھ لگتا تھا وہ کچھ دیر میں واپس آجائے گا۔ اس کی ساری چیزیں وہیں پڑی تھیں۔ وہ کچھ بھی لے کے نہیں گیا تھا۔ ساحر نے الماری کھولی تھی اس کے سارے کپڑے وہیں رکھے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پہ اس کا موبائل رکھا اور اسٹڈی ٹیبل پہ لیپ ٹاپ۔ ساحر باہر آگیا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

بعض اوقات ہم ساری زندگی جن چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ مل جائیں تو بے سکون کر دیتی ہیں۔ وہ نیچے لاؤنج میں آیا تھا وہاں صوفے پہ ڈیڈ بیٹھ کے ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ وہ ان کی جگہ پہ لیٹ گیا تھا۔ یہ سب بالکل اچھا نہیں تھا۔ جس طرح گھر ویران ہوا تھا ویسے ہی ساحر کی زندگی ویران ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دو کمروں کا چھوٹا سا گھر اب رہنے کے قابل ہو گیا تھا۔ شبنم نے جو چوڑیاں دی تھیں انہیں بیچ کر اس نے گھر کا کچھ سامان لیا تھا اور اس گھر کو رہنے کے قابل بنایا تھا۔ وہ صبح ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتا تھا اور شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا اس طرح گزرا ہو ہی جاتا تھا۔ دروازے سے ٹیک لگائے برآمدے میں بیٹھے اس نے کچے صحن کو دیکھا تھا جس میں ایک بڑا سا درخت لگا تھا۔ بچے ٹیوشن پڑھ کے جا چکے تھے اور اب مغرب کا وقت قریب آرہا تھا۔ سورج ڈھلنے والا تھا اور ریان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ اس وقت کو گزارنا تھا۔

ساحر نے خود کو مصروف کر لیا تھا لیکن زندگی کا وہ خالی پن کہیں نہیں گیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لنچ کرنے باہر آیا تھا۔ اور یہاں بھی گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا گھر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ مام، ڈیڈ اور ریان وہ تینوں تھے تو زندگی میں رنگ تھے وہ گئے تو ہر رنگ بے رنگ ہو گیا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کے اپنے آفس میں آیا تھا۔

"میں نے جو کام تم سے کہا تھا اس کا کیا بنا؟" وہ اپنے سکریٹری سے مخاطب ہوا تھا۔

"سر ریان سفیر کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں پتا چلا۔ دو ایڈریس ملے ہیں۔ ایک اس فلیٹ کا جہاں وہ سفیر احمد کی موت کے بعد اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرا اس کے والد سفیر احمد کا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتے تھے۔ عین ممکن ہے وہ وہیں گیا ہو۔ کیونکہ پہلے ایڈریس پہ اب کوئی اور فیملی رہتی ہے۔" سکریٹری مؤدب سا بولا تھا۔

"تو ٹھیک ہے کل کی میٹنگز ڈیلے کر دو ہم کل صبح ہی وہاں جا رہے ہیں۔" ساحر پرسکون سا مسکرایا تھا۔

☆☆☆

سفید لینڈ کروزر سفیر احمد کے خستہ حال گھر کے سامنے سے گزرتے کچے راستے پہ رکی تھی اور اندر سے گلاسز پہنے ساحر باہر آیا تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ، نیلی جینز اور سفید جاگرز پہن رکھے تھے۔ گلاسز اتار کے اس نے سرسری سی نظر اینٹوں سے بنے اس گھر پہ ڈالی تھی جس کے زنگ آلود گیٹ کے ساتھ دیوار پہ سفیر احمد کے نام کی تختی لگی تھی۔

ساحر نے دستک دی چند لمحوں بعد ریان نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔ ساحر کو سامنے دیکھ کے ریان کی آنکھیں پھیلی تھیں۔

"ساحر تم یہاں؟"

"اندر نہیں بلاؤ گے؟" ساحر نے مسکرا کر پوچھا

ریان نے ایک طرف ہٹ کے اسے راستہ دیا تھا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں کچے صحن میں لکڑی کی پرانی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"تم یہاں رہتے ہو؟" ساحر نے اس کے گھر دیکھ کر کہا۔ ریان نے سینے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھا تھا۔

"اور جاب کیا کرتے ہو؟" ساحر نے سوال پہ سوال کیا تھا۔

"تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولا تھا۔

"خیر یہاں ایک پرائمری اسکول ہے صبح وہاں پڑھاتا ہوں اور عصر کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔"

"تم ایم بی اے کر کے یہاں ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتے ہو۔" ساحر نے چائے کا کپ اٹھایا تھا جو ریان نے تھوڑی دیر پہلے لا کر رکھا تھا۔

"تمہیں یہاں کوئی ملٹی نیشنل کمپنی یا بینک نظر آرہا ہے؟" ریان اپنے سامنے چائے کا کپ اٹھا کے گھونٹ بھر کر سکون سے بولا تھا۔

"وہیں شہر میں کہیں رہ لیتے۔"

"ساحر!" ریان کپ ٹیبل پہ رکھ کے آگے ہوا تھا۔ "میرے باپ کیوں بن رہے ہو؟"

"بڑا بھائی!" ساحر نے ٹانگ پہ ٹانگ جما کے تصحیح کی تھی۔

"میں تم سے پورے چار ماہ بڑا ہوں ریان۔"

"بھائی؟" ریان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے سوتیلا بھائی۔" ساحر اطمینان سے بولا۔ ریان نے گہرا سانس لیا تھا۔ "میرا ایڈریس کیسے ملا؟"

"میں اب ایک بزنس مین ہوں۔ میرے اپنے ریسورسز ہیں۔"

"کوئی بہت ہی ضروری کام ہوگا جو تمہیں یہاں تک کھینچ لایا ہے کیونکہ تم تو میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔" ریان نے کپ میز پر رکھا تھا اور سپاٹ سا بولا تھا۔

"گھر چلو ریان!" ساحر نے بھی کپ میز پر رکھا تھا۔

"وہ میرا گھر نہیں ہے ساحر، وہ سب کچھ تمہارا ہے۔" ریان نے اس کی شکل دیکھی تھی۔

"وہ ہمارا گھر ہے ریان۔ میری فیملی میں بس اب تم ہی بچے ہو۔ ہم بھائی ہیں اور اس سے پہلے دوست تھے۔ اس لیے اب گھر چلو۔"

"گھر؟ فیملی؟ تم تو یہی چاہتے تھے نا!" ریان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"نہیں چاہتا تھا یار..... وہ سب تو تمہیں تکلیف دینے کے لیے کرتا تھا کیونکہ تمہیں تکلیف ہوتی تھی تو مام کو تکلیف ہوتی تھی۔" ساحر کا لہجہ پست ہوا تھا۔

"لیکن اس شام میرے اور مام کے درمیان چیزیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ اگر وہ دونوں زندہ رہتے تو ہم الگ نہ ہوتے۔ انہوں نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور میں نے ان کا پردہ رکھا تھا۔

میں ان کا وہ روپ ڈیڈ کے سامنے نہیں لانے والا تھا۔ ہمارے درمیان جو بھی لڑائی تھی وہ اس کمرے میں ختم ہو گئی تھی۔" ساحر نے بات مکمل کر کے گہرا سانس لیا تھا۔

"تم مجھ سے نفرت کرتے تھے ساحر؟" ریان کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

"میں بس مام کو اذیت پہنچانے کے لیے وہ سب کرتا تھا۔ آئی ایم سوری۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا اگر تم ہر بار میرے برا کرنے پہ اچھا نہ کرتے۔ میں شاید کبھی یہاں نہ آتا اگر تم وہ کر رہے ہوتے جو مام کہتی تھیں۔ یہ سب اس رات کچن میں شروع ہوا تھا جب غلطی سے میں نے تمہارا بازو جلا دیا تھا۔ اس رات میں نے مام کے چہرے پہ وہ اذیت دیکھی تھی جو میں انہیں دینا چاہتا تھا۔" ساحر قدرے ندامت سے بولا تھا۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟" ریان نے بس اسے دیکھا تھا۔

"گھر چلو ریان۔"

"میرا گھر یہ ہے ساحر۔" ریان نے ایک نظر اس بوسیدہ سے گھر پہ ڈالی تھی۔

"نہیں۔" ساحر نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ "تمہارا گھر وہ ہے جہاں تمہاری مام تھیں، ڈیڈ تھے اور۔" ساحر نے توقف کیا تھا۔ "ایک بھائی تھا!"

"ڈیڈ؟ بھائی؟" ریان چہرہ موڑ کر تلخی سے ہنسا تھا۔

"ہاں تم ٹھیک ہو شاید وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے لیکن تم غلط ہو وہ جو تمہارے لیے دل میں رکھتے تھے وہ صرف ترس نہیں تھا۔" ساحر اسی لہجے میں بولا تھا۔

"اور بھائی؟" ریان نے طنزیہ نظروں سے

اسے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔

"جو لڑکے تمہیں تنگ کرتے تھے اور باتیں سناتے تھے ان کی دھلائی کون کرتا تھا؟ جب میں تمہیں جان بوجھ کے چھوڑ جاتا تھا تو کیا کلاس فیلوز کو الہام ہوتا تھا کہ تمہیں پک اینڈ ڈراپ کرنا ہے؟ ڈیڈ کو خود سے پتا چل جاتا تھا کہ ریان کے گیجٹس بھی پرانے ہو گئے ہیں؟ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا یار! لیکن مام کی نفرت نے مجھے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ میں نے وہ سب بھی کر دیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" ساحر نے سینے پہ ہاتھ باندھے کندھے اچکائے تھے۔

"دیکھو ساحر ہم دونوں برابر نہیں ہیں اس لیے....." ریان اسے دیکھتے ہوئے بولا تو ساحر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"میں یہاں برابری کرنے یا دوستی کرنے نہیں آیا۔" ساحر آگے ہوا تھا۔ "میں تمہیں گھر لے جانے آیا ہوں۔"

"میرا وہاں کچھ نہیں ساحر، میں وہاں نہیں آ رہا۔ میں باقی کی زندگی تم پہ مسلط ہو کے نہیں گزارنا چاہتا۔" ریان چہرہ موڑ کہ دوسری طرف دیکھتے بولا تھا۔

"تم کسی پہ مسلط نہیں ہو رہے۔ کچھ بھی مفت میں نہیں لگا تم پہ۔" ساحر کی بات پہ ریان نے گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا۔

"تم کچھ بھی گرانٹڈ نہیں لے رہے ہیں۔ وہ ٹوئنٹی پرسنٹ شیئرز جو ڈیڈ نے تمہیں دیئے ہیں تمہارا حق ہے۔ تمہاری مام نے فلیٹ اور زیورات بیچ کہ جو پیسے ڈیڈ کو دیے تھے انہوں نے وہ انویسٹمنٹ کے طور پر لگائے تھے۔ اور تم جانتے ہو ریان کے میں کتنا ضدی ہوں۔ اس لیے گھر تو تمہیں جانا پڑے گا۔" ساحر سکون سے بولا تھا۔

"وہ قید خانہ اب گھر بن گیا؟" ریان نے ابرو چکائے تھے۔ اس کے پاس اب کوئی سوال نہیں بچا تھا۔ ساحر نے اس کے سارے سوالوں کے جواب دے دیے تھے۔ کوئی بوجھ تھا جو اس کے کندھوں سے

"نہیں شاید وہ گھر ہی تھا جو اب قید خانہ بن گیا ہے۔ اس لیے میرے قید خانے کے ساتھی۔ میرے ساتھ واپس چلو۔" ساحر سر کو خم دے کر کے بولا تھا۔

"اب تم دیکھ لو تمہیں کتنا ٹائم لینا ہے۔" ساحر موبائل نکال کے اس پر انگلیاں چلانے لگا تھا۔ ریان چند لمحے اسے ڈھٹائی سے بیٹھا دیکھتا رہا تھا اور پھر اندر چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ ایک سفری بیگ لیے باہر آیا تھا۔

"جانتے ہو میرا مسئلہ کیا ہے اینٹوں سے بنا یہ مکان گھر نہیں لگتا۔" وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کے جھکا تھا۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں بلیک میل ہو گیا ہوں۔"

"فکر مت کرو نہیں سمجھوں گا۔" ساحر کھڑا ہوا تھا۔

"یقین نہیں ہوتا کہ میں واقعی یہ کر رہا ہوں۔"

ریان سر جھٹکتا سفری بیگ اٹھائے باہر آتے ہوئے بولا۔ اور ساحر نے مسکراہٹ دبا کر گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے تھے۔

"اچھی بھلی نوکری تھی میری چھڑوا دی تم نے۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھتا مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔

"فکر مت کرو میرے بھائی تمہارا سی ای او تم سے راضی ہے اور آج سے ہم دونوں بزنس پارٹنرز بھی ہیں۔" ساحر گاڑی کا دروازہ کھول کہ اندر بیٹھا تھا۔

"ویسے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے؟" ساحر چلتی گاڑی سے باہر دیکھتا بولا تھا۔

"ہوں بولو۔ دوسرا کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔"

"تمہیں چائے بنانی نہیں آتی ریان اس لیے کہ کوشش بھی مت کیا کرو۔" ساحر جھرجھری لے کے بولا تھا۔

"میرا حوصلہ تو دیکھو میں اتنے مہینوں سے وہی چائے پی رہا ہوں۔" ریان ہنسا تھا۔ گاڑی کچے راستے سے گزر کر اب پکی سڑک پہ آ گئی تھی۔ ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

☆☆

فرح بخاری

شام شہر ہجر

مکمل ناول

میاندم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے، ندرت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی مریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میاندم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بد دماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

pklibrary.com

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں۔ اتفاقاً وسیلہ ایک پتا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر اسی پتے کی غرض سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارحم رضوانہ اور ان کی فیملی کو ڈھونڈ لیتا ہے اور شہناز اور دادی کو بھی ان سے ملوانے لاتا ہے۔ رضوانہ کا خوف ختم ہو جاتا ہے، شہناز ارحم کے لیے وسیلہ کا رشتہ مانگتی ہے۔ منصب کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

تحریم کا انتقال ہو جاتا ہے مومن کی شادی ایلیا سے ہو جاتی ہے وہ اس رشتہ کو قبول نہیں کر پاتا کیوں کہ اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ تانیہ عیسیٰ کے بھائی کا علاج کرتی ہے۔ وہ اس لڑکی کی شادی کا پتا چلنے پر خودکشی کر لیتا ہے۔ عیسیٰ اس سب کا ذمہ دار ڈاکٹر تانیہ کو سمجھتا ہے۔ اس کے کلینک پر توڑ پھوڑ کی جاتی ہے۔ وہ مینگورہ چھوڑ کر میاندم آ جاتے ہیں۔ شہناز شادی میں دادی کو نہیں لاتی۔ منصوبے کے تحت وہ وسیلہ کو اپنی ہیم پاگل بہن کے ساتھ تہ خانے میں بند کر دیتی ہے۔

وسیلہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے، منصب اپنے طور پر کسی کے ذریعے معلوم کرواتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ارحم چترال میں رہ رہا ہے اور دوسری شادی بھی کر چکا ہے، وہ مومن کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال بتاتا ہے۔

مومن رضوانہ اور ایلیا کے ساتھ تھانہ آتا ہے۔ وسیلہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوتی ہے، اس کی دماغی حالت خراب ہوجاتی ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ منصب کی مدد سے مومن شہناز اور ارحم کے خلاف رپورٹ درج کرواتا ہے۔ ارحم اور شہناز اپنی ملازمہ کے ذریعے ہاسپٹل میں وسیلہ کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں، عین وقت پر منصب آجاتا ہے۔

مومن وسیلہ کو میاندم لے آتا ہے۔ یہاں اس کا علاج ہوتا ہے لیکن اس کی دماغی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تانیہ کی مدد لی جاتی ہے۔

داؤدی منصب کو بتادیتی ہیں کہ وہ ان کا پوتا ہے، شہناز اسے مارنے کا پروگرام بناتی ہے اس لیے وہ منشی کی بیوی سے رضوانہ کا بیٹا تبدیل کردیتی ہیں۔ تاکہ اس کی جان بچ جائے۔

چودھویں قسط

''تمہاری شکل امی سے بہت ملتی ہے وسیلہ!'' میمونہ اس کی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر چہرہ اونچا کیے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ہمارے بابا کا رنگ گندمی سا تھا لیکن امی اتنی سفید تھیں کہ گال ہمیشہ سرخ رہتے تھے۔ میری اور رمشہ کی رنگت صاف ضرور ہے لیکن امی جیسی سفیدی تمہارے حصے میں آئی ہے۔''

''وسیلہ کی ہنسی اور ہونٹ اور دانت بھی بالکل امی جیسے ہیں۔'' رمشہ بھی بغور بہن کو دیکھ رہی تھی۔

''منصب کا دل یونہی تو۔'' میمونہ نے شوخی سے کہتے ایک دم زبان دانتوں میں دے کر خود کو روکا۔ وسیلہ شادی شدہ تھی، اور یہ وہ کیا بکنے جارہی تھی۔

''مجھے امی کی کوئی تصویر تو دکھاؤ۔'' وسیلہ نے خود ہی بات کو بدل دیا۔

''ارے ہاں، ہیں نا۔ تمہاری خاطر ہی پرانا البم ساتھ لائی ہوں۔'' میمونہ نے ہینڈ بیگ سے ایک البم نکال کر وسیلہ کی طرف بڑھایا۔

اس البم میں اس کے بابا، امی، منصب اور بہنوں کی بہت سی پرانی تصویریں تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں بار بار چھلک پڑتیں۔ یہ بھی کیسی انہونی تھی، وہ اپنے سگے والدین کو ان کے گزر جانے کے بعد دیکھ پارہی تھی اور یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ بجائے اس کے منصب اس کی امی سے قریب رہا تھا اور یہ تو تقریباً ہر تصویر سے ظاہر تھا کہ منصب کو اپنی ماں سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ رمشہ سے ہر تصویر کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھی۔ میمونہ ان دونوں کو معروف چھوڑ کر منصب کے کمرے میں آگئی۔ وہ آج صبح ہی اپنے شوہر کے ساتھ میاندم آئی تھی۔ منصب آفس سے آچکا تھا۔

اس وقت انیس کے ساتھ ہی بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ میمونہ اس کے کھانا کھانے کا انتظار کررہی تھی۔ اسے منصب سے کچھ بہت ضروری بات کرنی تھی۔

''آؤ بھئی۔۔۔ مل لیا بہن سے۔'' منصب اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔ میری بہن اس وقت اپنی حقیقی فیملی کا پرانا البم دیکھ رہی ہے۔''

''اچھا واہ۔ میری سیانی بہن تصویریں بھی ساتھ لائی ہے۔''

''جی..... اور اب سیانی بہن کو اپنے سیانے بھائی کا ایک مشورہ درکار ہے۔''

''ہاں ہاں ضرور..... کہو۔''

''آپ نے منصب سے بات کی؟'' میمونہ نے بجائے منصب سے بات کرنے کے انیس کو دیکھا۔

''نہیں۔ میں نے سوچا تم خود بات کرو۔''

"کیا ہوا بھئی۔۔ کیوں تجسس پھیلا رہی ہو۔" منصب کو ان کی باتوں سے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں وہ اصل میں منصب! رمشہ کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔"

"اچھا..... گڈ..... کون ہے؟"

"ہم سے زیادہ تم جانتے ہو اس کے بارے میں۔" اس بار انیس نے مسکرا کر کہا تو منصب کو مزید حیرت ہوئی۔ سوالیہ نظروں سے میمونہ کو دیکھا۔

"تمہارے دوست راشد کی امی اور بہنیں آئی تھیں۔ راشد کا رشتہ لے کر۔"

"ہائیں۔۔ اچھا۔" وہ حیرت بھری ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"ارے ہاں۔۔ اس روز عرفان کے ولیمے والے دن ایسا ہی کچھ تو کہہ رہا تھا۔ گدھا کہیں کا۔" وہ پھر زور سے ہنس دیا۔

"کیسے لوگ ہیں منصب۔۔ اور لڑکا؟" میمونہ کو منصب کی رائے جاننے کا شدید اشتیاق ہو رہا تھا۔

"بہت اچھی فیملی ہے۔ اور لڑکا تو بہت ہی اچھا۔ میرا بچپن کا دوست ہے، اور اس کی سبھی خوبیوں خامیوں سے واقف ہوں جن کی بنا پر بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ راشد سے اچھا لڑکا رمشہ کے لیے ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ بہت دل سے اور فوری رائے دے رہا تھا۔ میمونہ اور انیس نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ہم دونوں راستہ بھر یہی دعا کرتے رہے تھے کہ ہمیں تو رشتہ ہر لحاظ سے اچھا لگا ہے اب اللہ کرے منصب کوئی ایسی ویسی بات نہ کر دے۔"

"نہیں، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے سن کر۔ بہت محنتی اور شریف لڑکا ہے اور اس سے بڑھ کر کسی خوبی کی ضرورت بھی نہیں۔"

"تو پھر ہاں بول دیں؟"

"رمشہ سے پوچھ کر جانا۔ باقی میری طرف سے ہاں ہے۔"

"رمشہ سے میں پوچھ لوں گی اور ہاں شادی وہ تین چار ماہ کے اندر ہی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں صحیح ہے۔ ہمیں بھی دیر کر کے کیا ملے گا۔"

"ٹھیک ہے مزید کوئی بات ہو تو راشد سے ہی کر لینا۔"

"اس کے والد سے ہی کرنی پڑے گی۔ وہ گدھا تو پچھلے کئی روز سے میری کال نہیں اٹھا رہا۔ وجہ تو مجھے اب سمجھ میں آ رہی ہے۔" وہ ہنسا تو میمونہ اور انیس نے بھی قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

"مومن جی..... بات سنیں۔" وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مومن مسکراتے ہوئے پلٹا اور بازو اس کے گلے میں ڈال کر اپنے قریب کیا۔

"کہو مومن کی جان۔ کیا سنانا ہے؟"

"جی۔۔ وہ۔ تانیہ ہے نا۔" ایلیا پکڑے جانے پر بری طرح نروس ہو گئی۔

"ہوں..... ہوں..... ہے۔ تو؟" مومن نے شرارت سے اسے کچھ اور قریب کیا۔

"وہ، اس کی صلح کروانی ہے۔" ایلیا نے تھوک نگلا۔

"اچھا۔؟" مومن نے بھنویں اکٹھی کیں، بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی "کس سے؟"

"جی، وہ ان کے منگیتر سے۔" ایلیا نے پھر بے ربط جملہ جوڑا۔

"کیا بے سر پیر کی بولے جا رہی ہو ایلیا۔" مومن کو ابھی بھی بات پلے نہیں پڑی۔

"ہاں تو دور سے بات کریں نا۔" وہ منہ بناتے خود ہی پرے ہٹ گئی۔ مومن نے زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر پلنگ کے کنارے بیٹھ کر کلائی سے گھڑی اتارنے لگا۔

"ہاں تو۔ اب کہو۔"

"وہ نا..... تانیہ کے منگیتر عیسیٰ ہیں نا۔ انہوں نے تانیہ کے ابو سے ملاقات کی تھی، وہ معافی مانگ کر رشتہ دوبارہ بحال کرنا چاہتے ہیں۔ تانیہ کے ابو نے فیصلہ تانیہ پر چھوڑا کہ جیسا وہ کہے۔۔ اور تانیہ

اب انکاری ہے۔ وہ عیسیٰ پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی۔"

"ہوں۔" اچھا۔ مومن نے بغور اس کی بات سنی۔

"لیکن منصب بھیا نے بتایا کہ عیسیٰ انہیں برابر کال کر کے صلح پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک بار تانیہ سے روبرو بات ہو جائے۔"

"ہوں۔" سمجھ گیا۔ مومن نے سر ہلایا "ویسے تانیہ کو ایک بار تو سن لینا چاہیے۔"

"ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں، لیکن وہ ہچکچا رہی ہے۔"

"کیا اسے کوئی ڈر ہے؟"

"نہیں، کہتی ہے۔ دوسرا موقع نہیں دینا چاہتی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے، پہلے اسے سن لے، اور اگر سننے کے بعد بھی لگے کہ دوسرا موقع نہیں دینا چاہیئے تو بے شک انکار کر دے، اور یہ بات اسے وسیلہ بہتر سمجھا سکتی ہے۔ وہ وکیل ہے اور وکیل سے بات کرنا اسے آتا ہے۔"

"جی۔۔ لیکن۔" ایلیا کچھ جھجک سی گئی۔ انداز کچھ خجالت بھرا تھا۔ مومن نے ابرو اٹھائے۔

"وہ، میں اور رمشہ سوچ رہے تھے کہ اُن دونوں کو اتفاقاً کہیں ملوا دیا جائے۔" وہ آخر میں شرمندہ سی ہنس دی۔ مومن کے ہونٹ بھی مسکرا دیئے۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر پھر ایلیا کے قریب آیا اور کلائی سے پکڑ کر سامنے کھڑا کیا۔

"ایسی شرارتیں میری بیگم کو کب سے سوجھنا شروع ہوئیں۔۔ ہوں۔؟" وہ اسے مسکراتی شوخ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایلیا نے جھینپ کر لب دانتوں میں دبائے۔

"آپ سے ہی سیکھا ہے۔"

"واہ۔۔ سیدھے مجھ پر الزام۔ وہ کیسے؟"

"اس روز آپ مجھے تانیہ کو ان کے گھر چھوڑنے کے لیے ساتھ لے گئے اور اسے ڈراپ کرنے کے بعد پارک لے گئے تھے۔ وہاں بنچ پر بیٹھ کر جب ہم نے باتیں کی تھیں۔" وہ سر جھکائے شرما کر یاد دلانے لگی۔

"تمہیں اچھا لگا تھا؟" وہ اسے اپنائیت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بہت اچھا۔" اس نے پلکیں جھپکیں۔ "پارک کا بے حد پرسکون ماحول، بادلوں بھری سہ پہر۔ پرندوں کا شور، ٹھنڈی ہوا۔ آپ کی باتیں۔ دل چاہتا ہے مومن جی، ایسے پل روزانہ ہی کچھ دیر کے لیے ہماری زندگی میں آیا کریں۔"

"یار سچ کہتی ہو۔" مومن نے اسے اپنے قریب کیا ایسا کرنے سے نجانے کیوں اندر تک سکون بھر جاتا تھا۔ ایلیا کی آس پاس موجودگی مومن کے لیے ایک نعمت ایک تحفے سے کم نہ تھی۔

"میرا بھی بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن یہ روزانہ کا معمول، ذمہ داریاں، بکھیڑے اپنے لیے وقت کہاں دیتے ہیں۔ ایسے میں مجھے اپنے کمرے میں آنا بھی میسر ہو جاتا ہے تو اسے میں اپنے لیے نعمت تصور کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں شکر ہے ہمیں یہ پناہ گاہ میسر تھی۔ ورنہ دو معصوم چڑیاں آخر کرتے بھی کیا۔" وہ آخر میں ہنسنے لگا۔

"بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں، تانیہ اور عیسیٰ کا بتائیں نا۔"

"ٹھیک ہے میں منصب سے بات کرتا ہوں۔"

"جی۔ وہ سر ہلاتے جانے کے لیے پلٹی لیکن مومن نے بازو سے پکڑ کر روکا۔ ایلیا نے تعجب سے نظریں اٹھائیں۔"

"شام کو تیار رہنا۔ آج ہم چلیں گے ٹھنڈی ہوا کھانے اور پرندوں کے نغمے سننے۔"

"ہوں....." وہ مسکرا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"اری کم بخت..... جلدی نکال۔ جلائے گی کیا۔" شہناز بیگم نے خمارہ کے سر پر تھپڑ لگایا۔ وہ ڈر کر فوراً تندور پہ جھکی۔ شہناز اس دوران چنگیر میں

رکھی گرم روٹیاں گننے لگیں۔

''چھوڑیں یہ سب۔'' جلدی سے میری بات سنیں۔ پشت سے اچانک ہی ارحم کی آواز سنائی دی تو شہناز تعجب سے پلٹیں۔ ارحم صبح سے ڈیرے پر بیٹھا تھا۔ وہ کام چھوڑ کر اس کے پیچھے چل پڑیں۔ نجانے کیوں ارحم کا لہجہ اس کا انداز کچھ انہونی کی پریشانی لیے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئیں۔

''کیا ہوا ارحم۔۔ خیریت تو ہے نا؟''

''مجھے پولیس اسٹیشن بلایا تھا اس آفیسر شفقت نے۔'' وہ مٹھیاں بھینچے مسلسل کسی سوچ میں تھا۔

''تو..... ہوا کیا ہے۔'' شہناز کا دل بھی ہول گیا۔

''چترال سے انہوں نے پتا کروالیا ہے جس کے مطابق میں وسیلہ سے شادی کے فوراً بعد ہی چترال پہنچ گیا تھا اور سارہ کی رپورٹ سے بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ حمل کتنے ماہ کا ہے۔ اب نہیں چھپا سکتے۔''

''تو کچھ دے دلا کر نمٹاؤ۔''

''آپ بھول رہی ہیں کہ اس سب کی بیک پر وہ منصب ہے۔۔ اب کیا اسے رشوت دوں۔۔ اور یہ بھی مت بھولا کریں کہ ہم ضمانت پر رہا ہوئے ہیں۔ یہ تلوار وقتی ہمارے سروں سے ٹلی ہے۔۔ اور اب غور سے سنیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا شہناز کی توجہ تو تھی ہی مکمل اسی کی جانب۔

''میں وسیلہ کو طلاق دے رہا ہوں۔ یعنی وہ جو خلع اس نے دائر کر رکھی ہے اس پر سائن کر رہا ہوں۔''

''اس سے کیا ہوگا۔'' شہناز کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''وسیلہ کو اس زبردستی کے رشتے سے نجات ملے گی تو مسائل ہمارے ہی کم ہوں گے۔ یہ ایک طرح سے میری طرف سے اپنی سارہ سے شادی والی غلطی کا ازالہ ہوگا۔ اور اس وقت مجھے قانون کی نظر میں اپنے جرم کم کرنے ہیں۔ جہاں تک بات ہے وسیلہ پر تہمت خانے میں مظالم کرنے کا۔۔ تو اس کا جواب آپ خود دیں۔'' اس نے ہاتھ کھڑے کر دیے جس پر شہناز پر مزید پہاڑ ٹوٹا۔

''تو تم ماں کو اکیلا چھوڑ رہے ہو۔''

''میں نے آپ سے پہلے ہی پوچھا تھا کہ۔۔ پلان کرنے سے پہلے کیا سب کچھ آپ کے ذہن میں ہے۔ آپ نے کہا تھا سب سوچ لیا ہے۔ اور اب میں کیا کروں کہ آپ ایک ذرا سا حادثہ کروا کہ اس کی جان بھی نہیں لے سکیں۔''

''اچھا وہ چھوڑو۔ یہ بتاؤ خلع سے مسائل کم ہو سکتے ہیں۔''

''بالکل ہو سکتے ہیں۔ کم از کم یہ منصب ہمارا پیچھا چھوڑ سکتا ہے۔ اسے ہی دلچسپی ہے نا اس وسیلہ سے تو ٹھیک ہے، لے جانے دیں اسے۔''

''ہاں تو پھر جلدی نمٹاؤ اس خلع والے معاملے کو۔''

''اور آپ..... آپ کیا کریں گی۔'' اسے بھی مارے باندھے ماں کا خیال آ ہی گیا۔

''بس کیا کہوں گی، اپنی لگی، بہن دکھا کر رضوانہ کی زیادتیاں بتاؤں گی، شاید مجھے بھی رعایت مل جائے۔''

''ہوں۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے، اب تو جرم قبول کر لینے میں ہی عافیت ہے۔ بہر حال میں خلع کے پیپرز سائن کر کے بھیج رہا ہوں۔ آج ہی۔'' وہ اسی تیزی سے واپس باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''تم دیکھنا منصب۔ گلناز ایک دن بولنے بھی لگے گی اور بالکل نارمل لوگوں کی طرح بی ہیو کرے گی۔''

''ڈیئر! ہم بچپن سے انہیں ایسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ اتنا آسان کہاں ہے۔'' منصب کچھ زیادہ پر امید نہیں تھا۔ جیپ کی اسپیڈ کم کرتے ایک موڑ کاٹا۔

وہ تانیہ کو واپس اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ آج کل وہ بڑی شدومد سے گلناز کا علاج کرنے میں لگی تھی۔ حالانکہ کسی نے بھی اس سے کہا نہیں تھا لیکن گلناز کو دیکھ کر اسے خود ہی ایسا لگا کہ اِس عورت کو اب تک کے وقت میں ٹھیک سے ہینڈل نہیں کیا گیا۔ وہ صبح سویرے روزانہ ہی ان کے ہاں آجاتی اور دوپہر تک لگاتار گلناز کے ساتھ وقت گزارتی۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی، اسے واک کروانے، سارا گھر دکھانے، ہر چیز کے متعلق بات کرنے پر اکساتی۔ ساتھ ساتھ دوا میں بھی جاری تھیں۔

"اصل مسئلہ یہ ہے منصب! کہ اِن کے ساتھ اب تک کے وقت میں ویسے پیش ہی نہیں آیا گیا جیسا ان مریضوں کے ساتھ آنا چاہیے۔ ان کے کیس میں بگاڑ کے ذمہ دار دراصل وہ آس پاس کے لوگ ہیں جنہوں نے انہیں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کا دماغ کسی شدید صدمے کے زیر اثر ہے۔ اور جب سے یہ اس اثر میں ہیں انہیں تب ہی کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دینا چاہیے تھا۔ یقین کرو کہ ان کے اس حال تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ یہ برسوں سے جمود کا شکار ہیں، جسے توڑنے کے لیے بھی تو بہت محنت لگتی ہے اور کبھی بس ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن اِن کی بدقسمتی کہ وہ لمحہ برسوں بیت گئے ابھی تک ان کی زندگی میں نہیں آسکا۔" تانیہ ایک آہ بھر کر سامنے دیکھتے ایک دم چونکی۔ یہ راستہ اس کے گھر کا تو نہیں تھا۔

"راستہ تبدیل ہے نا منصب؟" اس نے حیرت سے منصب کو دیکھا۔

"ہوں۔۔ آ گیا تمہیں ہوش۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا، کیونکہ وہ لگاتار گلناز کے موضوع پر بولے جا رہی تھی۔

"تو۔" وہ حیران ہوئی "جانا کہاں ہے؟"

"جانا۔۔۔ بس۔۔ یہیں۔۔" اس نے تھوڑا اور آگے آنے پر کار کو ایک طرف پہ روکا۔ تانیہ نے باہر دیکھا تو وہ ایک فیملی پارک کے باہر رکے تھے۔ اس نے سوالیہ منصب کی طرف دیکھا۔

"اندر کوئی تمہارا منتظر ہے۔" اس نے ابرو اٹھایا۔

"کون۔۔ وہ ذرا دیر کو رکی "عیسیٰ؟" اس نے تائید کے انداز میں منصب کو دیکھا تو لہجے میں بھرپور حیرت تھی۔ منصب نے سر اثبات میں ہلایا۔

"ہاں۔ عیسیٰ نے ہم سے فورا مانگی کہ وہ ایک بار تم سے مل کر بات کرنا چاہتا ہے۔ اور ہاں ٹینشن مت لو۔ میں یہیں موجود رہوں گا۔ تم جب چاہے واپس آسکتی ہو۔ خود کو اکیلا مت سمجھنا۔" منصب نے اس بار سنجیدگی سے کہا تو تانیہ نے خاموشی سے منصب کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟" منصب اس کی چپ پر متعجب ہوا۔

"کیا کہوں گی مل کر؟"

"تم کچھ مت کہو، بہتر ہوگا اِس ملاقات میں صرف اس کو۔ سنو اور جب رہ کر جانچنے کی کوشش کرو، شاید تمہیں اس کی نیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔"

"ہوں۔۔۔" تانیہ کو بات سمجھ میں آگئی اور اب اس کے لیے اس اجنبی ملاقات سے نمٹنا بھی قدرے آسان ہو گیا "تھینکس منصب۔" اس نے ہلکا سا مسکرا کر منصب کو دیکھا اور کار کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھتے بالآخر پارک کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

"امی۔ یہ ڈاک سے کچھ موصول ہوا ہے۔ اور نام وسیلہ کا لکھا ہوا ہے۔" ایلیا ایک لفافہ لیے اندر آئی تو چہرے پر کچھ پریشانی سی تھی۔ آخر وسیلہ کے نام کس نے ڈاک بھیجی ہوگی۔

"وسیلہ کے نام۔" رضوانہ بھی حیران ہوئیں۔

"اچھا تم خود ہی کھول لو۔ وسیلہ کو بعد میں دینا۔ مومن تو ابھی آفس سے نہیں آیا تھا اور منصب کچھ دیر پہلے ہی تانیہ کو اس کے گھر لے کر گیا تھا۔"

"یہ۔۔۔ تو۔۔۔" اس نے سخت حیرت سے سر

اٹھایا، رضوانہ اسی کا منہ تک رہی تھیں۔
"بولو بھی ایلیا۔ کیا ہے؟"
"امی یہ ارحم کی طرف سے طلاق نامہ۔ انہوں نے آپی کے خلع کے پیپرز پر سائن کر کے انہیں آزاد کر دیا ہے۔"
"اچھا؟" رضوانہ قطعی بے یقین تھیں۔ بات اگرچہ خوشی کی تھی۔ ان کی بچی کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹلی تھی۔ لیکن جان کے دشمنوں کی طرف سے ایسی نوید کا ملنا فطری سی بات ہے کہ کچھ کھٹکا سا دیتا ہے۔
"کیا ہوا۔ کون تھا دروازے پر۔" وسیلہ کمرے میں داخل ہوئی تو انگلی سے عابس کو پکڑ رکھا تھا۔ بچے اب دھیرے دھیرے چلنا شروع ہو چکے تھے۔
"کیا ہے یہ؟" اس نے ایلیا کے ہاتھ میں پیپر دیکھا تو سوالیہ امی کی طرف دیکھا۔
"ارحم کی طرف سے ہے۔" انہوں نے بتانا شروع کیا "خلع مل گئی ہے آپ کو۔"
"اچھا؟" وہ بھی قطعی بے یقین تھی۔ حیران ہو کر پیپر ایلیا سے لیا اور خود دیکھنا شروع کیا "ہاں، بالکل۔ ارحم نے سائن کر دیئے ہیں۔" وہ حیران حیران سی پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ معاملہ انہیں اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں لگا تھا۔ لیکن جب ہو چکا تو وسیلہ سمیت سب ہی خاموش ہو گئے۔ کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ عورت ہو یا مرد۔ شادی جیسے نئے سفر کا آغاز اس کی زندگی میں ایک بالکل نیا موڑ لینے جیسا ہوتا ہے۔ ایک بالکل نئی انجان سڑک کہ جس کی منزل کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ امید البتہ بہت بہترین کی ہوتی ہے۔ رضوانہ اس پیپر کو ایک ماں کی نظر سے دیکھتے یہی سوچ پائیں کہ ان کی بچی کا نصیب بھی یہ کیسی منزل پہ رُکا تھا۔ کوئی بھی ماں کبھی بھی اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت یہ نہیں سوچ سکتی کہ ایک دن اس کی بیٹی کا سفر پلٹ کر پھر ان کی چوکھٹ پہ آ رکے گا۔ ایلیا خاموش کھڑی بہن کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ جس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا وہ گزرے آٹھ نو ماہ کو کسی فلم کی طرح سوچ رہی تھی۔
"آں..... وہ مومن کو بتا دوں؟" ایلیا نے ہی ماحول کی خاموشی کو توڑا "اور منصب بھیا کو۔"
"ہاں، مومن تو شاید راستے میں ہو۔ آتا ہی ہوگا۔ تب بتا دینا۔" اچھا میں بھیا کو کال کرتی ہوں۔" ایلیا موبائل منصب کا نمبر ملانے لگی۔
"ہاں، ایلیا۔ کہو۔" سب خیریت ہے۔ منصب ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو تانیہ کو لے کر گھر سے نکلا تھا۔ اور اس وقت پارک کے باہر اپنی جیپ میں ہی بیٹھا تھا۔ ایلیا نے جواباً خلع والی بات کہہ سنائی۔
"او۔" منصب بھی بن کر بری طرح حیران ہوا۔ ارحم نے بنا انہیں کسی الجھن میں ڈالے اتنی آسانی سے خلع دے دی تھی۔ تو کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"وسیلہ کو بتایا؟"
"جی۔ آپی نے خود دیکھا ہے پیپر۔"
"میں ویسے شفقت صاحب سے پوچھتا ہوں۔ نجانے وہاں ایسے کیا معاملات چل رہے ہیں کہ ارحم نے سر سے بوجھ کی طرح اس معاملے کو اتارا ہے۔" اس نے ایلیا سے اجازت لے کر فوراً اے ایس پی شفقت کو کال ملائی، اور وسیلہ کی خلع والی بات سے آگاہ کیا۔
"میں سمجھ گیا منصب۔" شفقت احمد نے متانت سے سر ہلایا۔
'ارحم کی دوسری شادی، دوسری بیوی کی میڈیکل رپورٹ وغیرہ سب اس کے خلاف جا رہے ہیں۔ ایسے میں اسے سزا ہو سکتی ہے۔ اس نے ضرور سزا وغیرہ سے بچنے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔ اور اب وہ یقیناً آپ سے معافی کا طلب گار ہوگا۔"
"لیکن وسیلہ کو قید میں رکھنا، تشدد، اس کی ماں کا اقدام قتل۔ وہ سب تو قابل معافی نہیں ہو سکتے۔"
"بالکل۔ ایسا ہی ہے منصب۔ لیکن وہ وسیلہ کو آزاد کر کے اپنی طرف سے اپنے جرائم کا اثر کم

کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وسیلہ کے حوالے سے تو خیر میں اسے ایک اچھی خبر سمجھ رہا ہوں۔ وہ ابھی حال میں ہی ایک بہت بڑے کرائسس سے نکلی ہے۔ اسے اچھی خبروں کی اشد ضرورت ہے۔ تم سب اسے خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ اور۔ ہاں۔ یاد آیا۔" شفقت احمد کو بڑی دیر بعد کچھ خیال آیا تو ایک فائل نیچے سے نکال کر اپنے سامنے رکھی کھول کر ایک صفحہ نکالا۔

"میں ابھی خود بھی تمہیں کال کرنے والا تھا۔ یہ لوگ ویسے سدھرنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ارحم کی ماں نے تم پر ایک اور کیس دائر کیا ہے۔"

"ایک اور کیس۔ وہ کیا؟" منصب چونکا ہوا۔

"ہاں۔ اس کی خالہ کو جس بے جا میں رکھنے کا کیس ہے۔"

"اوہ....." منصب بری طرح حیران ہوا۔

سچ مچ بہت ہی کمینی ذہنیت کے مالک تھے یہ لوگ۔"

"پھر؟"

"کوئی بڑی بات نہیں۔ اس معاملے میں ویسے میں تمہاری ہیلپ کرنے کو تیار ہوں۔ میں آج ہی ایک رپورٹ تیار کر دیتا ہوں جس میں لکھا ہوگا کہ ذہنی معذور اس خاتون کو منصب کی کسٹڈی میں دینے کی اجازت میں نے دی تھی۔ تم بھی چونکہ اب حویلی کا ایک فرد ہو تو اس رشتے کی حیثیت سے تمہیں کسٹڈی دی جا سکتی ہے۔"

"ہوں۔" منصب نے سر ہلایا۔

"اور منصب، بہتر ہوگا کہ تم اس عورت کو واپس حویلی لے آؤ۔ یہاں تو سمجھوا چھائی کرنا ہی گلے پڑ رہا ہے۔" شفقت صاحب مسکرائے تو منصب بھی ہنس دیا۔

"ہاں۔ بالکل۔ میں خود انہیں واپس لے آتا ہوں۔ او کے اللہ حافظ۔" وہ کال ختم کر کے پارک کے دروازے کو دیکھنے لگا۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے تانیہ اندر گئی تھی۔

☆☆☆

سرما کی اس خاموش سی دوپہر میں پارک اس دن بالکل ہی ویران اور خاموش تھا۔ تانیہ کو دور سے آتے دیکھ کر ہی عیسیٰ بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بلیک اور اسکن کلر کے ڈریس کے ساتھ بلیک شال اوڑھے وہ آج بھی بہت سوبر اور بارعب لگ رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل میں تانیہ کو دیکھ کر پہلا ڈر یہی پیدا ہوا کہ کہیں وہ اس پیاری ہستی کو ہمیشہ کے لیے کھو نہ دے۔ قریب آنے پر سلام میں پہل بھی عیسیٰ نے کی اور تانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی ہلکا سا سر ہلا کر بینچ کے کنارے بیٹھ گئی۔ یہ مرغزار والے واقعے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ تب کا آمنا سامنا تو لاحاصل اور ادھورا سا رہا تھا اور آج کی ملاقات۔۔۔ قبل از وقت کچھ بھی کہنا بے معنی تھا۔ منصب صحیح کہتا تھا آج اسے صرف عیسیٰ کو سننا تھا۔ تب ہی۔

"یہ سات ماہ پہلے کی وہ رپورٹ ہے جو میں نے پولیس میں تمہارے خلاف درج کروائی تھی۔" عیسیٰ نے اس کی گود میں ایک پیپر رکھا تو تانیہ نے تعجب سے سر اٹھا کر عیسیٰ کو دیکھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بنا کوئی باقاعدہ بات چیت شروع کیے عیسیٰ نے نجانے کیا دکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ابھی کچھ بھی کہہ نہیں پائی کہ عیسیٰ نے ایک اور پیپر اس کے گھٹنے پہ رکھا۔

"یہ اس کے محض پانچ دن بعد کی وہ رپورٹ جو میں نے اپنی پچھلی رپورٹ واپس لینے کے لیے داخل کی۔ ساتھ ڈرائیور اشفاق کا بیان ہے جس میں اس نے بتایا کہ حادثہ بریک فیل ہونے کی وجہ سے پیش آیا۔ صہیب کی موت سو سائڈ کے بجائے ایک حادثہ تھی جس کی ذمہ داری کسی فرد پر عائد نہیں ہوتی۔"

"لیکن یہ آپ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"منصب نے مجھ سے کہا کہ میری واپسی کو اگر تانیہ کے ہاں شک کی نظر دیکھا جائے تو اس پر مجھے بجائے خفا ہونے کے اپنی سچائی کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ رپورٹس چونکہ کئی ماہ پہلے کی ہیں اور تاریخ کے ساتھ

میرے پاس موجود ہیں تو سوچا آپ کو دکھا دوں۔ میرا ارادہ قطعاً کسی بدلے وغیرہ کا نہیں ہے۔ جو میں نے آپ کو بتایا وہی اصل سچ ہے یہ اور یہ پیپرز اس کا ثبوت۔"

"آئی ایم سوری عیسیٰ۔۔۔ آپ شاید ہرٹ ہوئے ہیں اس بات سے۔" تانیہ نے پیپرز اس کی طرف واپس بڑھائے تو لہجے میں سخت پشیمانی سی تھی ،اس کا نرم دل کسی کی ذرا سی عاجزی بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

"دراصل میری پیشنٹ وسیلہ کے ساتھ حال ہی میں جو کچھ پیش آیا اس کا اثر ہم سب کے ذہنوں پر بہت تازہ ہے۔ اور وہ ابھی بھی اس کرائسس سے پوری طرح باہر نہیں نکلیں۔ ایسے میں آپ کی واپسی۔۔۔ اور اُدھر مرغزار میں جس انداز سے یہ واپسی ہوئی، اس نے بلاوجہ وہموں میں ڈال دیا۔"

"آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے تانیہ..... میں نے یہ کاغذات واقعی اپنے کہے کا یقین دلانے کے لیے دکھائے ہیں۔ اس میں ناراضی نہیں شامل نہیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں میرا طریقہ ہمیشہ سے بے ڈھنگا رہا ہے۔ اس بار بھی شاید یہی غلطی کر دی۔" مسکرایا تو تانیہ بھی ہنس دی۔

"وہ تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہماری بات کا برا نہیں مانا تھا بلکہ ہماری مجبوری کو سمجھا۔"

"جی بالکل۔۔۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ پوری تسلی کے بعد واپس آئیں۔"

"لیکن میرے ذہن میں ایک الجھن ہے۔ اس کا میں نے کسی اور سے ذکر بھی نہیں کیا کیونکہ یہ بات صرف آپ سے پوچھنے کی تھی۔"

"ہاں کہو۔" عیسیٰ مکمل متوجہ ہوا۔

"آپ کی والدہ نے اپنا بیٹا کھویا ہے۔ ان کے درد کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے تو کیا وہ مجھے قبول کر لیں گی۔ کیا مجھے دیکھ کر ان کے ذہن میں کوئی تلخ یاد۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے تانیہ! جبکہ انہیں بھی حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔"

"جی، وہ تو ہے لیکن مجھے لگا شاید میرا آپ کی لائف میں آنا ان کے لیے کوئی تلخ تجربہ نہ رہا ہو۔"

"ایکچلی درمیان میں اور بھی اتنا کچھ ہوا ہے کہ وہ تو خود شدت سے تمہاری آمد کی منتظر ہیں۔" عیسیٰ جیسے کچھ کہتے کہتے رُکا تو تانیہ نے چونک کر دیکھا۔

"درمیان میں۔ کیا مطلب، اور کیا ہوا ہے؟"

"میرے ماموں ہیں رفاقت، شاید میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ انہیں بمع ان کی فیملی کے میں اپنے ہاں لایا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ امی کے کہنے پر ہی ان کے بھائی کو اپنے ہاں سیٹل کیا، وہ ماموں اپنی بیٹی مجھ سے بیاہنا چاہتے تھے، ہم نے ویسے بھی ان کی مرضی کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن تم سے میری منگنی کے بعد ان کا غصہ کافی کھل کر سامنے آیا۔ میں اب تک کے وقت میں ان کو نہایت بے ضرر انسان سمجھتا رہا تھا۔ لیکن کسی بھی انسان کو اس کے ظاہر سے پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

تمہارے ساتھ معاملات کشیدہ ہوئے تو انہوں نے اپنی کوششیں پھر سے تیز کر دیں، میری امی کو انہوں نے صرف مجبور ہی نہیں کیا بلکہ بلیک میل بھی کیا کہ وہ ہر حال میں ان کی بیٹی کو بہو بنا کر لے آئیں۔ امی تو مجبور بھی ہو گئی تھیں لیکن میں جب کسی طور نہیں مانا تو مجھ پر زیادتی کا الزام لگا کر ثانیہ کو مجھ پر تھوپنے کی کوشش کی گئی۔ خاندان میں میری عزت کو اتنا اُچھالا گیا کہ چار لوگوں میں بیٹھنا اور جینا تک محال ہو گیا۔ صہیب کی موت کے بعد یہ دوسرا بہت اذیت ناک دور تھا جس سے بچ نکلنے کی مجھے راہ بھی دکھائی نہ دے رہی تھی لیکن سچ تو یہ ہے تانیہ! کہ جتنا میرے ماموں مجھے اپنے جال میں پھنساتے جا رہے تھے اتنا ہی میں ان سب سے متنفر ہو رہا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ عزت کا جنازہ تو ویسے ہی نکل چکا۔ لیکن ماموں کو

اپنے گندے عزائم میں، میں بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"اوہو..... تو پھر؟"

"بس پھر یہ کہ تم مل گئیں اور اس پہلے مرحلے پر ہی میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھی ہر چیز سے آگاہ کردوں، اس کے بعد فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں ہے کہ تم کیا کرنی ہو، جہاں تک بات ہے کسی بدلے یا انتقام کی تو سچ مانو تانیہ! ایسی باتوں کی تو میں اپنے میں سکت ہی نہیں پاتا۔"

"اچھا جی، تو اس لیے اٹھوا لیا تھا۔" وہ بے ساختہ ہی شکوہ کر گئی۔ جس پر عیسیٰ بھی خجالت سے ہنس دیا۔

"ہاں بھئی، کہہ لو تم بھی۔۔ لیکن اٹھوانے کا مقصد خدانخواستہ کوئی انتقام لینا نہیں تھا، بس ایک بار پوچھنا چاہتا تھا کہ بتا مجھے کسی صفائی کا موقع دیئے آخر میری منگیتر نے کسی سے شادی کیوں رچالی۔"

"تو..... ہوگئی تسلی۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"ابھی کہاں۔" وہ بھی بے ساختہ کہہ بیٹھا، کہ ظاہر ہے تانیہ کی طرف سے کوئی واضح جواب ابھی نہ ملا تھا۔ تانیہ بھی اس بات کو گول کر گئی۔

"اچھا۔ تو پھر۔۔ وہ آپ کے ماموں کا معاملہ۔"

"ماموں کے ساتھ تو تعلقات سمجھو بالکل ہی ختم ہوگئے۔ انہیں امی نے حویلی سے بھیج دیا ہے۔ کچھ سال پہلے انہوں نے کچھ پراپرٹی اپنے نام کروائی تھی۔ بس امی نے وہ انہی کے پاس رہنے دی۔ جہاں تک تمہیں یہ ساری بات بتانے کا تعلق ہے تانیہ! تو وہ یہ کہ میری امی تو بہت شدت سے تمہاری منتظر ہیں۔ اپنوں کے دھوکے نے انہیں بہت رنجیدہ کیا ہے۔ وہ مجھے برا بھلا کہتی ہیں کہ اگر میں نے عجلت نہ دکھائی ہوتی تو آج تانیہ میری زندگی میں شامل ہوتی پھر ماموں بھی ایسے ہتھکنڈے نہ اپناتے، حالانکہ میرا ماننا تو یہ ہے کہ اگر اس وقت تم میری زندگی میں آگئی ہوتیں تو ہمیں ماموں کا اصل چہرہ کبھی دکھائی نہ دیتا۔ یقیناً اسی میں ہم سب کی بھلائی تھی۔

سچ کا یہ وقت اپنوں کے بے نقاب ہونے کے لیے آیا تھا۔ البتہ اس تفصیل کو میری طرف سے کوئی دباؤ مت سمجھنا، تم اپنے فیصلے میں مکمل آزاد ہو۔"

"جی میں کوئی ایسا گمان نہیں کروں گی۔ ابھی مجھے اجازت، کیونکہ منصب باہر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" وہ اپنا پرس سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی، جبکہ عیسیٰ بس سوالیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ تانیہ کے لیے ان نظروں کا مفہوم سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

"میں اپنے جواب سے آپ کو جلد ہی آگاہ کردوں گی۔ اللہ حافظ۔" وہ اس مرتبہ رکی نہیں اور پارک سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

"یہ تو بڑی پریشانی والی بات ہے منصب۔" دادی نے تشویش بھری نظروں سے منصب کو دیکھا۔

"آپ کو ان لوگوں سے اور توقع بھی کیسی ہوسکتی ہے۔" وہ دادی کو دیکھ کر ہنس دیا کہ ان سے زیادہ حویلی والوں کو کون جان سکتا تھا۔

"ہاں اور اگر ایسی بات ہے بیٹا، تب تو ہمیں جلد از جلد گلناز کو واپس بھیج دینا چاہیے۔" رضوانہ کو تو سن کر ہی ہول اُٹھنے لگے کہ شہناز نے ان کے بیٹے پر ایک اور کیس دائر کر دیا تھا۔

"ٹینشن نہ لیں امی۔۔ شفقت صاحب نے کہہ دیا ہے کہ اس معاملے کی ذمہ داری وہ خود پر لیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن ہمیں کیا ملے گا، گلناز کو یہاں بٹھا کر، تم اسے حویلی بھیج دو۔" وہ پریشان تھیں۔ منصب نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"کیوں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہوتی ہیں۔ لے جاؤں گا۔ بہت جلد۔ بس مجھے کل دن کو اپنی ڈیوٹی کر لینے دیں۔ پھر اس کے بعد نکل چلیں گے۔"

"تم خود جاؤ گے؟" وہ اب اس بات پر

گھبرا گئیں۔

"جی ظاہر ہے کہ میں لایا تھا تو چھوڑنے بھی مجھے جانا چاہیے۔"

"اکیلے مت جانا۔ مومن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"اچھا ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ انہیں تسلی دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایلیا نے بتایا تھا کہ تانیہ بھی آئی ہوئی ہے اور گلناز کے ساتھ ہے۔ وہ تانیہ سے ملنے کے لیے باہر نکل آیا۔ سوچا اس کو بھی بتا دے کہ بلاوجہ اتنی محنت کی ضرورت نہیں۔ اس کی نئی پیشنٹ کو کل وہ واپس لیے جا رہا ہے۔ رمشہ کے کمرے پر دستک دی تو کوئی رسپانس نہیں آیا۔ اس نے اندر جھانکا تو کمرہ خالی ملا۔ وہ اُن سب کو دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا کیونکہ گھر میں امی اور دادی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوچا ضرور باہر والے لان میں نکلے ہوں گے وہی ہوا۔ وہ سب تھے تو باہر لیکن بجائے لان کے داہنے ہاتھ کے گراؤنڈ میں اترے ہوئے تھے۔ پیپل کے درختوں کے نیچے بنچ پر بیٹھے خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ منصب کو یہ دیکھ کر بڑی خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ گلناز آج اچھا سا سوٹ پہنے بال سلیقے سے باندھے ان سب کے ساتھ ایک بنچ پر یوں عام انداز میں بیٹھی تھی جیسے برسوں سے ان کے ساتھ ہو۔ منصب نے بڑی حیرت سے تانیہ کو دیکھا۔ اور ابرو اٹھا کر گلناز کی بابت کچھ پوچھنے کی کوشش کی جس پر وہ مسکراتی ہوئی منصب کے نزدیک آ گئی۔

"دیکھ لو، تم تو ہمیں کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے نا۔"

"میری توبہ بھئی۔" اس نے ہنس کر کان کی لو کو چھوا "ڈاکٹر تانیہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔"

"تمہیں پتا ہے، آج اس نے مجھ سے بات کی ہے۔" وہ پرجوش ہو کر بتانے لگی۔

"واقعی..... کیا کہا؟"

"میں جب آج اس سے ملنے آئی تو یونہی پوچھ لیا کہ بتائیں گلناز کہاں چلیں تو فوراً کہتی ہے باہر۔"

"واؤ..... یہ واقعی ایک بڑی کامیابی ہے۔" مطلب اس نے تمہیں سنا، سمجھا اور جواب بھی دیا۔ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تانیہ مجھے افسوس ہے کہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک سا گیا۔ جس پر تانیہ نے تعجب سے دیکھا۔

"مجھے کل ہی گلناز کو یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ میری نائی صاحبہ نے میرے خلاف جس بے جا کا کیس کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ میں انہیں زبردستی یہاں لایا ہوں۔"

"اوہ..... پھر.....؟"

"بس پھر واپس ہی جانا ہے۔" اس نے کندھے اُچکائے اور یونہی سرسری اس کی نظر باقیوں کی طرف گئی تو وسیلہ کو چوروں کی طرح اس طرف دیکھتے پایا۔ وہ بنچ پر رمشہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ایلیا اور بچے بھی وہیں تھے۔ باقی سب تو آپس کی باتوں میں مگن تھے لیکن ایک خاتون کی توجہ یکسر اسی جانب تھی۔ منصب کے لبوں پر جیسے مہینوں بعد ایک بڑی شرارتی سی مسکان آئی تھی۔ کوئی اندر ہی اندر جل تو ضرور رہا تھا لیکن جتانا ہرگز منظور نہ تھا۔ تب ہی بڑی مہارت سے رخ پھیر لیا۔

"کیا ہوا....." تانیہ نے اس کی ہنسی کو حیرت سے دیکھا۔ گلناز کی بات کرتے کرتے منصب کی توجہ نجانے کہاں بھٹکی تھی۔ تانیہ نے جب پلٹ کر دیکھا تو سبھی کو آپس میں مصروف پایا۔

"ہوں۔" وہ اسی مسکراتے چہرے کے ساتھ تانیہ کو دیکھ رہا تھا "کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے خیر۔" وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ منصب سے مزید کچھ بولا نہیں گیا۔ بنک سوٹ والی کی توجہ نے اُسے باقی ہر بات بھلا دی تھی۔ آج ایک مدت بعد اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فرصت سے وسیلہ کو دیکھے، اور اس کے گھورنے کو بھی خاطر میں نہ لائے، کیونکہ ارحم نام کی دیوار بالآخر مسمار ہو چکی تھی۔ اب تو وسیلہ بھی اسے روک نہیں پائے گی۔ ہاں لیکن ابھی یہ راستہ تھوڑا طویل اور پیچیدہ تھا۔

☆☆☆

صبح کی نماز پڑھ کر تسبیحات اور تلاوت ہاجرہ بیگم اور رضوانہ دونوں کا معمول تھا۔ گلناز بھی ان دنوں چونکہ ان کے کمرے میں تھی تو ان دونوں نے خاموشی اور نیم تاریکی میں سارے عمل انجام دیے۔ صبح کی ہلکی روشنی اب کھڑکی سے آنا شروع ہوگئی تھی۔ رضوانہ نے ایک نظر گلناز کی طرف دیکھا، وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی ہوئی تھی۔

"اماں، اس کی حرکات آج کل کچھ نارمل انسانوں جیسی لگنے لگی ہیں نا؟" رضوانہ نے اس کے لیٹنے کے انداز کو حیرت سے دیکھا تھا۔ کہیں سے نہ لگتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر باقیوں سے کمزور ہے۔

"ہاں میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی کچھ دنوں سے ایسا ہوگیا ہے جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ کسی کے گھر مہمان ہے۔ ورنہ ایک پاگل کو کہاں کچھ سمجھ ہوتی ہے۔"

"سب تانیہ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ بہت محنتی لڑکی ہے۔ میری وسیلہ کو ٹھیک کرنے میں بھی اس نے کیسی جان لگادی تھی۔"

"ہاں لیکن گلناز پر اس کی محنت شاید رائیگاں جائے۔ آج ہی تو اس بے چاری نے واپس چلے جانا ہے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوتی اماں! اگر گلناز ٹھیک ہوجاتی۔ میرے ضمیر پر بہت بوجھ ہے اس بات کا۔ غلطی تو جمال اور مجھ سے ہوئی نا۔ ہم نے ایک کم عمر لڑکی کے جذبات کو نہیں سمجھا۔ مجھے میری بے حسی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ لیکن گلناز پہلے جیسی نارمل ہوجائے تو اس بوجھ میں بھی کچھ نہ کچھ تو کمی آئے گی۔" رضوانہ نے ایک آہ بھری۔

"تانیہ ویسے صحیح کہتی ہے رضوانہ کہ گلناز بے چاری کا خیال اس طرح نہیں رکھا گیا جیسا کہ رکھنا چاہیے تھا۔ کیا پتا اس کو اگر سمجھا جاتا، سنا جاتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ مجھے یاد ہے جب جمال کی شادی کی خبر حویلی میں ملی تو شہناز ہر دم شور مچائے رکھتی، خوب چیختی چلاتی، غصہ نکالتی، اور انجام یہ ہوا کہ سر درد کی مریضہ بن بیٹھی، ہر دم حویلی میں اودھم مچائے رکھنے والی شہناز گھنٹوں گولیوں کے اثر سے بے سدھ پڑی ہوتی۔ گلناز ایک صدمے سے تو نڈھال تھی ہی بہن کا خیال بھی اسی کو رکھنا پڑ گیا۔ حویلی کے بھی کام دھندے بھی اس پر آپڑے تھے۔ کمال شہناز کو پکارتا ہوا حویلی میں داخل ہوتا اور یہ بے چاری بھاگ کر سامنے جا کھڑی ہوتی۔ ڈیرہ بھی اُن دنوں بیسیوں مردوں سے بھرا رہتا تھا۔ دن کا وقت وہاں کا کھانا پکانا بھی دیکھنا۔ یہ سب کچھ گلناز ہی دیکھنے لگی۔۔ کمال تو اُن دنوں مکمل اسی پر ہی انحصار کرنے لگا تھا۔ ہر کام میں اسی کو آواز۔" وہ اپنی لے میں پرانے دنوں کی یادوں کو تازہ کیے بیٹھی تھیں کہ اچانک کمرے کے پرسکون ماحول کو ایک دلدوز چیخ نے یوں توڑا کہ رضوانہ اور ہاجرہ بیگم کے دل ہی دہل گئے۔ چیخ لیٹی ہوئی گلناز نے ماری تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی زور زور سے دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔

ہاجرہ بیگم بھی نزدیک آگئیں۔ کچھ ہی دیر میں وسیلہ اور رمشہ بھی کمرے میں آگئیں۔ ان کا کمرا چونکہ اسی راہداری میں تھا تبھی آواز پر چونک کر بھاگی تھیں۔ سب مل کر گلناز کو سنبھالنے کی کوششوں میں لگی تھیں لیکن وہ کسی سے سنبھل نہ رہی تھی پھر اچانک ہی سب کو دھکا دے کر دروازے کی طرف دوڑ گئی۔ رمشہ اس کے پیچھے بھاگی لیکن وہ بیرونی دروازہ کھول کر ڈھلان اتر گئی تھی۔ رمشہ نے بجائے اس کے پیچھے جانے کے صحن میں موجود منصب کے کمرے کا دروازہ بجایا۔

"کیا ہوا..... خیریت....." منصب نے بھی فوراً ہی دروازہ کھول دیا شاید وہ نیند سے جاگ گیا تھا۔

"وہ گلناز..... وہ باہر نکل گئی ہے۔ جلدی جاؤ منصب۔" اس نے پیٹھ پہ دھکا دے کر منصب کو آگے کیا اور وہ بھی اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ گلناز روتی چلاتی ڈھلان اترتی جا رہی تھی۔ منصب تیز

دوڑتے جلد ہی اس تک پہنچ گیا اور بازو سے پکڑ کر اسے زبردستی روکا۔ دن کی روشنی نکل آئی تھی لیکن اس چراگاہ میں کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ منصب نے شکر ادا کیا۔ ورنہ دیکھنے والے تو نجانے کیا کچھ اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ گلناز کو بازو سے کھینچ کر پیچھے لانے لگا۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ وہ متواتر پیچھے کو ہٹ رہی تھی۔ لیکن تبھی مومن بھی اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچ گیا اور دونوں کسی طرح گلناز کو گھر واپس لے ہی آئے۔ لیکن گلناز کی ہچکیاں کم ہونے میں نہ آرہی تھیں۔ مومن اور منصب نے اسے منصب کے کمرے میں لا بٹھایا تھا کیونکہ وہی دروازے کے سب سے قریب تھا۔ اور وہ نیچے قالین پر بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر رونے لگی تھی۔ معلوم نہیں اسے اچانک کیا ہوا تھا۔ ہاجرہ بیگم سب سے زیادہ حیران تھیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی گلناز کو اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو بس ہنستی تھی اور ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں ہی کرتی تھی۔ اتنی شدت اور اتنے درد سے رونا تو شاید اسے آتا ہی نہ تھا۔

رمشہ نے تانیہ کو بھی کال کر دی تھی حالانکہ منصب منع کرتا رہ گیا کہ اتنی صبح اسے تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ اوپر سے سردی بھی اتنی شدید تھی۔ اسے لگا گلناز اپنے آپ ہی چپ ہو جائے گی لیکن تانیہ نے کہا کہ وہ ابھی پہنچ رہی ہے۔ اور وہ کچھ ہی دیر میں وہاں آگئی۔ اس کے آنے تک سب وہیں صحن میں ہی پہرہ دینے کے انداز میں موجود رہے تاکہ وہ دوبارہ نہ بھاگ جائے لیکن تانیہ جب کمرے میں گئی تو وہ سب بھی یہاں وہاں بکھر گئے۔ تانیہ کے ساتھ گلناز کو انہوں نے ہمیشہ ہی مطمئن دیکھا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا گلناز۔'' آپ ٹھیک ہیں۔ تانیہ نے ہاتھ آہستہ سے گلناز کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے روتی پلکیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نظر تانیہ سے ملی تو سر دوبارہ گھٹنوں پر دے دیا اور پھر رونا شروع کر دیا اس بار وہ ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہی تھی۔

''میری دوست رو کیوں رہی ہے۔'' تانیہ نے اس کے سامنے قالین پر ہی آلتی پالتی مار لی۔

''بتائیں نا گلناز۔۔ کس بات نے آپ کو دکھی کیا ہے۔ کون سی یاد۔'' اور گلناز ایک بار پھر پوری شدت سے رونے لگی۔ تانیہ نے اپنے آخری جملے پر غور کیا۔۔ اس نے تو کون سی یاد ہی کہا تھا اور اسی ایک جملے نے گلناز کا ضبط توڑ دیا تھا۔

''ایسا ہوتا ہے گلناز۔ کبھی کبھار کوئی بھولا ہوا واقعہ بہت شدت سے آنکھوں کے آگے تازہ ہو جاتا ہے۔ تب دل بہت رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن دیکھو۔'' وہ اس کے چہرے سے بال ہٹانے لگی۔

''ایسی باتیں کسی دوست سے کہہ لینا اچھا ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آج آپ ہر بات کہہ ڈالیں۔ کچھ بھی دل میں نہ رکھیں۔ آپ کو کوئی ڈر محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کی ہر مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

''وہ..... وہ.....'' وہ ہچکیوں کے بیچ کچھ بولی تھی۔ تانیہ نے اپنا سانس تک روک لیا۔ گلناز کچھ کہہ رہی تھی۔ ''وہ۔ میری۔ آپا۔ کو مار دیں گے۔''

''کون؟'' تانیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ سر نفی میں ہلانے لگی۔ ہچکیوں پر بھی اس کا قابو نہ تھا۔

''وہ۔ نیند میں۔۔ ان کی جان۔''

''آپ کی آپا..... قطب..... شہناز.....''

تانیہ نے اپنا دماغ حاضر کیا تو گلناز نے ہولے سے سر ہلایا۔

''تو اس کو کون مارنا چاہتا تھا۔ اور کیوں۔''

تانیہ کا اپنا دل دھڑکنے لگا تھا۔ نجانے گلناز کیا کہنا چاہتی تھی۔

''اگر..... میں..... آپا..... کو سچ..... بتا دیتی۔'' وہ پھر سمجھا نہیں پا رہی تھی لیکن یہی اچھی بات تھی کہ وہ بولنے لگی تھی۔ بالآخر گلناز کا جھوٹ ٹوٹ گیا تھا۔

''اور۔۔ وہ سچ کیا ہے گلناز۔'' تانیہ نے بہت پیار سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا تو گلناز ایک بار

پھر رو دی۔ اس کی سسکیاں اتنی درد بھری تھیں کہ تانیہ کی وجہ جانے بغیر ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"سچ۔" اس نے ہچکی لی۔ سچ۔ وہ عجیب سے انداز میں دوہرانے لگی۔ تانیہ نے پہلے تو اسے بنا روک ٹوک کیے رونے ہی دیا۔ گلناز کا رونا برسوں کی گھٹن کا نتیجہ تھا۔ جس سے آج اسے نجات ملی تھی۔ پھر اٹھ کر اسے پانی دیا۔

"تم اس وقت اپنوں میں ہو گلناز، اور یہاں کوئی تمہارا دشمن نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی تمہیں دھمکی دے گا۔ تم مجھے آج آرام سے اپنی پوری کہانی سناؤ گی۔ اور ہم تمہاری آپا کو بھی کچھ نہیں ہونے دیں گے۔" تانیہ نے اسے تسلی بھرے انداز میں تھپکا۔ گلناز کو چپ ہونے میں بہت دیر لگ گئی۔ بڑی دیر بعد اس نے ٹھہرے ٹھہرے سانس لینا شروع کیے تو تانیہ کو کچھ پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اب سر اٹھا کر ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ گہرے سانس اب بھی لے رہی تھی۔ اور جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"گلناز اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن آپ کسی گہرے صدمے میں تھیں۔ اور وہ بات آپ تو مجھے بتائی ہی ہوگی۔ بتائیں گلناز آپ کی کہانی کیا ہے۔" تانیہ نے پھر اسے متوجہ کرنا شروع کیا، اسے ذرا لاحق ہوا کہ گلناز کہیں پھر سے اپنی خاموشی کی دنیا میں نہ چلی جائے۔

"کمال بھائی۔" اس کے لبوں پہ ایک نام آ کر رکا۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ "میں ان کا قتل کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بار چھری سے۔" وہ بھیگی پلکوں کو جھپک رہی تھی۔ اور تانیہ سوچ میں پڑ گئی کہ کمال کیوں۔ جبکہ رضوانہ آنٹی کے شوہر کا نام تو جمال تھا۔ اور وہ جمال کی منکوحہ تھی۔ اس نے سوچا کہ گلناز کو ٹوک کر اس کی تصحیح کرے لیکن اس سے پہلے ہی گلناز خود بولنے لگی، وہ بولتی گئی اور تانیہ کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے کھلتی گئیں۔

☆☆☆

"تانیہ ناشتہ۔" ایلیا نے ٹرے سامنے رکھی تو تانیہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر اوپر اٹھایا۔ کمرے سے نکل کر وہ باہر آئی تو یونہی بے خیالی میں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔ تم گلناز کو ناشتہ دے دو۔" اس نے جیسے منت کی۔

"کیا ہوا تانیہ۔۔ گلناز اب ٹھیک ہے نا؟" رمشہ بھی اس کے قریب آئی۔ ان دونوں کے کمرے میں جاتے ہی وہ سب ناشتے کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ مومن اور منصب نے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اور وہ سب شاید ناشتہ کر چکے تھے۔ صرف تانیہ اور گلناز ہی رہ گئی تھیں۔

"وہ......" تانیہ نے انگلی کمرے کی جانب اٹھائی "وہ۔ آج بولی ہے۔"

"گلناز۔۔ اچھا۔۔؟" رمشہ حیرت سے ہنسی "کیا کہا اس نے۔"

"سنو رمشہ میں ڈیوٹی سے جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ گلناز کو تیار ہونا چاہیے۔ مومن کو ہم راستے سے لیں گے۔ دو بجے صحیح ٹائم ہے نکلنے کا۔" منصب تیار ہو کر عجلت میں کہتا کمرے سے نکلا۔ سر پر ٹوپی سیدھی کی اور شاید امی اور دادی کو خدا حافظ کہنے کے لیے کمرے کی طرف بڑھا جب گھر کے مین گیٹ پر پہلے دستک ہوئی اور پھر دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ سب نے آواز پر پلٹ کر دیکھا تو شہناز تائی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ چہرے پر کرختگی اور بیگانگی سجا رکھی تھی۔ اجنبی سی نظروں سے سامنے کھڑے افراد کو دیکھا۔ منصب پر نظر پڑی تو نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"میں اپنی بہن کو لینے آئی ہوں۔ کہاں ہے گلناز۔"

"السلام علیکم۔ اندر آ جائیں۔" ایلیا ہی آگے بڑھ کر زبردستی ان سے ملی اور ہاتھ پکڑ کر اندر لانے لگی۔ منصب نے اس دوران گیٹ سے باہر جھانکا۔ تائی اپنے ڈرائیور کے ساتھ آئی تھیں۔ ارحم شاید طلاق کے بعد آنے پر رضامند نہیں ہوا ہوگا۔ منصب

نے مصافحہ کر کے باہر دھوپ میں کرسیاں اور میز رکھی اور رمشہ سے ڈرائیور کی چائے کا کہا۔ گھڑی دیکھی اس کے آفس جانے کا ٹائم ہو چکا تھا لیکن وہ یہاں کے معاملات کو عورتوں پہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے پولیس اسٹیشن کال کر کے اپنے گھنٹہ بھر بعد پہنچنے کا کہا۔ موبائل جیب میں رکھتے واپس آ گیا۔ ایلیا انہیں امی اور دادی کے کمرے میں لے گئی تھی۔ وسیلہ انہیں دیکھتے ہی کمرے سے باہر نکل گئی اسے تائی کی ڈھٹائی پر افسوس تھا۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی وہ ان کے گھر کس دھڑلے سے آن پہنچی تھیں۔

"ہمیں جیل پہنچا کر چین نہیں ملا تھا، میری پگلی بہن ہی رہ گئی تھی بدلے نکلوانے کے لیے۔" وہ ہاتھ نچا کر منصب پر غصہ نکال رہی تھیں۔

"کہاں ہے میری بہن۔ کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔" وہ اب رضوانہ کو تیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ بات وہ پہلے ہی طے کر کے آئی تھیں کہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس وقت گلناز کا نام استعمال کرنے میں ہی فائدہ ہے۔

"برسوں پہلے کیا کوئی کسر رہ گئی تھی۔" انہوں نے نفرت سے رضوانہ کو دیکھا "اب کیا مار کے دم لوگی میری بہن کو۔"

"بہتر ہوگا آپ بجائے الزامات لگانے کے اپنی بہن سے مل لیں۔" منصب ہی آگے آیا۔ وہ ایک بار پھر اس کی امی کو ذہنی اذیت دے رہی تھیں اور اس سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ منصب کے لیے یہ الزام ہی برداشت کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کی ماں کسی کو پاگل کرنے کے جرم میں شریک تھی۔

"جتنی چاہے کوشش کر لو، اپنی ماں کا جرم تم سب چھپا نہیں پاؤ گے۔۔ اور دیکھنا، تم لوگوں کو بھی جیل کی ہوا نہیں کھلوائی تو میرا نام شہناز نہیں۔"

"رضوانہ آنٹی نے کوئی جرم نہیں کیا۔" تانیہ جو کچھ دیر ہوئی دروازے میں آ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ چند قدم اور آگے آ گئی۔

شہناز نے سخت برا منہ بناتے اس لڑکی کو دیکھا۔

"تم کون ہو، اور جانتی ہی کیا ہو۔"

"سب کچھ۔ وہ سب جو یہاں موجود کوئی شخص بھی نہیں جانتا۔ منصب تم پلیز کچھ دیر کے لیے باہر جاؤ۔ میں نے ان کو کچھ بتانا ہے۔ لیکن سوری تمہارے سامنے نہیں بتا سکتی۔" اس کا انداز معذرت خواہانہ سا تھا۔ منصب دل میں حیرت لیے خاموشی سے باہر چلا گیا۔

"کیا بکے جا رہی ہو لڑکی۔ میں تمہیں جانتی تک نہیں اور تم کہتی ہو مجھے سب پتا ہے۔"

"میں گلناز کی ڈاکٹر ہوں۔ ان کا علاج کر رہی تھی۔ اور آج آپ کی بہن نے جو انکشافات کیے وہ میں سب کو بتانا چاہتی ہوں پھر آپ خود فیصلہ کریں کہ کون مجرم ہے اور کون بے قصور۔"

"میری بہن کیسے کر سکتی ہے کوئی انکشاف۔ وہ تو بات ہی نہیں کرتی۔"

"اب کرتی ہے۔ اور جو کچھ آج اس کی زبانی میں نے سنا، آپ کو خصوصاً دل تھام کر سننا پڑے گا۔" تانیہ اس مرتبہ ایک اعتماد کے ساتھ آگے آئی۔ جو کچھ وہ دادی اور رضوانہ آنٹی سے کہنے آ رہی تھی، اب لگ رہا تھا اسے سننا سب سے زیادہ تو شہناز کے لیے ضروری تھا۔

"کیا بات ہے تانیہ..... ایسا کیا کہا گلناز نے۔" ہاجرہ بیگم نے تانیہ کو دیکھا تو وہ ان کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی، ایک گہرا سانس لے کر چہرہ متوازن کیا اور آنکھیں شہناز پر جما دیں۔

"کیا یہ سچ ہے کہ جمال انکل اور رضوانہ آنٹی کی شادی کے صدمے نے آپ کو بیمار کر دیا تھا۔ اور آپ سکون کی گولیاں لے کر پہروں سو جایا کرتی تھیں۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ اس کی گواہ تو میں خود ہوں۔" دادی نے جب اس سوال پر شہناز کو چپ

بیٹھے دیکھا تو خود ہی کہہ اٹھیں۔ شہناز بھی تردید نہ کر پائیں۔

"گھر کے اور ڈیرے کے سب کام ان دنوں گلناز پر آپڑے تھے۔ وہ شوہر کی بے وفائی کے درد سے بھی نمٹ رہی تھی اور بہن کی بیماری گھر کی ذمہ داریاں بھی اس پر آپڑی تھیں۔" تانیہ نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہاں تو کیا کہنا چاہتی ہو، میری بیماری نے اسے پاگل کر دیا۔ کمال ہے اس سے زیادہ بے تکی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم ڈاکٹر ہو یا وکیل۔۔ رضوانہ کے قصور میرے سر ڈالنے کی یہ بھونڈی کوشش۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا، نہ ہی میں کسی کی وکیل ہوں۔" تانیہ نے خود پر ضبط کیا" نہ ہی میں آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہوں اور ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ اس سب کی ذمہ دار نہ آپ ہیں نہ رضوانہ آنٹی نہ ہی جمال انکل۔۔ بلکہ گلناز کی اس تباہی کا ذمہ دار اور کوئی نہیں صرف اور صرف آپ کا شوہر ہے۔"

"کمال خان۔" شہناز نے بھنویں سکیڑیں۔ باقی سب بھی حیرت سے تانیہ کو دیکھنے لگے۔

"جن دنوں آپ بیمار ہو کر حویلی اور وہاں کے سب معاملات سے غافل پڑی تھیں۔ آپ کے شوہر نے اس کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا۔ گلناز کہتی ہے ایک رات میں ڈیوڑھی کے راستے کمال بھائی کو کھانا دینے گئی تو وہ وہاں اکیلے بیٹھے تھے۔ گلناز انہیں کھانا دے کر واپس آگئی، لیکن پھر روزانہ یہی ہونے لگا، کمال خان ڈیرہ خالی ہو جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھے رہتے تھے جب تک کہ گلناز کھانا لے کر خود وہاں نہ چلی جاتی۔ پہلے پہل تو وہ کھانا دے کر واپس آجایا کرتی تھی لیکن پھر اس کے گم سم اور اداس رہنے پر کمال خان اسے پاس بٹھا کر اس سے ہمدردی بھی کرنے لگے۔ کبھی جمال کی کوتاہیوں پر افسوس کا اظہار، کبھی تسلی دینا۔ گلناز چپ چاپ سنتی رہتی اور پھر واپس آجاتی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان روز روز کی ہمدردیوں کے پیچھے اس کے لیے کتنا بڑا طوفان چھپا تھا۔ ایک رات کمال خان اپنے آس پاس کے تمام معاملات کو اپنے حق میں کر کے ذہنی طور پر بالکل تیار تھا۔ اس نے گلناز کے آنے سے پہلے حویلی کو ملازموں تک سے خالی کر دیا اور جب وہ آئی تو ہمدردی جتاتے، ڈھارس بندھاتے اسے حیلے سے کمرے کے اندر لے گئے اور پھر دروازہ بند کر کے انہوں نے اپنے مذموم عزائم پر عمل کیا۔"

"جھوٹ..... بالکل جھوٹ۔" وہ ایک دم چلا اٹھیں" کمال نے ہمیشہ گلے کو اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔"

"اتنے پاکیزہ لفظ کا استعمال بھی مت کریں آپ۔" تانیہ کا دل کچھ دیر پہلے کی باتوں نے پہلے ہی بوجھل کر رکھا تھا۔ اس کا لہجہ تیز ہونے لگا۔

"آپ کے شوہر نے روز کے حساب سے ایک معصوم بچی کے دل اس کے جذبات اس کے جسم کو چھلنی چھلنی کیا ہے۔ اسے ہر طرح سے بلیک میل کر کے چپ کروایا۔ وہ روتی چلاتی اور وہ اسے کہتے کہ اگر اس نے اپنی زبان کھولی یا گھر سے بھاگی تو وہ اس کی آپا یعنی کہ آپ کو نیند میں ہی کسی دن جان سے مار دیں گے۔ گلناز سب کچھ اپنے اوپر سہتے چپ رہتی، ایک روز کمال سے بچنے کے لیے تہہ خانے میں جا چھپی، تب وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ناکام واپس چلے گئے۔ اس معصوم بچی نے اسی کو اپنی کامیابی سمجھا اور کمال سے بچنے کے لیے تہہ خانے میں پناہ لینے لگی۔

وہ جانور ایسا بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ گلناز کو باہر بھی نکلنا پڑتا۔ گھر کے کام بھی دیکھنے پڑتے، اور وہ اسے ڈیرے تک آنے کے لیے بھی مجبور کر لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ سب اتنا اذیت ناک تھا کہ چھپنے نکلنے کی کشمکش دن بہ دن اعصابی طور پر اسے کمزور اور اس کے ذہن کو معذور کرنے لگی۔ صرف آپ کی جان بچانے کی خاطر وہ اس انتہا کی بے بسی کا لگاتار شکار ہوتی رہی اور محض دو ہی سالوں

میں مکمل پاگل ہوگئی۔ کیونکہ جب انسان اپنا درد اپنے اندر ہی رکھتا چلا جاتا ہے تو وہ کسی نہ کسی صورت باہر نکل کہ رہتا ہے۔ گلناز نے بہنوئی کے ہاتھوں جو ٹارچر سہا وہ سولہ سترہ سال کی لڑکی کی برداشت سے کہیں بڑا تھا۔"

"یہ سب تم سے کس نے کہا؟" شہناز جو کچھ دیر پہلے تانیہ کے ایسے آغاز کو ایک اندازہ سمجھی تھیں، حالات وواقعات کو سنتے سکتے کی کیفیت میں آنے لگیں۔

"خود گلناز نے۔"

"لیکن وہ تو بول ہی نہیں سکتی۔" "سب جانتے ہیں" وہ اب بول سکتی ہے کیونکہ وہ جس جمود کا شکار ہوچکی تھی۔ وہ آج بالآخر ٹوٹ گیا۔"

"اوہ۔ میں اب سمجھی۔" ہاجرہ بیگم نے ہاتھ اپنے منہ پہ رکھا "صبح جب میں اور رضوانہ باتیں کررہے تھے تو وہ کمال کا نام لیے جانے پر چیختی ہوئی باہر بھاگی تھی۔ یاد ہے رضوانہ ہم یہی باتیں کررہے تھے، شہناز کی بیماری اس کا سوئے رہنا۔ گلناز کا گھر سنبھالنا۔ حتیٰ کہ میں نے ہی کہا کہ وہ کمال اور ڈیرے کے سب کام بھی خود کرتی تھی۔ اور بس وہ جو اتنی دیر سے چپ لیٹی ہم دونوں کو سن رہی تھی تو اس اذیت ناک وقت کے یاد آنے پر برداشت نہ کر پائی۔"

"لیکن وہ ٹھیک کب ہوئی اور کیسے۔" شہناز اچانک جس صدمے سے دوچار ہوئی تھیں اس کے لیے اپنا لب ولہجہ سنبھالنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ وہ بس حیرت سے تانیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ذہن ودل نواسی آندھیوں کی زد میں تھے کہ وہ خود کو سوچ بچار کے قابل بھی نہ پارہی تھیں۔

"میں گلناز کو لاتی ہوں۔" تانیہ ان کی حیرت کو سمجھ رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور شہناز کے لیے وہاں موجود باقیوں سے نظریں ملانا بھی دوبھر ہورہا تھا۔ یہی حال اس وقت ہاجرہ بیگم کا تھا۔ اللہ نے دو بیٹے دیئے دونوں ہی ان کی زندگی میں واپس لے لیے۔ یہی درد کیا کم تھا کہ اب ایک مرحوم بیٹے کے متعلق ایسی بات کا سامنے آنا۔ وہ سر جھکائے انگلیاں چٹخا رہی تھیں یہی سوچ پائیں کہ کاش گلناز پہلے جیسی پاگل ہی نکلے، اور تانیہ کا کہا وہ کسی طرح جھوٹ ثابت کردیں لیکن۔ آہٹ پر سر اٹھایا تو کمرے میں داخل ہوتی گلناز پہ نظر پڑتے ہی انہیں کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"آپا....." بہن کو دیکھتے ہی گلناز کی آنکھیں پھر سے برس پڑیں۔ وہ آگے بڑھی اور شہناز نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور وہ ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہاں موجود سب ہی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ہاجرہ بیگم تو پلو سے آنکھیں صاف کرتے سر ہی نہیں اٹھا پائیں۔

"چلو یہاں سے۔" شہناز نے بنا کسی کی طرف دیکھے گلناز کو باہر کھینچا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی ٹوٹ چکی تھیں کہ فوری طور پر وہاں سے نکل جانا چاہتی تھیں۔ رضوانہ نے بے اختیار تانیہ کی طرف دیکھا تو اس نے پلکیں جھپک کر تسلی دی۔ شہناز جو کرنا چاہتی تھیں، اسے روکنا اب لاحاصل تھا۔ گلناز ٹھیک ہوچکی تھی۔ سارے راز افشا ہوچکے تھے۔ شہناز کے لیے اب وہاں ایک پل بھی ٹکنا ناممکن تھا۔ رضوانہ کو مورد الزام ٹھہراتے وہ اس کے ساتھ کتنا برا کرچکی تھیں۔ آج پتا چلا ان کی اپنی دنیا تو برسوں پہلے اجڑ چکی تھی۔ رضوانہ تو اس قصے میں کہیں موجود ہی نہ تھی۔۔۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ گلناز نے پلٹ کر خاموش نظروں سے تانیہ کو دیکھا تو تانیہ نے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا، جس پر گلناز بس ہلکا سا مسکرائی اور وہ دونوں گھر کے دروازے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

"کتنے بدنصیب ہو خان۔" بدنصیب، بدبخت اور انتہا کے ظالم۔ برے سے برے انسان کو بھی موت کے بعد ایک جملہ تو نصیب ہو ہی جاتا ہے کہ بہت اچھا شخص تھا بے چارا۔۔ پر تمہاری سیاہ بختی صرف تمہارے کرموں کا پھل ہے جو آج تمہاری قبر

پر تھوکتے بھی مجھے گھن آئے گی۔۔ بھائی کی کوتاہی، میری بیماری اور ایک معصوم لڑکی کی مجبوریوں سے تم نے اتنا گھناؤنا فائدہ اُٹھایا، خدا تمہیں بھی معاف نہ کرے کمال خان۔

اور کرے بھی کیوں۔ تمہاری سزا کے لیے یہی کیا کم ہے کہ آج مرنے کے اتنے سالوں بعد جبکہ لوگ مرے ہوئے کی بخشش کے لیے دعا کیا کرتے ہیں تمہیں بھر بھر کہ بددعائیں مل رہی ہیں۔ کتنا رکیک فعل ہے ایک پاکیزہ رشتے کی حرمت کو پامال کرنا۔ اور تم نے نا صرف یہ گناہ کیا بلکہ برسوں میری بہن کی دیوانگی اس کی معذوری کو ایک تماشے کی طرح دیکھتے رہے، حتیٰ کہ یہ سوچ کر خوش بھی ہوتے ہوگے کہ اچھا ہے وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہی۔۔ پر یہ تم جیسے بدبخت ہوتے ہیں جنہیں قبر میں قدرت چین نہیں لینے دیتی، تمہاری قبر تمہاری آخرت سب تباہ ہیں کمال خان کیونکہ گلناز بھی تمہیں معاف نہیں کرسکتی۔ اور میں۔"

شہناز بی بی سسک کر رو پڑی "کتنی بری ہوں میں۔ کتنی اندھی اور کتنی بے رحم۔ جب میں ہی رضوانہ کو معاف کرنے کو تیار نہ ہو رہی تھی۔ اب کس منہ سے اللہ سے معافی کی طلب گار ہو سکتی ہوں۔ برسوں اس آگ میں جلتے گزار دیے کہ میری بہن کی دیوانگی کی ذمہ دار اگر رضوانہ ہے تو بس اس کا جینا حرام کیے بغیر چین نہیں لوں گی۔ ایک بار بھی نہ سوچا نجانے گلناز کا دکھ کیا ہے۔۔ کاش میں اپنے کیے کی سزا اس دنیا میں پالوں، کاش میرا انجام تمہارے جیسا نہ ہو کمال خان۔" وہ تصویر کے سامنے کھڑی رو رہی تھی جب گلناز نے بہن کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"بس کرو آپا۔۔ کیوں خود کو سزا دے رہی ہو۔"

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا گلے۔" وہ پلٹ کر گلناز کے شانے جھنجھوڑنے لگیں "ایک بار تو کہتیں، اشارے سے ہی جتاتیں۔ دیکھو تو، کتنا کچھ غلط ہو گیا میرے ہاتھوں سے۔ کس کس سے معافی مانگوں، اور بھلا کس منہ سے ان کا سامنا کروں جن کے ساتھ میں نے اتنا برا کیا اور انہوں نے میری بہن کو ٹھیک ٹھاک کر کے میرے سامنے لا کھڑا کیا۔"

"وہ سب اتنے اچھے ہیں آپا، کہ تمہیں کھلے دل سے معاف کر دیں گے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا گلناز، یہ تم ہو۔۔ ایسے بولتی، مسکراتی، تندرست۔ یہ..... یہ صرف معجزہ ہے۔"

"یہ صرف ایک سبق ہے آپا۔ تمہارے لیے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ "زندگی بڑی تلخ حقیقت ہے اور ہم صرف مفروضوں کے تحت اس کے دو پلڑوں میں نفرت اور محبت کے پہاڑ بلند کرتے چلے جاتے ہیں۔"

"تم خوش ہو گلناز۔" شہناز نے روتی آنکھوں سے اس کی تھوڑی اونچی کی تو گلناز کے چہرے پر ایک سختی سی آ کر ٹھہر گئی۔ شہناز نے حیرت سے اس کا بدلتا رنگ دیکھا۔

"ہاں..... بہت خوش ہوں۔" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ "بہت خوش کہ دنیا ایک غلط شخص کے وجود سے برسوں پہلے ہی پاک ہو چکی تھی۔ لیکن افسوس کہ میں بہت سالوں تک اس خوشی سے بے خبر تھی۔" وہ سفاکی سے کہتی وہاں سے چلی گئی اور شہناز نے ماتھا پیٹ کر کمال خان کی تصویر کو دیکھا اور پھر دیوار سے کھینچنے کے انداز میں اتار کر تصویر کو اسٹور روم کے دروازے پر دے مارا۔

"اللہ تمہیں کبھی، کبھی معاف نہ کرے کمال خان، یہ میری بددعا ہے تمہیں۔!"

☆☆☆

سارہ نے بچی کو جنم دیا تھا۔ ارحم کی امیدوں پر تو سنتے ہی اوس پڑی تھی۔ جب سے منصب کے جائیداد میں حصہ دار بننے کا سنا تھا۔ سر میں ایک ہی سودا سما گیا تھا کہ کسی طرح اس جبری حصے دار کی راہیں دشوار کرنی ہیں۔ ایسے میں بیٹے کی پیدائش اس کے

اعتماد میں اضافے کا باعث بنتی، لیکن سمارہ نے بھی بیٹی کا تحفہ دیا تھا۔ اس کا سن کر صرف مزاج ہی نہیں بگڑا، دماغ بھی نئے ادھیڑ بن میں لگ گیا تھا۔ حویلی کے اس نئے حصہ دار کی حقیقت چونکہ ابھی دنیا پر آشکار نہیں ہوئی تھی تو ارحم کے نزدیک یہ ایک بہت اچھا موقع تھا کہ اس ان چاہے کانٹے کو وقت پر ہی نکال دیا جاتا۔ سب سے پہلے اس نے عدالت میں وراثت کی منتقلی کی درخواست دی تھی۔ ایک بار سب کچھ اس کے نام منتقل ہو جاتا تو بعد میں منصب لاکھ سر پٹختا رہے، یہ قانونی کام اتنی آسانی سے نمٹنے والے نہیں ہوتے، لیکن ارحم کے لیے یہی کافی نہیں تھا۔ بھلا کیا ضرورت تھی ایک اضافی جھمیلا پالنے کی۔ اس کے ذہن پر سوچ کر ہی جھنجلاہٹ سوار ہونے لگتی کہ منصب بھی مستقبل میں اس کی برابری کی سطح پر آ کھڑا ہو۔ ارحم نے ایک گہرا سانس چھوڑتے موبائل اوپن کر کے نمبر ملایا۔

"بادشاہ خان..... ہوں، میں ہوں ارحم خان۔" اس نے اپنی آواز قدرے نیچی رکھی۔

"سلام خان جی....."

"تھانہ میں ہو؟"

"جی خان ام ادر ہی ہے۔ حکم کرو۔"

"حویلی آنا لیکن چھپ چھپا کر۔۔۔ کہو تو کالے شیشوں والی کار بھیج دوں۔"

"مشکل نہیں ہے خان۔ کڑک سردی ہے آج کل۔ سر منہ لپیٹ کر آئے گا تو کچھ خبر نہیں ہوگی کسی کو۔"

"ہاں لیکن بہت لیٹ آنا۔ میں ملازموں کو بھی فارغ کر دوں گا۔ کچھ بہت ضروری معاملہ ہے۔۔۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

"جی خان۔ سمجھ گیا۔"

"ہوں۔ اوکے۔" ارحم کال آف کر کے پلٹا تو قدم جم سے گئے۔ شہناز اسے پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"اس کو کیوں بلا رہے ہو..... کیا کام ہے؟"

کے تیور دیکھ کر حیران تھا۔ "آپ کو معلوم تو ہے۔ ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔"

"کون سی بات؟"

"منصب کے لیے۔" اس نے اپنی طرف سے مطلع کیا وہ بھی بڑے عام انداز میں "تم اب بھی یہ سب سوچ رہے ہو۔ اب بھی؟" وہ جیسے چیخ اٹھیں، اور ارحم کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔

"ہاں کیوں۔۔۔ کیا مطلب۔"

"ارحم۔۔۔ تمہاری خالہ کا ٹھیک ہونا۔ اس کے انکشاف۔۔۔ ان لوگوں کی اچھائیاں۔۔۔ تم۔۔۔ اب بھی ایک کرائے کے قاتل کو بلا رہے ہو؟" شہناز کا صدمے سے برا حال تھا۔

"ارے بس بھی کر دیں۔" ارحم نے سخت بے زاری اور نفرت سے ہاتھ جھٹکا "ان سب باتوں کا منصب کی وراثت سے کیا لینا دینا۔۔۔ وہ مصیبت تو ابھی بھی سوار ہے سر پر لیکن بادشاہ خان کو بلانے کا کیا مطلب۔۔۔ کیا تم منصب کی جان لینا چاہتے ہو؟" شہناز کی آنکھیں پھیلی ہوئی سی تھیں۔ ارحم نے ایک مرتبہ پھر چونک کر دیکھا۔

"آپ تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہیں جیسے یہ نئی بات ہو۔ ہم پہلے ڈسکس کر چکے ہیں نا۔"

"پاگل ہو ارحم۔" شہناز چیخ ہی پڑیں "تم ابھی بھی یہ سب سوچ رہے ہو۔ تم منصب کی جان کیسے لے سکتے ہو جبکہ اس غریب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم ایک ماں کی گود کیسے اجاڑ سکتے ہو۔ اس بے چارے کو ابھی ابھی اس کا بیٹا ملا ہے۔ تمہارا باپ تھا ہر برائی کی جڑ، ہر جرم کا ذمہ دار..... یا..... یا پھر میں..... جس نے منصب کو اس کے سگے ماں باپ سے جدا کر دیا۔ اب ایسا کچھ مت ہونے دو..... خدارا..... میری عاقبت سنورنے دو۔" وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور ارحم کے آگے انہوں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ ارحم نے ماں کی باتوں کو نہایت بے دلی اور کسی قدر غصے سے سنا تھا۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی

کہ عین ایسے نازک موقع پر ماں اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔۔ جبکہ باپ دادا کی جائیداد کا اکلوتا وارث بننے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"دیکھیں میں کہہ رہا ہوں آپ سے۔ جذباتی بن کر مت سوچیں۔۔ اس سے پہلے کہ دنیا پر یہ سچ آشکار ہو۔ مجھے میرا کام کرنے دیں۔ آج میں عدالت میں درخواست دائر کر رہا ہوں۔ جس کے بعد وراثت قانونی طور پر میرے نام منتقل ہو جائے گی۔ مجھے ایسی کسی مصیبت کا اندازہ ہوتا تو بابا کے بعد یہ کام میں بہت پہلے کروا چکا ہوتا۔ اب سے پہلے تو ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔" وہ اپنے آپ میں جھنجھلا رہا تھا۔ جانتا تھا آج کل قانونی کام بہت منظم طریقے ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے اس سے باپ کے بھائیوں کی بابت پوچھا جاتا، جس کے نتیجے میں جمال چچا کی تینوں بیٹیوں کو اس کا وراثتی حق ملتا، جہاں تک منصب کی بات تھی تو ڈی این اے رپورٹ اور دادی کے بیان کے بعد جائیداد کا پورا معاملہ ایک لمبے عرصے تک جانچ پڑتال کی نذر ہو جاتا۔ ارحم کو یہی بہتر لگا کہ تین بہنوں کو بھلے ان کا حق دے دیا جائے لیکن ارحم کو منصب کی حصہ داری ہرگز قبول نہ تھی۔ اور اس کے لیے اس کم بخت کا جان سے جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے ارحم۔" شہناز نے انگلی اٹھا کر مٹنے کو متنبہ کیا۔ "تم منصب کی حیثیت سے آگے آؤ گے اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچاؤ گے۔ میں کہہ رہی ہوں ارحم۔ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ مت بددعائیں لو کسی ماں کی۔ آج تم بھی اولاد والے ہو گئے ہو۔ کسی کا برا مت سوچو۔ انسان بڑے گھاٹے میں آ جاتا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے۔" وہ بول رہی تھیں لیکن ارحم جھٹکے سے بازو چھڑوا کر باہر نکل گیا۔ شہناز پھر بھی شور مچاتی اس کے پیچھے بڑے پھاٹک تک چلی آئیں۔ گلناز نے کمرے سے نکل کر دیکھا۔

تاسف بھری ایک آہ نکل گئی۔ اس کی آپا ذہنی طور پر آج کل بڑی منتشر ہو چکی تھیں۔ شوہر کے کردار نے انہیں آج زندگی کے اس موڑ پر لا کر توڑا تھا جبکہ وہ دنیا میں موجود ہی نہیں تھا۔ پر آپا تھیں کہ سنبھلتی دکھائی نہ دیتی تھیں۔ انہیں اپنی زیادتیوں کا پچھتاوا چین نہ لینے دیتا تھا۔ نجانے ارحم اتنا بگڑا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ کم از کم ماں کی صحت کا تو کچھ احساس کرے۔ وہ بس سوچ کر دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

فضا میں خنکی تو جیسے ٹھہر ہی گئی تھی۔ سورج نکلے ہفتہ بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ دھند نے اُن دنوں پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ہر کوئی صبح سویرے اپنے بستروں میں دبکا ہوا تھا۔ میاندم کا سرسبز ماحول بڑے دن ہوئے برف کی سفیدی میں ڈھل چکا تھا۔ منصب نے یونیفارم پہن کر دستانے بھی ہاتھوں پر چڑھا لیے۔ وہ دوسروں کے آرام کے خیال سے خود ہی کچن کی طرف بڑھا کہ ایک گلاس دودھ گرم کر کے پی لے اور آفس چلا جائے۔ آج آفس سے واپسی بھی کچھ جلدی کرنی تھی کیونکہ گھر پر راشد کی امی اور بہنیں آ رہی تھیں۔ رمشہ کا رشتہ یوں تو راشد سے طے پا چکا تھا لیکن اب وہ لوگ شادی کی تاریخ رکھنے آنا چاہ رہے تھے۔

وہ کچن میں داخل ہوا تو سامنے چولہے کے نزدیک کسی کو کام میں مصروف پایا۔ سردی کی وجہ سے چونکہ مکمل شال اوڑھ رکھی تھی اس لیے سمجھنا مشکل تھا کہ کون ہے۔ فیروزہ، رمشہ، ایلیایا۔ وہ ہلکا سا کھنکارا جس پر وسیلہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔

جامنی شال میں اس کا سفید گلابی چہرا کچھ سرخ سرخ سا محسوس ہوا۔ منصب پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنا رخ دوبارہ پھیر لیا۔ منصب کے قدم پہلے تو بے ساختہ وہیں رُکے کیونکہ اتنا تو گزرے کچھ عرصے کے دوران دیکھ ہی چکا تھا کہ باوجود ایک ہی گھر میں رہنے کے وہ اس سے مکمل گریز کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سب گھر والے ایک جگہ موجود ہوتے وہ تب بھی

منصب کی وجہ سے اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔
منصب کے دل میں بہت دنوں سے جتنا کچھ چل رہا تھا، اسے وہ اپنی خاموشی، عدم موجودگی اور سرد رویے سے مات دیتی آئی تھی۔ منصب چاہ کر بھی اپنے اندر کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ اُس وقت بھی یہی سوچا کہ وسیلہ اسے دیکھ کر ضرور یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوگی، لیکن اس کی عین دروازے میں موجودگی کی وجہ سے مشکل میں پھنس چکی ہے۔

منصب ایسے مواقع پر بڑا مصالحتی اور احساس کرنے والا بندہ تھا۔ تبھی قدم وہیں روک کر پہلے پہل واپس چلے جانے کا ہی ارادہ کیا لیکن پھر اگلے ہی لمحے ایک سوچ اس کے لبوں پر شیطانی مسکان بن کر ٹھہر گئی۔ مروت کی مارتم بہت کھا چکے منصب رضا، کبھی کبھار ڈھیٹ بن کر اپنا بھلا بھی سوچ لینا چاہیے۔ کیا پتا اسی ڈھٹائی میں اگلے کا بھی کچھ فائدہ چھپا ہو۔ کیا پتا یہ گریز محض ایک ظاہری پردہ، ایک انا کی دیوار کے سوا کچھ نہ ہو۔ کیا پتہ کوئی ہماری پہل کا منتظر ہو۔ کیا معلوم اگلے کو ہماری کم ہمتی سے سارے گلے ہوں۔ وہ کچھ کچھ اچھے گمان کرتا خود اپنی جرات کو پڑھاوا دیتے مزید آگے آیا۔ وہ ہنوز پیٹھ کیے کھڑی تھی۔ منصب نے دیکھ لیا تھا کہ وہ چائے بنا رہی ہے۔ چائے کی پتی شاید ابھی ہی ڈالی تھی کیونکہ کھولتے ہوئے دودھ پر ابھی چائے کا گہرا رنگ غالب نہیں آیا تھا۔ وہ اس وقت وسیلہ کی عین پشت پر کھڑا تھا اور وسیلہ کو بھی اس بات کا احساس ہو چکا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز تر اور گھبراہٹ اس سے بھی سوا ہو چکی تھی۔ منصب یہاں تک کیوں آیا، اُسے وہیں سے پلٹ جانا چاہیے تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے بلاوجہ کپ سیدھے کیے۔

''دوسرا کپ دادی کے لیے؟'' منصب نے ٹرے میں دو کپ دیکھ کر سوالیہ اسے دیکھا اب وہ پیچھے سے ہٹ کر اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا تھا۔ وسیلہ نے سر نفی میں ہلایا۔

''وہ سو رہی ہیں۔''

''تو..... امی؟'' اس نے پھر پوچھا، وسیلہ نے پھر سر کو نفی میں ہلایا۔ وہ بتا نہیں پائی کہ دو کپ تو اس نے بلاوجہ گھبراہٹ میں سیدھے کیے تھے۔ ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اور جھوٹ بھی نہیں بول پائی کیونکہ امی اور دادی کے کمرے میں تو وہ گئی ہی نہ تھی۔

''رمشہ؟'' وہ بھی جیسے ٹھان چکا تھا کہ چپ نہیں رہے گا۔ وسیلہ اس کے سوالوں سے زچ ہو چکی تھی۔ اس بار کوئی جواب نہیں دیا اور ٹھک سے چولہا بند کر دیا۔ انداز ہی بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس کی موجودگی سے تنگ ہے۔ منصب نے ہنسی بڑی مشکل سے ضبط کی۔ وسیلہ کا غصہ بالکل برا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ چاہتا تھا آج وہ اپنا سارا غصہ ایک ساتھ نکال ہی پھینکے۔

''مجھے ایک کپ مل سکتا ہے؟'' اس نے پھر بڑے سکون سے سوال کیا، ایک طرح سے وسیلہ کی بے زاری کو مکمل نظر انداز کیا۔

''لے لیں۔'' وسیلہ نے چہرہ سخت ہی رکھا۔

''میں تو بہت اسٹرونگ چائے پیتا ہوں، ایسی دودھ پتی تو بالکل بھی نہیں۔'' اس نے منہ بنا کر اس پھیکی سی چائے کو ریجیکٹ کیا۔ وسیلہ کو کچھ اور غصہ آ گیا، حد ہے بدتمیزی کی۔ وہ تو وہاں رکنا بھی نہیں چاہتی تھی اور یہ ہیں کہ نخرے کیے جا رہے ہیں۔ اس نے چھلنی رکھ کر اپنے لیے چائے انڈیلی اور کپ اٹھا لیا۔

''خود بنا لیں۔'' وہ اپنا کپ لے کر ہٹ گئی اور ایک اوپر والی کیبنٹ سے پلاسٹک کا ایک ڈبا نکالا۔ منصب نے غور سے دیکھا، وہ تو ٹیبلٹس وغیرہ کا باکس تھا۔ وسیلہ اسے کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ منصب کام چھوڑ کر بغور دیکھنے لگا۔ وسیلہ نے گولیوں کا ایک پتا ہاتھ میں لیا۔ چھوٹی میز پہ رکھے جار میں سے دو تین بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور قدم دروازے کی طرف بڑھائے لیکن منصب اس سے پہلے ہی اس کے سامنے آ گیا۔

''کیا ہوا ہے۔'' کس چیز کی گولی ہے؟ اس

نے دروازے پہ ہاتھ رکھ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ یونہی۔" وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ منصب نے بھی بنا کچھ اور پوچھے انگلیاں اس کے ماتھے پہ رکھ دیں۔ اوہ...... تو اس کا چہرا یونہی سرخ نہیں لگ رہا تھا۔

"تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" وہ پریشانی میں طرز تخاطب بھی درست نہیں کر پایا جبکہ وسیلہ کو "تمہیں" کہے ایک مدت گزر چکی تھی۔

"جی مجھے اپنے کمرے میں آرام کرنا ہے، راستہ دیں۔" وہ نکلنے کی کوشش میں تھی لیکن منصب نے اس کی کلائی پکڑ کر چائے کی ٹرے اپنے دوسرے ہاتھ میں لی اور اسے لا کر کرسی پہ بٹھایا، دواؤں کا باکس ابھی تک وہیں رکھا تھا۔ منصب نے اس میں سے ڈیجیٹل تھرمامیٹر نکالا اور وسیلہ کی طرف بڑھایا۔

"رکھو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا اور وسیلہ نے تھرمامیٹر منہ میں رکھ لیا۔

"ایک سو تین......" منصب نے بیپ بجنے پر تھرمامیٹر کو جانچا اور حیرت سے وسیلہ کو دیکھا۔ "پاگل لڑکی۔ ایک سو تین بخار میں تم یہاں کھڑی خود چائے بنا رہی ہو۔ رمشہ کو نہیں جگا سکتیں۔ اور ہوا کیسے یہ بخار نہیں پتا۔" اس نے کہنی میز پہ ٹکا رکھی تھی۔ سر کو تھک کر ہتھیلی پہ گرایا۔ طبیعت کو اب تک کے وقت میں بڑی مشکل سے سنبھال کر کھڑی تھی۔ لیکن اب منصب کو خبر ہو گئی تو اس کے لیے بھی جبر مشکل ہو گیا تھا۔ چہرے سے آگ نکل رہی تھی۔ سر خالی خالی اور بھوک کی وجہ سے اب نقاہت بھی خوب ہونے لگی تھی۔ منصب نے ساتھ والی کرسی کھینچ کر اسے — جار میں سے کیک نکال کر دیا۔ وسیلہ نے پیچھے ہونے کی کوشش کی لیکن منصب نے زبردستی آگے بڑھ کر نا صرف کیک کھلا دیا بلکہ چائے کا کپ بھی پورا خالی کروایا۔

"رات کے بعد کچھ نہیں کھایا ہو گا۔ تمہیں تو گرم دودھ پینا چاہیے تھا۔ بخار میں کمزوری نہیں ہونی چاہیے۔ اچھا یہ گولی فوراً کھاؤ۔ پھر دودھ بھی گرم کرتا ہوں۔" وہ بنا اس کی سنے اسے گولی کھلا کر دودھ گرم کرنے چلا گیا۔ وسیلہ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وجود پر بے انتہا سستی چھا چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی تو ہو گئی لیکن دروازے تک پہنچنے کے لیے قدموں میں تیزی نہیں لا سکی۔ مقصد صرف منصب سے دور ہونا تھا تب ہی وہاں سے نکلنے کے لیے زور لگایا لیکن منصب کی چستی کا مقابلہ نہیں کر پائی۔ وہ دوبارہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"مجھ سے دور بھاگنے کی خواہش بھی جی بھر کے پوری کر لینا۔ تم نہ چاہو تو ظاہر ہے کہ زندگی بھر تمہارے سر پہ مسلط نہیں ہو سکتا۔ ان چاہے رشتوں کے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہیے۔ میں جانتا ہوں وسیلہ میری موجودگی تمہیں اپنے گھر میں کھل کر سانس لینے نہیں دیتی۔ اور یہ بات سب سے زیادہ میرے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ لیکن تم پریشان مت ہو، مجھے اپنا ذاتی کوارٹر ملنے والا ہے۔ میرے لیے وہاں جا کر رہنا کوئی مسئلہ نہیں۔ بس ایک ڈیڑھ ماہ اور۔ اور ابھی تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ ذہن کو سوچوں کی نذر کرنے سے بندہ بیمار پڑتا ہے۔ تم اس وقت آزاد ہو، اپنوں میں ہو۔ اس خوشی کو محسوس کرو اور بے کار کی سوچوں کو حاوی مت ہونے دو۔" وہ اس کے مقابل کھڑا بولے جا رہا تھا۔ وسیلہ نے چپ کر کے اسے سنا، پلکیں نم ہوئیں، وجہ اسے بھی معلوم نہ تھی۔ نظریں نیچے فرش پر تھیں۔ جہاں دو فٹ کی دوری پر منصب کے قدم تھے اور پھر وہ قدم دور ہونے لگے۔

"جاؤ، شاباش اپنے کمرے میں آرام کرو۔" وہ کہہ کر رکا نہیں اور جیپ میں بیٹھ کر سب سے پہلے رمشہ کو کال کی، اسے وسیلہ کی طبیعت کا بتایا اور آفس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"وہ...... ہا...... ہیلو۔" اٹک اٹک کر بولتی وہ کوئی عورت تھی، جو کافی گھبرائی ہوئی سی تھی۔ منصب نے موبائل کی آواز مکمل بڑھائی۔ وہ اس وقت آفس میں اکیلا بیٹھا تھا۔

pklibrary.com

"جی۔ کون؟"

"مم..... منصب ہو؟" اسی گھبرائے انداز میں پوچھا گیا۔

"جی منصب بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟"

"میں ہوں..... گلناز....." نہایت دھیمے سے انداز میں کہا گیا اور منصب کو ٹھہر کر کچھ دیر سوچنا پڑ گیا۔ فوری طور پر وہ گلناز تو ذہن میں آئی ہی نہیں جو وچ اور بچی کے نام سے مشہور تھی۔

"آپ؟" منصب کا انداز سوالیہ اور جان لینے جیسا تھا۔

"تمہاری تائی کی بہن، ارحم کی خالہ....." اس بار گلناز نے نسبتاً کچھ اعتماد سے وضاحت کی اور منصب پہلے سے زیادہ حیران ہو گیا۔ گلناز بھی اتنے رواں اور نارمل انداز میں بات کر سکتی ہے شاید ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن یہی سچ تھا، وہ گلناز تھی جو اس سے مخاطب تھی۔

"جی جی السلام علیکم۔ کیسی ہیں خالہ۔" منصب نے زندگی میں پہلی بار اسے ایک رشتے سے پکارا۔

"میں ٹھیک ہوں منصب۔" تمہارا نمبر آپا کے موبائل میں تھا وہ آرام کر رہی ہیں۔ میں ان کے موبائل سے بات کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی جی میں سن رہا ہوں۔"

"منصب، وہ کیسی ہے۔ تانیہ۔" گلناز کو بہت دنوں سے جس ایک ہستی کی برابر یاد ستا رہی تھی وہ ضروری بات کہتے اچانک ہی اپنے دل کی بات کہہ گئی۔

"جی تانیہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔" منصب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ تانیہ کے لیے گلناز کا یہ ایک جملہ پوری فیس موصول ہونے جیسا تھا۔

"اسے میرا اسلام دینا۔ میں بھی اسے بہت یاد کرتی ہوں۔"

"جی ضرور۔"

"منصب۔ مجھے کہنا تھا کہ ارحم کی نیت اچھی نہیں ہے۔ وہ تمہاری جان لینا چاہتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھو۔"

"اوہ۔۔ منصب چونکا" کیا کرنا چاہتا ہے وہ؟"

"کوئی آدمی ہے بادشاہ خان۔ اس کو روپے دے کر تمہیں مروانا چاہتا ہے۔"

"بادشاہ خان۔ وہ تو کرائے کا قاتل ہے اور پولیس کو مطلوب ہے۔ تو وہ آج کل تھانہ میں ہے۔"

"ہاں اور ارحم کو پتا ہے کہاں رہتا ہے۔"

"ہوں۔۔ میں کچھ کرتا ہوں اس بارے میں۔ آپ کا بہت شکریہ خالہ۔"

"سنو منصب۔" گلناز کا لہجہ ایک بار پھر کچھ جھجک بھرا ہو گیا۔

"جی خالہ۔ حکم کریں۔"

"وہ..... آپا..... وہ بہت روتی ہیں۔ بہت تکلیف میں ہیں۔ ارحم ان کی کچھ سنتا نہیں ہے۔ وہ سارا دن روتی چلاتی رہتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ بھی میری طرح پاگل نہ ہو جائیں۔ وہ ارحم کی منتیں کرتی کہ منصب کو کچھ مت کہو۔ سب کو معاف کر دو لیکن ارحم کچھ نہیں سنتا۔ تانیہ میری بہن کو بھی ٹھیک کر دے منصب۔" گلناز کا لہجہ بھیگ سا گیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں خالہ..... اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تائی جان کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور آپ کا بہت شکریہ، آپ نے مجھے بروقت مطلع کیا۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" گلناز نے کسی قدر سکون محسوس کرتے فون بند کر دیا۔ منصب البتہ بہت دیر تک اسی معاملے پر سوچتا رہا۔ گلناز کی کال کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کال میں بہت کچھ ایسا تھا جس پر فوری ایکشن لینے کی ضرورت تھی۔ حالانکہ اس میں جان کا خطرہ بھی تھا۔ لیکن جان کا خطرہ بھلا ایک جیتے جاگتے انسان کو کب نہیں ہوتا۔ ہمت کا قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

فرزانہ چیمہ

عذرا

"عذرا مرگئی"

"اسے ایک عرصے سے کینسر تھا۔"

یہ دو خبریں میرا دل دہلا گئیں۔ مرنا تو سب ہی کو ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اس نے وقت مقررہ پر جانا بھی ہے۔ مگر اس طرح......؟ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ یادوں کا پنچھی پرواز کرتا ہوا مجھے اپنے ساتھ بہت پیچھے لے گیا۔

وہ تھی تو میری باجی جمیلہ کی سہیلی مگر میرے ساتھ بھی اس کی گپ شپ ہو جاتی۔ ہمارے گھر کی مشترکہ دیوار تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ باپ کی ایک دو ایکڑ زمین تھی۔ اسی پر ساری گزر بسر تھی۔

عذرا شکل و صورت کی اچھی تھی۔ صاف ستھری رہتی۔ کنگھی روزانہ کرتی سرمہ لگاتی تو گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے نمایاں لگتی۔

پرائمری تک پڑھنے کے بعد اسکول چھوڑ گئی۔ اور گھرداری میں لگ گئی، مگر خود پسندی مزاج کا حصہ بننے لگی۔ شادی بیاہ میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرتی۔ ڈھولک بھی اچھی بجاتی ٹپے بھی خوب گاتی۔ گھر میں بیٹھ کر مشین پر کپڑے بھی سلائی کرنے لگی۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے کماؤ پتر بن گئی۔ اب ماں اس کی بات زیادہ ماننے لگی تھی۔

وقت گزرتے پتا ہی نہ چلا اور عذرا کے رشتے آنے لگے۔ والدین چاہتے تھے کہ ان کی عذرا اپنے گھر کی ہو جائے۔ ہم بھی اس کے بچوں کی رونق دیکھیں۔ اپنے نصیب میں تو صرف عذرا ہی لکھی تھی۔ اب اس کے بال بچے ہمارا دل بہلایا کریں۔ مگر عذرا کسی بھی رشتے پہ ہاں نہ کرتی۔ کچھ گاؤں کے اندر سے ماؤں نے پوچھا۔ کچھ آس پاس کے گاؤں سے رشتے آئے مگر عذرا ہر جگہ انکار کر دیتی۔ شاید خود پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ماں باپ بھی اس سے دبنے لگے تھے، گاؤں کے رشتے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ اس لیے انکار کرنا لڑکے میں خامی نکال دینا، اسے بڑا آسان لگتا۔

کسی کا قد چھوٹا ہوتا تو کسی کا ماتھا اسے تنگ لگتا۔ کسی کی چال اسے ناپسند تھی تو کسی کی آواز ذرا باریک لگتی......اور ہاں ہر دفعہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو جاتی۔ باپ کا کوئی رعب ہی نہ تھا کہ عذرا کی ماں خوب صورتی کے بل پر، ہمیشہ اس سادہ اور شریف کسان پر حاوی رہی۔ چنانچہ ہر اہم فیصلے کی منظوری ماں بیٹی کے ہاتھ میں تھی۔ آس پاس کی ہم درد خواتین سمجھاتیں۔

"برکت بی بی! ہوش کی دوا کرو۔ بیٹی کی عمر روز بروز آگے ہی جاتی ہے۔ اب کردو ہیں۔"

مگر ماں کا ایک ہی جواب ہوتا۔ "بیٹی مانے تو تب نا!"

اسی طرح سالوں پہ سال گزرتے رہے۔ اس سے چھوٹی عمر کی لڑکیاں، اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں مگر عذرا کو نہ جانے کس شہزادے کا انتظار تھا۔ اس کی معصومیت اور جاذبیت سنجیدگی میں ڈھلتی جارہی تھی۔ مگر خوب سے خوب تر کا سفر جاری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ماں پہ اس کا وجود بھاری تھا۔ باپ نے شاید خود ہی اس سارے ماحول سے خود کو مخفی کر رکھا تھا۔

شادی بیاہ پر رونق لگانے والی عذرا، اب ایسی محفلوں میں جانے سے کترانے لگی تھی۔ ہر کسی کی

پھریں اسے ایک ہی سوال کرتی کیوں
ہوتیں۔شادی کب......؟شادی کب......؟

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ کافی عرصہ سے رشتے آنا بھی تقریباً بند ہو گئے تھے۔ تنہائی میں اور بھی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے بچپن کی سہیلی جمیلہ، ڈبل ماسٹرز کر کے اب کالج میں لیکچرار لگ گئی تھیں۔ ہمارے والد صاحب کو پڑھائی کا شوق تھا۔ انہوں نے ہاسٹل میں بھیج کر، سب بہن بھائیوں کو اعلا تعلیم دلوائی تھی۔ میں نے بھی بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔

جب بھی چھٹیوں میں گاؤں جانا ہوتا، عذرا بھاگ کر ملنے آجاتی پھر ساری روداد باجی جمیلہ کے گوش گزار کرتی۔ یاسمین بھابی بڑے خلوص سے مشورہ دیتیں۔

"عذرا! ماں باپ کے فیصلے میں برکت، رحمت سب شامل ہوتی ہے۔ خود تنقید کرنا چھوڑ دو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جہاں والدین کہیں، سر جھکا دو۔ کب تک انتظار کرتی رہو گی اپنے من چاہے رشتے کا......؟"

اب کی دفعہ اس کی باتوں میں تیزی نہ تھی۔ لہجہ میں بھی شکستگی سی تھی۔

تعطیلات میں ہم لوگ گاؤں نہ جا سکے۔ دوسرے سال گئے تو عذرا کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ اگلا ہی دروازہ ہمارے گھر کا تھا۔ کافی دیر تک عذرا ملنے نہ آئی تو سب کو اس کی کمی محسوس ہوئی۔ دراصل وہ اکیلی ہونے کی وجہ سے، ہمارے گھر میں بہت چاہی جاتی تھی۔ میری سب آپا لوگ اس کا بڑا خیال کرتیں۔ اور جمیلہ باجی کی تو تھی بھی سہیلی۔

عذرا کے نہ آنے کو سب نے ہی محسوس کیا مگر کس سے پوچھا جاتا۔

صبح ہم لوگ ناشتہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ عذرا کی ماں آگئی۔

"بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ یہاں تو رونقیں لگی ہوئی ہیں۔" "چاچی! عذرا کہاں ہے۔؟" باجی جمیلہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"وہ اپنے سسرال ہے۔ جمیلہ پتر!"

"سسرال۔؟" سب نے بیک وقت دہرایا۔

"کب ہوئی شادی......؟ کہاں کی......؟ آخر اسے کوئی پسند آہی گیا۔ الحمدللہ۔"

ہم سب نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ چاچی برکت کے چہرے پہ، خوشی کی کوئی رمق نہ تھی شاید

pklibrary.com

اکلوتی بیٹی کی جدائی پریشانی کا سبب تھی۔

مجھے وہ کچھ پنجابی کے گیت یاد آنے لگے جو عذرا دوسروں کی شادی بیاہ پر ڈھولک پر گایا کرتی۔

چھلیاں ماواں، دھیاں گلے ملیاں
چارے کندھاں نے چوبارے دیاں ہلیاں

"بہت مبارک ہو چاچی!"

"کہاں شادی کی ہے......؟"

"نزدیک کے ایک گاؤں میں۔ میں نے صبح سویرے ہی عذرا کے ابا کو اسے لینے بھیج دیا ہے۔ بس آتی ہی ہوگی۔ مجھے رات ہی آپ لوگوں کے آنے کا علم ہو گیا تھا۔"

ظہر کی نماز سب نے پڑھی ہی تھی کہ گیٹ کھلا۔ دیکھا تو عذرا اندر آ رہی تھی۔ گود میں ایک کمزور سی، گہرے سانولے سے رنگ کی سال، ڈیڑھ سال کی بچی اٹھائے ہوئے۔ خود اس کا اپنا رنگ بھی میلا میلا سا لگ رہا تھا۔ جمیلہ باجی سے ملتے ہوئے اس کی خوب صورت آنکھیں چھلک ہی پڑیں۔ ماحول کافی افسردہ سا ہو گیا۔ کوئی بھی اسے مبارک نہ کہہ سکا۔

"یہ بچی کون ہے......؟" آخر یاسمین بھابی نے سکوت توڑا۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" یہ کہتے کہتے روتے ہوئے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"بیٹی......؟" حیرت سے ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ روتے روتے اب اس کی سسکیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے منہ صاف کیا۔ پاس پڑی چارپائی پہ بیٹھ گئی اور پھر پوچھے بغیر ہی اپنی کہانی سنانے لگی۔ جانتی تھی کہ ہم سب تفصیل جاننے کے منتظر ہیں۔

"آپ کو خوب معلوم ہے کہ میں کسی ان دیکھے شہزادے کی آس لگائے ہر رشتہ ٹھکراتی رہی۔ ماں باپ میری ہاں کے منتظر رہے۔ اس بات نے مجھے اور خودسر بنا دیا۔ اب رشتے آنا بند ہو گئے تھے۔ عمر کا پنچھی مسلسل پرواز کرتا جا رہا تھا۔ ایسے میں مایوسی نے مجھے اور پریشان کر دیا۔

ایک دن میں چولہے کے آگے بیٹھی راکھ کرید رہی تھی کہ باہر کسی فقیر کی صدا نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بڑی اداس لے میں میاں محمد بخش کا کلام گا رہا تھا۔ میرے ابے کو بھی اس طرح کے بہت سے شعر زبانی یاد ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کتنی سچائی تھی اس کلام میں۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے، حسن جوانی، سدا نہ صحبت یاراں

میرا دل ٹوٹے ٹوٹے ہو رہا تھا۔ کچھ بھی تو میرے پاس نہ رہے گا بس ان ہی دنوں کی بات ہے کہ اسلم کا رشتہ آ گیا۔ ایک بچی کا باپ۔ بیوی اس کو چھوڑ کر میکے جا بیٹھی۔ اپنی بیٹی بھی چھوڑ گئی جو باپ ہی کی تصویر ہے۔ بس اسلم بھی ایسا ہی ہے۔ کالا بھجنگ۔ اس کا رشتہ آیا۔ اماں انکار کرنے والی تھی کہ عذرا تو کبھی نہیں مانے گی۔ مگر میں نے ہاں کر دی۔ جو کچھ بندہ بوتا ہے وہی تو کاٹتا ہے۔ اب اسلم کی بھی خدمت کرتی ہوں اور اس بچی کو بھی سنبھالتی ہوں۔ آپ سمجھیں کہ وہ عذرا تو کہیں مر کھپ ہی گئی ہے۔ میں تو میکے بھی کم ہی آتی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں کے در و دیوار۔ عورتیں۔ بچے سب میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ تو صبح ابا نے جا کر مجھے بتایا کہ تمہاری سہیلی جمیلہ اور اس کے بہن بھائی سب آئے ہیں تو میں آپ سب کی محبت میں بھاگی چلی آئی۔"

عذرا ہم سب کو بے طرح اداس کر گئی۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ میرے بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ انہوں نے شہر کے اچھے علاقوں میں اپنے اپنے گھر بنا لیے۔ میں بھی تعلیم مکمل کر کے اگلے گھر جا بسی۔ کبھی کبھار کوئی گاؤں سے آتا تو سب کی خیر خیریت معلوم ہو جاتی۔ پتا چلا اللہ نے عذرا کو اولاد سے محروم ہی رکھا۔ پھر یاسمین بھابی نے بتایا کہ عذرا کو کینسر ہو گیا ہے۔ سخت افسوس ہوا اور...... آج...... آج اس کے مرنے کی خبر بھی آ گئی۔

اب میں اس کی کہانی لکھ رہی ہوں کہ آئندہ کوئی اور لڑکی عذرا جیسے انجام سے دوچار نہ ہو۔ خودسر نہ ہو۔ اور والدین بھی اولاد کو اس طرح سر نہ چڑھائیں کہ وہ ان کے ہاتھ سے ہی نکل جائے۔ مناسب وقت پر دیکھ بھال کر رشتہ طے کر دیا کریں۔ اللہ خیر و برکت دے گا۔

☆☆

pklibrary.com

متاعِ الفاظ

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو
ہم اسی چھوٹی سی دنیا کے رستے پر
اتفاقاً کبھی بھولے سے کہیں مل جائیں

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح
کچھ تکلف سے سہی ٹھہر کے کچھ بات کریں
اور اس عرصۂ اخلاق و مروت میں کبھی
ایک پل کے لیے وہ ساعتِ نازک آجائے

نا خنِ لفظ کسی یاد کے زخموں کو چھوئے
ایک بھٹکا ہوا جملہ کوئی دکھ دے جائے
کون جانے گا کہ ہم دونوں پہ کیا بیتی ہے

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو

اس خموشی کے اندھیروں سے نکل آئیں چلو
کسی سلگتے ہوئے لہجے سے چراغاں کر لیں
چن لیں پھولوں کی طرح ہم بھی متاعِ الفاظ
اپنے اجڑے ہوئے دامن کو گلستاں کر لیں

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو

دولتِ درد بڑی چیز ہے اقرار کرو
نعمتِ غم بڑی نعمت ہے یہ اظہار کرو
لفظ پیماں بھی اقرار بھی اظہار بھی ہیں

طاقتِ صبر اگر ہو تو یہ غم خوار بھی ہیں
ہاتھ خالی ہوں تو یہ جنسِ گراں بار بھی ہیں
پاس کوئی بھی نہ ہو پھر تو یہ دلدار بھی ہیں

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو!

زہرہ نگاہ

گھر میں رہتے ہوئے غیروں کی طرح ہوتی ہیں
لڑکیاں دھان کے پودوں کی طرح ہوتی ہیں

اُڑ کے اک روز بہت دُور چلی جاتی ہیں
گھر کی شاخوں پہ یہ چڑیوں کی طرح ہوتی ہیں

سہمی سہمی ہوئی رہتی ہیں مکانِ دل میں
آرزوئیں بھی غریبوں کی طرح ہوتی ہیں

ٹوٹ کر یہ بھی بکھر جاتی ہیں اک لمحے میں
کچھ امیدیں بھی گھروندوں کی طرح ہوتی ہیں

منور رانا

pklibrary.com

جو ملا اس سے گزارا نہ ہوا
جو ہمارا تھا ہمارا نہ ہوا

ہم کسی اور سے منسوب ہوئے
کیا یہ نقصان تمہارا نہ ہوا

بے تکلف بھی وہ ہو سکتے تھے
ہم سے کوئی اشارہ نہ ہوا

دونوں ایک دوسرے پہ مرتے رہے
کوئی بھی اللہ کو پیارا نہ ہوا

طاہر فراز

مقابلے کے نہ ہم دشمنی کے قابل ہیں!
ذہین لوگ ہیں بس عاشقی کے قابل ہیں

جو اپنی مرضی کا سوچیں، تم ان کو دفنا دو
کہ ایسی لڑکیاں کب رخصتی کے قابل ہیں

دکھی نہیں ہیں کہ ہم کیوں ہوئے نظرانداز
ہمیں پتا ہے کہ ہم بے رخی کے قابل ہیں

ہمیں ڈرایا گیا کب سکھایا ڈٹ جانا
ہم ایسے لوگ فقط عاجزی کے قابل ہیں

لڑائی ہم کو وراثت میں دی گئی ہے حضور
ہم اہلِ جنگ کہاں شاعری کے قابل ہیں

کسی وبا میں خدا ہم کو مبتلا کرے گا
ہم ایسے لوگ کہاں خودکشی کے قابل ہیں

صباحت عروج

pklibrary.com

شگفتہ جاہ

حسن خیال سے حسن سخن تک

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ تم غرباء اور مساکین کو کھانا کھلاؤ اور ہر شخص خواہ شناسا نہ ہو اسے سلام کرو۔(بخاری)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ سات باتیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔

1۔ بہت زیادہ غصہ۔
2۔ زیادہ پیاس۔
3۔ جلدی جلدی جمائی کا آنا۔
4۔ قے
5۔ نکسیر
6۔ بول و براز
7۔ یادالٰہی کے وقت نیند کا آنا۔

دلیل

پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن ہر وقت پریشان رہنا انسان کا اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

شریک گناہ

جھوٹی دنیا میں ووٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہوجائے گا اور برے آدمی کو ووٹ دینے والا بھی برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔(واصف علی واصف)

بابرکت نکاح

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ ایک بہت بڑے محدث گزرے ہیں وہ نیکی، حسن عبادت، خلوص، وسعت علم، جذبہ جہاد اور جواں مردی جیسی صفات میں بڑے ممتاز تھے۔

ان کے والد حضرت مبارک اپنی جوانی میں ایک دولت مند شخص کے باغ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ باغ کے مالک نے حضرت مبارک کی نیکی وتقویٰ کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنا مشیر بنالیا۔ وہ اپنے مالک کی مجلس میں بیٹھنے لگے۔ اب مالک اہم کام میں ان سے مشورہ کیا کرتا تھا۔

ایک دن مالک بڑا پریشان تھا۔ کہنے لگا میری بیٹی جوان ہوگئی ہے، اس کے لیے رشتے آنے لگے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، کس رشتے کا انتخاب کروں اور کس کا چھوڑوں؟

مبارک بولے۔ ”یہ تو ایسا کوئی مسئلہ پریشانی والا نہیں ہے۔ سنو جاہلیت کے لوگ حسب نسب کو اہمیت دیتے تھے۔ یہودی مال ودولت پر جان دیتے ہیں اور عیسائی حسن وجمال کو دیکھتے ہیں جبکہ اسلام کی ہدایت ہے کہ انتخاب زوج کے وقت دین واخلاق کو ترجیح دی جائے۔“

مبارک کی یہ باتیں مالک کو پسند آئیں۔ گھر گیا اور بیوی سے کہنے لگا۔

”اگر دین واخلاق کو ترجیح دینا ہی اسلام کا منشاء ہے تو پھر اپنی لخت جگر کے لیے مبارک سے اچھا کوئی نوجوان نظر نہیں آتا۔“

بیوی نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائی، بائیں

ہم اپنے ملازم سے بچی کا رشتہ کریں، مگر کچھ پس وپیش کے بعد وہ مان گئی۔

اس طرح باغ کے مالک کی خوب صورت بیٹی کا نکاح حضرت مبارک سے کر دیا گیا۔

یہ نکاح اتنا مبارک ثابت ہوا کہ اس لڑکی سے مبارک کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام انہوں نے عبداللہ رکھا اور پھر یہی وہ عبداللہ بن مبارک ہیں جو بہت بڑے محدث بن کر آسمان علم وادب پر درخشاں مثال چھوڑ گئے۔

فتح

☆ تمام فتوحات میں سب سے بڑی فتح اپنے آپ پر فتح پانا ہے۔ (افلاطون)

☆ میں آیا، میں نے دیکھا اور میں نے فتح کیا۔ (سیزر)

☆ گھڑ دوڑ میں تیزی ہمیشہ فتح کی نشانی ثابت نہیں ہوئی اور نہ ہی ہمیشہ طاقت ور ہی نے میدان جنگ میں جوہر دکھائے ہیں۔ (ابکلاس)

☆ اپنی خواہشات کو مغلوب کرنا ہی عظیم فتح ہے۔

☆ فتح ان لوگوں کے قدم چومتی ہے جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ (ورجل)

جہالت

ایک چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا "شیوانا" (قبل از اسلام ایران کا ایک مفکر) کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میری ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ معبد کے کاہن کے کہنے پر عظیم بت کے قدموں پر میری چھوٹی معصوم سی بہن کو قربان کر دے۔ آپ مہربانی کر کے اس کی جان بچالیں۔

شیوانا لڑکے کے ساتھ فوراً معبد میں پہنچا اور کیا دیکھتا ہے کہ عورت نے بچی کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑ لیے ہیں اور چھری ہاتھ میں پکڑے آنکھ بند کیے کچھ پڑھ رہی ہے۔

بہت سے لوگ اس عورت کے گرد جمع تھے۔

اور بت خانے کا کاہن بڑے فخر سے بت کے قریب ایک بڑے پتھر پر بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

شیوانا جب عورت کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اسے اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت ہے اور وہ بار بار اس کو گلے لگا کر والہانہ چوم رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود معبد کدے کے بت کی خوشنودی کے لیے اس کی قربانی بھی دینا چاہتی ہے۔

شیوانا نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو قربان کرنا چاہ رہی ہے۔

عورت نے جواب دیا۔

"کاہن نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں معبد کے بت کی خوشنودی کے لیے اپنی عزیز ترین ہستی کو قربان کر دوں تاکہ میری زندگی کی مشکلات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔"

شیوانا نے مسکرا کر کہا۔

"مگر یہ بچی تمہاری عزیز ترین ہستی تھوڑی ہے.....؟ اسے تو تم نے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا ہے تمہیں جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ تو پتھر پر بیٹھا یہ کاہن ہے کہ جس کے کہنے پر تم ایک پھول سی معصوم بچی کی جان لینے پر تل گئی ہو، یہ بت احمق نہیں ہے۔ وہ تمہاری عزیز ترین ہستی کی قربانی چاہتا ہے۔ تم نے اگر کاہن کے بجائے غلطی سے اپنی بیٹی قربان کر دی تو یہ نہ ہو کہ بت تم سے مزید خفا ہو جائے اور تمہاری زندگی کو جہنم بنا دے۔"

اس عورت نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بچی کے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور چھری ہاتھ میں لے کر کاہن کی طرف دوڑی مگر وہ پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے وہ کاہن

اس علاقے میں پھر کبھی نظر نہ آیا۔

دنیا میں صرف آگاہی کو فضیلت حاصل ہے اور واحد گناہ جہالت ہے۔

جس دن ہم اپنے "کاہنوں" کو پہچان گئے، ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

سادگی

سادگی ذہانت کی انتہا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے دنیا کے تمام انبیاء کرام، صحابہ کرام، اولیاء کرام، سائنس دان اور بین الاقوامی لیڈر سادہ تھے۔ دنیا کی کامیاب معیشتیں کے جن کی مثالیں دی جاتی ہیں ان ممالک کے لوگ سادہ اور عاجز ہیں، مثلاً چین اور جاپان۔ آج کے دور میں بڑے کامیاب لیڈر سادگی سے زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں مثلاً جرمنی کی سابق انجیلا جو کہ شادی سے لے کر اب تک ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتی رہیں۔ بھارت کے سابق وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی، جن کی بیگم ان کے برانے کرتے پھاڑ کر ان کے لیے رومال بنا دیا کرتی تھیں۔ ایپل کمپنی کے بانی اور مالک اسٹیو جابز اسستی جینز اور سستی شرٹ میں گزارہ کرتے وہ فرش پر سوتے ان کے گھر میں فرنیچر بھی نہیں تھا۔

ہماری قوم ذہانت کے اولین درجے پر ہے جو اسمارٹ رہنے کے لیے برانڈڈ کپڑے اور اشیاء استعمال کرنے پر توجہ دیتی ہے۔

بددعائیں

ہمارے یہاں عام ہے کہ والدین اور خاص کر مائیں بچوں کی معمولی شرارتوں پر انہیں بددعائیں دینا شروع کر دیتی ہیں۔ جان لیں کہ اپنے بچوں کے لیے بددعا کرنے سے ان میں فساد، ضد اور نافرمانی بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو بددعا نہ دیں بلکہ اللہ سے ان کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے دعا کیا کریں اور جب بھی آپ اپنے بچوں کو خوش ہوتے اور کھیلتے ہوئے پائیں تو ان کے لیے یہ دعا مانگیں۔

"اے اللہ! میں تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ انہیں جنت میں خوش رکھنا، جیسا کہ تو نے انہیں دنیا میں خوش رکھا ہے۔"

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆علم سیکھنا اور عمل نہ کرنا..... رزق کھانا اور شکر نہ کرنا تک ظرفی ہے۔ (خواجہ حسن بصریؒ)

☆انسان تنہائی میں فرشتے سے برتر یا حیوان سے بدتر ہوتا ہے۔ کیا بننا چاہتے ہو؟ (میوگو)

☆گناہ اس وقت تک دلچسپ نظر آتا ہے جب تک سرزد نہ ہو۔ (ٹالسٹائی)

☆صرف نیک ہی نہ بنیے بلکہ دوسروں کے ساتھ نیکی بھی کیجیے۔ (تھوریر)

☆نصیحت میں ایک فریق چھوٹا ہوتا ہے ایک بڑا۔ ناصح کے لیے برتر ہونا ضروری ہے۔ (زرتشت)

☆شرمیلا پن ایک عام آدمی کی زینت لیکن کاروباری آدمی کے لیے عیب ہے۔ (ہنری فورڈ)

☆روپیہ ہاتھ آنے کے لیے باپ یا چچا کی موت کا انتظار نہ کرو۔ (وکٹر ہیوگو)

☆اپنی آمدنی اور خرچ کا روزانہ حساب لکھتے جاؤ، چند روز میں اصلاح ہو جائے گی۔ (بارنم)

☆اگر عقل مند اور بے وقوف دونوں اسیر محبت ہو جائیں تو ان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ (واشنگٹن)

☆ضمیر اس آواز کا نام ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ (میکلین)

☆☆

اِدارہ

اسماء کی مسکراہٹ

انتقام

دو دوست طویل مدت کے بعد ملے تو ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''یار اس لڑکی کا حال احوال تو سناؤ جس کے ساتھ تم اکثر گھومنے پھرنے جایا کرتے تھے۔''

''سچ پوچھو تو میرے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔'' دوسرے دوست نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دن طیش میں آکر میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ وقت گزاری کر رہا تھا۔ یہ سن کر وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی اور بولی۔ ''میں تمہاری اس حرکت کا ایسا بدلہ لوں گی کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

''تو کیا وہ بدلہ لینے میں کامیاب ہوگئی؟'' پہلے دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔ دوسرے دوست نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتقام لینے میں کامیاب ہوگئی کیوں کہ اب وہ میری بیوی ہے۔''

ذہانت

ایک بچے نے ماں سے پوچھا۔ ''ممی میرا چھوٹا بھائی کس طرح پیدا ہوا؟'' بے چاری ماں اس سوال سے پریشان ہوگئی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ایک دن میں سو کر اٹھی تو میں نے دیکھا، وہ میرے برابر میں لیٹا ہوا تھا۔''

''اور اس سے چھوٹا بھائی؟'' اس نے پھر سوال کیا ماں نے کہا۔

''ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوب صورت بچہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے میری آنکھ کھلی تو یہ بچہ میری گود میں تھا۔'' اسی طرح بچے نے اپنے اور بہن کے متعلق پوچھا ماں نے اس طرح کہانی گھڑ کے اسے سنا دی۔ اس پر بچے نے اپنی ماں سے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی بچہ بھی نارمل طریقے سے پیدا نہیں ہوا ہے۔''

ہتھیار

ایک ریسٹورینٹ کے منیجر نے ایک کسٹمر پر مقدمہ دائر کر دیا اس کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ کسٹمر نے اس کے کلائنٹ کو پتھر مارا جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔

کسٹمر نے جواباً کہا کہ ''میں نے ہرگز منیجر کے سر پر کوئی پتھر نہیں مارا بلکہ وہ جو گوشت کی بوٹی میرے لیے لایا تھا میں نے وہ اس کے سر پر ماری تھی۔''

تشریح

موروثی بیماریوں کی تعریف کرتے ہوئے میڈیکل کے ایک طالب علم نے اپنے امتحانی پرچے میں لکھا۔ ''ورثے میں ملنے والی بیماریوں کو موروثی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کے دادا کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی، زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ کے والد کے ہاں بھی اولاد نہیں ہوئی اور عین ممکن ہے کہ آپ ہاں بھی نہ ہو۔''

سوال

''شوہر نے عدالت میں مجسٹریٹ سے شکایت کی ''جناب یہ سپاہی ہم میاں بیوی کو بلاوجہ پکڑ کر عدالت میں لے آیا ہے۔ ہم تو گلی میں کھڑے معمولی سی بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔''

مجسٹریٹ نے کہا۔ ''مگر آپ لوگ گھر کے

ماہنامہ کرن

فروری 2024ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "عائزہ خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اس ماہ "جویریہ فیصل مقابل ہے آئینہ،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "دامن سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- "کسوف" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- "اک لمحۂ جاوداں" عقیلہ ہاشمی کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "شبِ ہجر" ام اقصی کا ناولٹ،
- عطیہ خالد، قانتہ رابعہ، نازنین فردوس اور عندلیب زہرا کے افسانے اور مستقل سلسلے،

- **"کرن کتاب"**

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار ریسپیز کے ساتھ

فروری 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

بجائے گلی میں کیوں جھگڑا کر رہے تھے؟"

"بیوی فوراً بولی تو آپ کا مطلب ہے ہم اپنا سارا فرنیچر توڑ ڈالتے۔"

نخرہ

ایک ریسٹورنٹ میں ایک آدمی نے ویٹر کو بڑی نخوت سے بلایا اور کہا۔

"دیکھو دو فرائی انڈے لاؤ، زیادہ کچے نہ ہوں نہ زیادہ پکے ہوئے انہیں الٹا مت کرنا، گھی زیادہ مت ڈالنا دونوں پر ذرا سا نمک ڈالنا، کالی مرچ مت چھڑکنا، زردی زیادہ سخت نہ ہو، نیچے سے جلے ہوئے نہ ہوں اور ہاں زردی پھٹی نہ ہو۔"

آرڈر سن کر ویٹر وہیں کھڑا رہا تو ان صاحب نے غصے سے کہا۔

"کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، جاؤ جا کے آرڈر لاؤ۔"

"سر! انڈے کس رنگ کی مرغی کے ہونے چاہئیں؟" ویٹر نے معصومیت سے پوچھا۔

زبان دانی

کراچی ٹی وی سینٹر پر مشاعرہ ہونا تھا۔ افتخار عارف، جوش صاحب کو دعوت دینے گئے تو انہوں نے جوش صاحب سے کہا:

"جوش صاحب! مشاعرے والے دن ہم آپ کو گھر سے لے لیں گے اور واپس بھی چھوڑ دیں گے۔" جوش صاحب زور سے ہنسے اور بولے۔

"ہمیں تو آپ پہنچا دیجیے گا، چھوڑے تو کتے جاتے ہیں۔"

کام

"کیا اشفاق نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا؟" کام ختم ہو جانے کے بعد فورمین نے نئے ہیلپر سے پوچھا۔ جس کا پہلا دن تھا۔

"جی جناب! اس نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔"

"بہت خوب" فورمین خوش ہوا۔ "کیا بتایا تھا؟"

"جناب اس نے کہا تھا کہ جب میں آپ کو آتا دیکھوں تو فوراً اسے جگا دوں۔"

خوش خبری

ایک پروفیسر کی بیگم ڈلیوری کے سلسلے میں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔ نرس پروفیسر صاحب کے پاس ان کے جڑواں بچے لے کر آئی اور کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب! دیکھیے آپ کے بچے کتنے خوب صورت ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سسٹر! میری بیوی سے اس کا ذکر مت کرنا، میں اسے یہ خوش خبری خود سنانا چاہتا ہوں۔"

بڑی دیر کی

ایک بحری جہاز پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک نئے ملاح نے شور مچا دیا" ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے۔ چند منٹ بعد اطلاع کیپٹن تک پہنچی تو اس نے جہاز کا رخ موڑنے کا حکم دیا، جہاز کئی میل پیچھے آ گیا تو ملاح ہکلاتے ہوئے بولا۔ "سر! دراصل کوئی آدمی سمندر میں نہیں گرا۔"

کیپٹن بہت ناراض ہوا۔ جہاز کا رخ پھر موڑا گیا اور جہاز تیزی سے منزل کی جانب روانہ ہو گیا تو ملاح نے گویا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "سر! میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ سمندر میں آدمی نہیں عورت گری ہے۔"

☆☆

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ملائکہ کوثر ——— بسم اللہ پور

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

ارم کمال ——— فیصل آباد

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں اب حساب کیا کرنا
جیت تو کسی کی ہو ہم نے ہار مانی ہے

اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان برا لگتا ہے
ظلم سہتا ہوا انسان برا لگتا ہے
کس قدر ہو گئی معروف یہ اپنی زندگی
ایک دن ٹھہرے تو مہمان برا لگتا ہے

دیبجہ مرزا ——— جہلم

نہ مانو پر حقیقت کہہ رہا ہوں
بھری بستی میں تنہا رہ رہا ہوں

اقرا، نمرہ ——— کراچی

نہ جانے جرم کیا سرزد ہوا ہے
زمانے بھر کی باتیں سہہ رہا ہوں
شجر کا خشک پتہ ہوں میں اختر
ندی کے پانیوں میں بہہ رہا ہوں

ثمرہ جاوید ——— بسم اللہ پور

قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آسانی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں

اقرا سرور راجڑ ——— ڈی جی خان

سو رہے ہیں تمام اہل نظر
نیند کے گھر میں رت جگا ہے کوئی

حمیرا سعدیہ ——— کراچی

عجیب بات ہے لیکن یہی ہوا تابش
مری کہانی ترے نام پر تمام ہوئی
وہ گفتگو جو تھی ہم میں وہ ناتمام رہی
جو عاشقی تھی ہماری یہاں تمام ہوئی

افشاں ریحان ——— کراچی

مرنا تو اس جہاں میں کوئی حادثہ نہیں
اس دورِ ناگوار میں جینا محال ہے

سویرا سعد ——— بستی کھیڑے والا

کرے دریا نہ پل مسمار میرے
ابھی کچھ لوگ ہیں اس پار میرے
وہیں سورج کی نظریں تھیں
جہاں تھے پیڑ سایہ دار میرے

سعدیہ جواد ——— کھاریاں

تیری دہلیز پہ قاضی سنا تھا عدل ہوتا ہے
یہاں تو خون پھیلا ہے یہاں تو نوٹ بکھرے ہیں

رضیہ بشیر ——— کھاریاں

ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

ریحانہ چوہدری ——— مدوکے

مانا کہ اس نے مجھ کو فراموش کر دیا !!
ضروری چیزیں رکھ کے اس کو اکثر بھول جاتا تھا

فضہ بلال ——— کراچی

خواہشوں کی فصل کے ثمر بار ہونے تک
خار بھی ہم نے سینے سے لگا کے رکھے

فرحانہ مہناز ——— گوجرہ

میری خاموشی نگاہوں کو چشم نم سے نہ دیکھو
میں رو پڑا تو دلوں کے طبق ہلا دوں گا
یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا ایک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

فاطمہ مدثر ——— گجرات

ہوئے بے بس مگر پھر بھی سدھر نہ سکے ہم
پھر وہی دعا، وہی عشق وہی تم اور صرف تم

انیلا طالب ——— گوجرانوالہ

نکل چکے ہیں تیری یادوں کے حصار سے
تو نہ جانے کس خوش فہمی میں ہے

عظمیٰ رزاق ——— کراچی

سنا ہے اب محبت کرنے والا
وفا کی شرط سے آزاد ہو گا

pklibrary.com

تاریخ کے جھروکوں سے

امت الصبور

جوزفین بوناپارٹ

جوزفین ایک عام شکل وصورت کی مالک ایک غریب لڑکی تھی۔ جو جزائر غرب الہند میں ماہی گیروں کی ایک بستی میں پیدا ہوئی۔ جو کھانڈ چینی بنانے والے ایک کارخانے کے اوپر تنگ و تاریک گھٹن زدہ اور گندے کمروں میں رہتی تھی۔

انقلاب فرانس میں اس کا پہلا شوہر مارا گیا تو دو بچوں کے ساتھ وہ بے یارو مددگار رہ گئی۔ اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ وہ بالکل بھی خوب صورت نہیں تھی۔ اس کے دانت خراب تھے، اس کے علاوہ بھی اس میں کئی خامیاں تھیں۔ ان سب کے باوجود اسے ازدواجی زندگی کا گہرا تجربہ تھا۔ وہ مردوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ بیوہ تھی اور نئے شوہر کی تلاش میں تھی۔

جب وہ نپولین سے ملی تو وہ چھبیس سال کا تھا اور وہ خود تیس سال کی تھی اس کی سہیلیوں میں سے ایک نے اسے نپولین کے بارے میں بتایا وہ اس وقت اتنا مشہور نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کے پاس پیسا تھا۔ حال ہی میں وہ ایک لڑائی سے لوٹا تھا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنا سر منڈوا رکھا تھا۔

جوزفین نے جب پہلی دفعہ نپولین کو دور سے دیکھا تو اسے کچھ خاص نہیں لگا۔ اس کی سہیلی نے بتایا کہ بہت جلد یہ بڑا اور مشہور آدمی بننے والا ہے۔ جوزفین اس سے ملاقات کا طریقہ سوچنے لگی، آخر اس نے اپنے بڑے بیٹے جس کی عمر تقریباً بارہ برس تھی نپولین کے پاس یہ پوچھنے بھیجا کہ کیا اس کے پاس اس کے باپ (مرحوم باپ) کی تلوار ہے؟ ظاہر ہے نپولین نے ہاں میں جواب دیا۔

دوسرے دن جوزفین بن سنور کر لیکن آنکھوں میں آنسو لیے نپولین کا شکریہ ادا کرنے گئی۔

جوزفین پرتعیش تہذیب سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اس کی شخصیت اور اس کے غیر معمولی حسن سلوک سے بڑا متاثر ہوا۔ اسے احساس ہو گیا کہ جوزفین تہذیبی نقطہ نظر سے اس سے بلند سطح پر کھڑی ہے۔ اس لیے جب جوزفین نے اسے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا اور جب وہ اس کے گھر چائے پینے آیا تو جوزفین نے اسے بتایا کہ وہ تاریخ کا ایک مشہور ترین جرنیل بننے والا ہے۔ تین ماہ کے بعد ان کی منگنی ہوگئی۔

نپولین وقت کا بڑا پابند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ”وقت ہی سب کچھ ہے۔“ ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ ”میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضائع نہیں کر سکتا۔“ اس کے باوجود وہ اپنی شادی کے موقع پر دو گھنٹے لیٹ آیا۔ پادری اس کے انتظار میں جمائی پر جمائی لینے لگا اور بالآخر تنگ آ کر سو گیا۔

اپنی شادی کے اڑتالیس گھنٹوں کے بعد نپولین اٹلی میں ایک نئی جنگ لڑنے کے لیے چلا گیا۔ اس کی فوج اتنی اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اتنی زبردست جنگ لڑا کہ سارے یورپ میں ایک بڑی رو دوڑ گئی۔ یورپ نے ایسی جنگ گزشتہ ہزار سال میں نہ دیکھی تھی۔

اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ میدان جنگ میں بھی نپولین کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ ہر روز جوزفین کو ایک خط لکھ سکے اور پھر اس قسم کے خط! شدت جذبات سے لبریز 1933 میں جوزفین کو لکھے گئے نپولین کے آٹھ خطوط لندن میں نیلام عام پر چار ہزار پونڈ میں فروخت کیے گئے تھے۔ میں نے ان کو پڑھا ہے اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقعت کے مستحق تھے اور آج بھی ہیں۔ یہاں ایک خط درج کر رہا ہوں۔

pklibrary.com

"میری پیاری محبوبہ جوزفین!

تم نے مجھے ایک ایسی محبت سے روشناس کروایا ہے جو میرے ہوش وحواس پر چھا گئی ہے۔ میں کچھ کھا نہیں سکتا، سو نہیں سکتا۔ مجھے اپنے دوستوں کی بھی پروا نہیں رہی۔ میں شہرت سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔ اب میدان جنگ میں صرف اس لیے کامیاب ہونے کی کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں فتح سے خوشی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں فوج کو میدان جنگ میں چھوڑ کر پیرس بھاگ آتا اور تمہارے قدموں سے لپٹ جاتا۔

تم نے میرے اندر ایک لامتناہی محبت بھر دی ہے۔ میں ہر وقت ایک وجدانی کیفیت میں رہتا ہوں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ میں تمہاری تصویر نہ دیکھتا ہوں اور اسے چومتا نہ ہوں۔"

یہ خط اس کے بہت سے خطوط سے قدرے کم جذباتی ہے۔ بہت سی عورتیں ایسے خطوط پر جان دینے کو تیار ہو جاتی ہیں لیکن جوزفین کو ان کی زیادہ پروا نہیں تھی، وہ ایک دوسرے شخص سے عشق بازی میں مصروف تھی اور اس نے نپولین کے خطوط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کی اس حرکت پر نپولین شدت جذبات سے پاگل ہو جایا کرتا تھا۔

آخر وہ جوزفین کی بے اعتنائی سے تنگ آ گیا۔ جب وہ مصر میں لڑ رہا تھا تو اس نے ایک خوب صورت لڑکی کو اپنے ساتھ جائے پینے پر مدعو کیا۔ یہ خبر پیرس میں جوزفین کو پہنچ گئی اور جب نپولین فرانس سے واپس آیا تو جوزفین نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ جیسا کہ ایسے معاملات میں عورتیں کیا کرتی ہیں، دونوں ایک دوسرے سے خوب لڑے، آخر نپولین نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔

اور پھر گھریلو الجھنیں بھی تھیں۔ جوزفین نپولین کی بہنوں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھی۔ اس لیے وہ اس سے جلتی تھیں۔ جوزفین کی موجودگی میں وہ دبی دبی رہتی تھیں۔ اور اندر ہی اندر غصے سے کھولتی رہتی تھیں۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ جوزفین کو ایسا مزا چکھائیں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ انہوں نے اس کا مذاق اڑانا اور اسے بوڑھی عورت کہنا شروع کر دیا۔ وہ نپولین کو اکساتیں کہ وہ اس "بوڑھی بڑھیا" کو طلاق دے کر کسی جوان لڑکی سے شادی کرے۔

لیکن اپنی ہر سازش کے باوجود وہ نپولین کے دل سے جوزفین کی محبت نہ نکال سکیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

آخر اس نے خود ہی جوزفین کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ اس نے صرف ایک وجہ سے کیا تھا۔ اسے ایک ایسی بیوی کی ضرورت تھی جس کے بطن سے بیٹا پیدا ہو سکے۔ طلاق کے کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا دل بے حد افسردہ تھا۔ تین دن تک وہ اپنے محل میں افسردہ بیٹھا رہا۔ نہ تو کسی سے کوئی بات کرتا اور نہ ہی کچھ کھاتا پیتا تھا۔ بس خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ طلاق کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نپولین نے آسٹریلیا میں میری لوئی سے شادی کر لی۔

اس شادی کا عجیب پہلو یہ ہے کہ آسٹریلیا کے دوسرے باشندوں کی طرح میری لوئی بھی نپولین سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اللہ سے دعا مانگتی تھی کہ نپولین سے اس کی شادی نہ ہو لیکن اس کا باپ سیاسی وجوہات کی وجہ سے اس شادی پر مصر تھا۔ اس نے شادی تو کر لی لیکن وہ نپولین کی رتی بھر پروا نہیں کرتی تھی اور جب نپولین کو جنگوں میں شکست ہونے لگی تو وہ اسے چھوڑ گئی اور اپنے بیٹے کو بھی اس سے نفرت کرنا سکھائی۔

نپولین کی پہلی اور آخری محبت جوزفین تھی۔ جب وہ مر گئی تو نپولین اس کی قبر پر گیا اور رو رو کر کہنے لگا۔

"میری پیاری جوزفین! تم نے کم از کم مجھے چھوڑا تو نہیں تھا۔"

اس زمین پر نپولین کے منہ سے جو آخری لفظ نکلا تھا وہ جوزفین تھا۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

سنگاپورین چلی چکن

ضروری اشیاء:

مرغی کا گوشت	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	حسب ذائقہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
کارن فلور	حسب ضرورت
انڈے	چار عدد
تیل	حسب ضرورت
لہسن کے جوے	چار عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
ٹماٹو کیچپ	آدھا کپ
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
یخنی	ایک کپ
نوڈلز	حسب ضرورت

ترکیب:

گوشت کو دھو کر خشک کر لیں۔ انڈوں کو نمک اور کالی مرچ ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب گوشت کے ٹکڑوں کو انڈے میں ڈبو کر کے تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

فرائنگ پین میں تیل گرم کریں۔ گوشت کو تیل میں ڈال کر درمیانی آنچ پر گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کریں اس کے بعد نکال کر رکھ لیں۔ ایک برتن میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے اس میں باریک کٹا ہوا لہسن، ادرک ڈال کر ساتھ فرائی کریں نمک، کالی مرچ، سرکہ، سویا ساس، ٹماٹو کیچپ، چلی ساس، ہری مرچیں ڈال کر چمچہ چلائیں۔ یخنی میں کارن فلور حل کر کے اس میں شامل کریں اور چمچے سے مکس کرتی رہیں جب آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو بقیہ انڈے پھینٹ کر اس میں شامل کریں چولہا بند کر دیں۔

سرونگ ڈش میں پہلے نوڈلز ڈالیں اس پر فرائی کیے ہوئے گوشت کے ٹکڑے رکھ کر آخر میں تیار کی ہوئی ساس ڈالیں۔ مزے دار سنگاپورین چلی چکن تیار ہے۔ گارنش کر کے گرم گرم سرو کریں۔ (چکن بون لیس چاہیے تو بچی ہوئی ہڈیوں کی یخنی تیار کر لیں)

کباب ودھ اونین رنگ

ضروری اشیاء:

قیمہ	آدھا کلو
دہی	تین کھانے کے چمچے
لال مرچیں	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	چھ عدد
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

اونین رنگ کے لیے:

کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
میدہ	آدھا کپ
انڈا	ایک عدد
پانی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

ایک برتن میں باریک پسا قیمہ، دہی، کٹی ہوئی لال

pklibrary.com

مرچیں، گرم مسالا، ہری مرچیں، ہرادھنیا، انڈا اور نمک ڈال کر مکس کرکے ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔
فرائنگ پین میں تیل گرم کرکے قیمے کے کباب بنا کر درمیانی آنچ پر تل لیں، سنہری ہو جائیں تو پلیٹ میں نکال لیں۔
پیالے میں میدہ، کارن فلور اور نمک ڈال کر پانی سے گاڑھا پیسٹ بنالیں۔ پیاز کے گول چھلے کاٹ لیں کڑاہی یا توے میں تیل گرم کرکے میدے کے آمیزے میں پیاز کے چھلے ڈبو کر سنہرا ہونے تک تل لیں۔ سرونگ ڈش میں کباب، پیاز کے ساتھ رکھ کر سوس کے ساتھ سرو کریں۔

چکن رائس کٹلس

ضروری اشیاء:

چاول	دو کپ
آلو	دو عدد
مرغی کا قیمہ	آدھا پاؤ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	پانچ عدد
لہسن	آٹھ جوے
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
بیسن	دو کھانے کے چمچے
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:
قیمے میں آدھا گرم مسالا، نمک، ہری مرچ، لہسن، پیاز ڈال کر آدھے گھنٹے پکائیں۔ آلو ابال کر چھیل لیں۔ ابلے ہوئے چاول اور آلوؤں میں نمک، لال مرچ، ہرا دھنیا، گرم مسالا ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس کے بعد اس آمیزے کو حسب ضرورت ہتھیلی پر رکھ کر درمیان میں قیمہ رکھ کر ٹکیا کا منہ بند کر دیں۔ سارے کباب اسی ترکیب سے بنالیں۔ ایک پیالی میں بیسن گھول کر اس میں نمک، زیرہ اور ہری مرچ باریک کاٹ کر ملالیں۔ تیل گرم کریں کباب بیسن کے آمیزے میں ڈبو کر ہلکی آنچ پر سنہرا ہونے تک تل لیں۔ املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

مونگ کی دال حلوہ

ضروری اشیاء:

دال مونگ	ڈیڑھ کپ
میوے	حسب پسند
کھویا	آدھا پاؤ
گھی	تین چوتھائی کپ
دودھ	آدھا کلو
چینی	تین چوتھائی کپ
الائچی	چھ عدد

ترکیب:
مونگ کی دال کو بیس منٹ بھگو کر دال کو اچھی طرح چھان کر خشک کرلیں۔ ایک کڑاہی میں پانچ منٹ کے لیے دھیمی آنچ پر بھون لیں۔ جب ٹھنڈی ہو جائے تو پیس کر پاؤڈر بنالیں۔
ایک الگ کڑاہی میں ایک چمچہ گھی میں میوے بھون لیں اور الگ رکھ لیں۔
کھوئے کو ہلکی آنچ پر دو منٹ بھون کر نرم کرلیں۔
ایک کڑاہی میں گھی ڈال کر پگھلا دیں۔ پسی ہوئی دال ڈال کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے بھون لیں۔ ہلکا سنہری رنگ ہو جائے تو دودھ ڈال کر دھیمی آنچ پر گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ کھویا اور بھنے ہوئے میوے ڈال کر مکس کریں۔ جمنے لگے تو اتار لیں۔ اوپر سے بادام چھڑک کر پیش کریں۔

☆☆

pklibrary.com

ادارہ

خوبصورت جلد کے لیے

موسم سرما میں جلد کی حفاظت

جلد کی بنیادی دیکھ بھال میں سب سے پہلے تو روزانہ چہرے کی صفائی ضروری ہے۔ چہرے کو دن میں دو مرتبہ دھوئیں منہ دھونے کے لیے تیز گرم پانی کا استعمال نہ کریں، جلد کو سکیڑنے والے ماسک نہ لگائیں۔ سردیوں میں پانی پینے کا بھی خیال رکھیں۔

شہد کھانے کے علاوہ جلد کی نمی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے یہ ایک بہترین موئسچرائزر ہے۔ سرد موسم میں جلد کی خشکی دور کرنے کے لیے دو چمچے شہد میں دو چمچے دودھ ملا کر انہیں جلد پر لگائیں اور دس سے پندرہ منٹ لگا رہنے دیں۔ اس سے آپ کی جلد نرم و ملائم ہوجائے گی۔

سردی کے موسم میں گلیسرین بھی آپ کی جلد کی شادابی برقرار رکھنے کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ آدھا کپ عرق گلاب میں، تین کھانے کے چمچے گلیسرین اور تین کھانے کے چمچے لیموں کا رس ملا کر استعمال کریں۔ رات کو سونے سے پہلے لگائیں اور صبح اٹھ کر دھولیں۔ خواتین کو اپنے پاؤں اور کہنیوں کی سخت جلد پر بھی توجہ دینی چاہیے، کہنیوں کو باقاعدگی سے اسکرب کریں۔ روغن بادام سے مالش کریں۔ ایڑیاں اگر کھردری ہوکر پھٹنے لگی ہیں تو نیم گرم پانی میں لیموں ملائیں، سونے سے دس منٹ قبل پیروں کو اس میں رکھیں یوں پاؤں کی جلد نرم ہوجائے گی۔ پاؤں خشک کرکے پیٹرولیم جیلی ضرور لگائیں انہیں موسم کی شدت سے بچانے کے لیے جرابیں پہنیں۔

سردیوں میں ہونٹوں کا پھٹنا بھی ایک مسئلہ ہے سرسوں کا تیل پھٹے ہوئے ہونٹوں کے لیے بہترین ہے۔ خشک ہونٹوں پر ہلکا سا سرسوں کا تیل لگا لینے سے ہونٹ نرم ہوجاتے ہیں رات سونے سے قبل ایک چمچہ دہی میں سرسوں کا ایک قطرہ مکس کرکے ہونٹوں پر لگانے سے صبح ہونٹ نرم ملیں گے۔

اگر آپ کی جلد سرما کی وجہ سے سنولا گئی ہے تو دو چمچے شہد میں ایک چمچہ دہی مکس کرکے لگائیں دس منٹ بعد سادے پانی سے دھولیں۔

ایلو ویرا جیل بھی تمام کریمز اور لوشن میں استعمال کیا جاتا ہے آپ اسے بھی اپنی جلد پر لگا سکتی ہیں۔ سردیوں میں خشک میوہ جات کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور پانی کا استعمال کم ہوجاتا ہے، سرد موسم میں جلد کو صحت مند رکھنے کے لیے سبزیوں اور پھلوں کا استعمال رکھیں گا، جر کا جوس آپ کی جلد کی شادابی کو کئی گنا بڑھا سکتا ہے۔ کینو کا جوس سردی کی بہترین سوغات ہے۔ ان تمام چیزوں کو استعمال کریں اور اپنے جسم میں وٹامن ای کی مقدار کو برقرار رکھیں۔

مچھلی کھائیں مچھلی میں اومیگا تھری فیٹی ایسڈ پائے جاتے ہیں، اس میں موجود آئرن بھی بہت مفید ہوتا ہے۔

اگر آپ کی جلد مکمل طور پر خشکی کا شکار ہے تو اس کا خاص خیال رکھیں، بعض اوقات لاپروائی کی وجہ سے یہ فنگل انفیکشن میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

پپیتے کا ماسک

سردیوں کے موسم میں چہرے کی خوب صورتی برقرار رکھنے کے لیے پپیتے کا ماسک بہترین ہے۔ ایک ماچس کے سائز کا پپیتے کا ٹکڑا لیں اور کانٹے کی مدد سے میش کرلیں ایک کھانے کا چمچہ شہد ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے دیں۔ سوکھ جائے تو نیم گرم پانی سے دھولیں۔ آخر میں کھوپرے کے تیل سے چند منٹ کا مساج کرلیں۔

☆☆

pklibrary.com